نام کتاب ——— جوئے نور

مصنف ——— علامہ غلام احمد پرویزؒ

ناشر ——— طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۵. بی، گلبرگ ۲، لاہور ۵۴۶۶۰

فون: ۸۷۹۲۳۶

طابع ——— خالد منصور نسیم

مطبع ——— النور پرنٹرز و پبلشرز،

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ

پوسٹ بکس ۴۱۹۰، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ۷۵۸۵۸۲۶ / ۷۵۸۶۸۴۱

ایڈیشن ——— پہلا ایڈیشن ——— ۱۹۴۵ء

دوسرا ایڈیشن ——— ۱۹۵۶ء

تیسرا ایڈیشن ——— اگست ۱۹۷۲ء

چوتھا ایڈیشن ——— دسمبر ۱۹۸۸ء (بلاترمیم)

پانچواں ایڈیشن ——— جولائی ۱۹۹۴ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مشمولات

جُوئے نُور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۰

تعارف

میں نے اپنے دور کے تعلیم یافتہ طبقہ تک قرآنی حقائق پہنچانے کا جو سلسلہ "معارف القرآن" کے نام سے شروع کیا تھا اس کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں خدا کے تصور، صفاتِ خداوندی اور خدا اور انسان کے باہمی تعلق پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اس سلسلہ کی دوسری کڑی شائع ہوتی، جس میں تخلیقِ انسانی، آدم، ملائکہ، ابلیس، وحی، رسالت جیسے اہم عنوانات کے بعد حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ اور ان کی اقوام کا تذکرہ آگیا تھا۔ اُسی سال اس کی تیسری جلد شائع ہوئی جس میں حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسٰےؑ تک کے انبیاء کرامؑ کے کوائفِ حیات اور ان کی اقوام کا ذکر تھا۔ ۱۹۴۹ء میں اس سلسلہ کی چوتھی کڑی شائع ہوئی جو حضور خاتم النبیینؐ کی سیرتِ طیبہ پر مشتمل تھی۔

۲۔ اس سلسلہ کی اشاعت کے بعد محسوس ہوا کہ اکثر احباب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ معارف القرآن کسی ایک کتاب کا نام ہے جو کئی جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ حقیقت یہ نہیں تھی۔ اس سلسلہ کی ہر کڑی، ایک خاص موضوع پر مشتمل تھی اور خود مکتفی۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ اس کے جدید ایڈیشن الگ الگ عنوانات سے شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اب سلسلہ کی مختلف کڑیاں یوں ہیں:

۱۔ من و یزداں: خدا اور بندے کا باہمی تعلق۔

۲۔ ابلیس و آدم: انسان، آدم، ملائکہ، ابلیس، شیطان، جنات، وحی اور رسالت جیسے اساسی موضوعات پر مشتمل۔

۳۔ جوئے نور : حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے آسمانی انقلاب کے پیامبروں کے کوائف جمیلہ۔

۴۔ برقِ طور : صاحبِ ضربِ کلیمی اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج وزوال کی عبرت آموز سرگزشت۔

۵۔ شعلۂ مستور : حضرت عیسٰیؑ کے کوائفِ حیات، جدید انکشافات کی روشنی میں۔

۶۔ معراجِ انسانیت : صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کی سیرتِ طیبہ، قرآنی آئینہ میں۔

۷۔ انسان نے کیا سوچا ؟ اور خدا نے کیا کہا یعنی انسانی فکر نے وحی کی راہ نمائی کے بغیر زندگی کے اہم مسائل حل کرنے میں کیا کیا کاوشیں کیں اور کس طرح ناکام رہی اور پھر وحی نے ان مسائل کو کس حسن وخوبی سے حل کر دیا۔

۸۔ اسلام کیا ہے ؟

۹۔ جہانِ فردا : مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق قرآنی تفاصیل۔

۱۰۔ کتاب التقدیر : دنیائے فکر کے مشکل ترین مسئلہ کا آسان ترین قرآنی حل۔ اپنے موضوع پر منفرد کتاب۔

ان کے علاوہ ' لغات القرآن (چار جلدوں میں) شائع کی گئی اور اس کی روشنی میں مفہوم القرآن جس میں پورے قرآنِ کریم کا مسلسل مفہوم آ گیا ہے۔ ان تصانیف کو ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی فکر اور تعلیم کو عام کرنے میں میری حقیر سی کوششوں کا اجمالی تعارف۔ اب میں گذشتہ کئی برس سے تبویب القرآن کے مرتب کرنے میں مصروف ہوں۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں قرآنِ مجید کی تعلیم اس طرح مدوّن کر دی جائے گی کہ آپ جس موضوع کے متعلق چاہیں، قرآنِ کریم کے تمام مقامات بیک وقت آپ کے سامنے آ جائیں۔ (خدا مجھے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے)۔

۳۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے زیرِ نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا جو مدت سے نایاب تھا۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن نظرِثانی کے بعد پیشِ خدمت ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیائے کرامؑ اور ان کی اقوام کا تذکرہ آ گیا ہے۔ سطحی نگاہ سے دیکھئے تو ایسا محسوس ہوگا گویا یہ محض وقائع نگاری ہے لیکن بنظرِ تعمق غور کیجئے تو ان تذکروں میں حقائق و عبر کی ہزار داستانیں مضمر

برومندی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر میری اس کوشش سے کوئی ایک سعید روح بھی قرآنِ کریم کے قریب آگئی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزی کا صلہ مل گیا۔

۵۔ آیات میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً ۴/۱۲ سے مراد ہے سورۃ النسآء کی بارہویں آیت۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ آسمانی انقلاب کے ان داعیانؑ نے کس طرح خدا کا پیغام ان اقوام تک پہنچایا۔ اقوامِ مخاطب کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا ہوا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا اور آج اس میں ہمارے لئے کیا سامانِ عبرت پوشیدہ ہے۔

۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور
اگست ۱۹۷۲ء

والسّلام

پرویز

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰهَا (۱۱/۴۱)

طوفانِ نوح

سفینۂ برگِ گُل بنا لے گا قافلہ مُورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہو گا

کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ۲۴/۱۴

حضرت نوحؑ (سنہ ۵۰۰۰ ق م)

- یافث
- سام
  - اقوامِ عاد و ثمود (حضرت ہود و صالح علیہما السلام)
  - (حضرت ابراہیمؑ سنہ ۲۲۰۰ ق م) (حضرت لوط علیہ السلام آپکے برادر زادہ)
    - حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
      - نبایوط (اصحاب الحجر)
      - قیدماہ (اصحاب الرس)
      - محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — آفتابِ رسالت حضور ختمی مرتبت
    - (حضرت اسحٰق علیہ السلام)
      - عیسو (ادوم)
        - عوض
          - حضرت ایوب علیہ السلام (سنہ ۱۵۰۰ ق م)
        - عمالق
      - حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل)
        - (حضرت موسیٰ علیہ السلام) و (حضرت ہارونؑ سنہ ۱۶۰۰ ق م)
        - حضرت داؤد علیہ السلام سنہ ۱۰۰۰ ق م
        - حضرت سلیمان علیہ السلام
        - حضرت یونس علیہ السلام (سنہ ۸۰۰ ق م)
        - حضرت زکریا علیہ السلام
        - حضرت یحییٰ (علیہ السلام) } قربِ زمانہ حضرت عیسیٰؑ
    - مدیان
      - حضرت شعیبؑ (سنہ ۱۶۰۰ ق م)
- حام
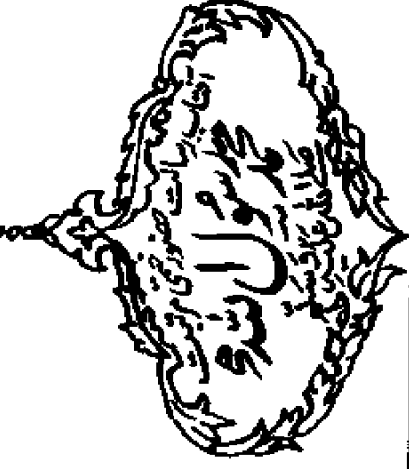
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت نوح علیہ السلام

دُورافقِ مُبین پر، تاروں کی چھاؤں میں، انسانی رشد و ہدایت کی آسمانی قندیلیں ہاتھ میں لئے نورانی پیکروں کا جو مقدس قافلہ دکھائی دیتا ہے، قرآنِ کریم نے اس کے تذکرۂ جمیلہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی ہے۔

آج دنیا کے گوشے گوشے میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اسی طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الامم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نسلِ انسانی کا اوّلین سرچشمہ کسی ایک مقام پر تھا۔ جہاں سے اس کی سوتیں پھوٹیں اور ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطرافِ عالم میں بہ نکلیں۔

وَ اللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ۙ (۷۱/۱۷)

اور اللہ نے تم کو زمین سے نباتات کی طرح پھیلایا۔[1]

---

[1] اس سے مراد سلسلۂ ارتقا کی رُو سے نسلِ انسانی کا ظہور پذیر ہونا بھی ہے۔

انسانی آبادی کا اوّلین سرچشمہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اوّلین سرچشمہ جھیل کیسپین . . . . کے اطراف و جوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے ماتحت علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوامِ عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر، تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) آریائی (ایرین) مثلاً ہندی اقوام، ایرانی اور فرنگستانی۔

(۲) تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی۔

(۳) سامی (سمیٹک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب، اقوامِ عالم کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بناء پر کرتے ہیں، یعنی سفید فام (مثلاً اُمم سامیہ اور فرنگی)، سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگانِ افریقہ) اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ)۔ ان کے برعکس تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوحؑ کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث (JAPHETH) حام (HAM) اور سام (SHEM) سے آگے بڑھی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل (SEMITIC RACE) سے تعلق ہے کیونکہ انبیائے کرامؑ کا وہ سلسلہ جس کا ذکر تورات میں ہے اسی خاندان سے متعلق تھا۔

بنی سام کا مولد و مسکن بنی سام کی اس قوم کا مولد و مسکن کونسا علاقہ تھا، یہ مسئلہ علمائے تاریخ کے نزدیک اہم مباحث کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ تاریخ کی قدیم ترین کتابوں میں اس موضوع پر بہت کچھ ملتا ہے لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اثری انکشافات نے بحث و نظر کا رُخ اس طرح بدل دیا ہے کہ اب بیسویں صدی میں یہ مسئلہ گویا متحقق ہو چکا ہے کہ اُمم سامیہ کا اوّلین وطن ملکِ عرب تھا، جہاں سے نکل کر وہ بابل، سیریا، مصر اور فینیشیا تک پھیل گئے۔ اس تحقیقات سے یہ اہم حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آرہی ہے کہ اُمم سابقہ اور مِلل قدیمہ کی تاریخ و تمدن میں عرب کو کیا اہمیت حاصل رہی ہے، یعنی مصر و شام، فلسطین و عراق وغیرہ کی یہ تمام قومیں، جنہیں الگ الگ سلسلہ کہا جاتا ہے، درحقیقت ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جو سرزمین عرب سے اُبھرا۔ اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبانوں کی اصل بھی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی۔ یہ امور

ہنوز اُن انکشافات کا نتیجہ ہیں جو معرضِ شہود میں آچکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا اضافے ہوتے چلے جائیں گے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم نے بالتخصیص انہی اقوام[1] اور انہی انبیائے کرامؑ کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہو سکتا ہے (اور قرآن اس پر شاہد ہیں) کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) سمٹ سمٹا کر اس ایک نقطہ میں مرکوز ہو جائے کہ ان تمام اقوامِ عالم کی ابتدا ریگستانِ عرب ہی سے ہوئی، جہاں کے شہر مکہ کو قرآنِ کریم اُمّ القریٰ (آبادیوں کی ماں) قرار دیتا ہے۔ بہرحال آج یہ قریب قریب متحقق ہو چکا ہے کہ سامی اقوام کا مولدِ اوّل عرب[2] تھا جہاں سے وہ اطراف و حوالی میں پھیلیں۔

قومِ نوحؑ کا مولد

ان اقوام کے مورثِ اعلیٰ، حضرت نوحؑ کے بیٹے تھے۔ اس لئے قومِ نوحؑ کا وطن بھی انہی علاقوں میں تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔ تورات نے اس کا نام "اراراط" بتایا ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ آرمینیہ کے سلسلۂ کوہ میں واقع ہے۔ اس سلسلۂ کوہ سے دجلہ و فرات (TIGRIS AND EUPHRATES) بہتے ہوئے جنوب کی طرف آتے ہیں اور خلیجِ فارس کے کچھ اوپر آپس میں مل کر اس میں گر جاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قومِ نوحؑ کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

اور زمانہ

اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کونسا تھا؟ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ قومِ عاد، قومِ نوحؑ کی جانشین (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے 7/69)

قومِ عاد کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ اُممِ سامیہ اُولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں کا نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس قبیلہ نے عرب، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ عاد کا زمانہ تین ہزار سال ق۔م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ قومِ نوحؑ کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اتنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدت تو درکار ہو گی۔ بہرحال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ

---

[1] اس باب میں ریتان کا بیان، ابلیس و آدم کے آخری باب میں دیا جا چکا ہے۔

[2] عرب سے مراد موجودہ حجاز ہی کا علاقہ نہیں۔

واثریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآنِ کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج وزوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام وملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آیا ہے۔ بایں ہمہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوامِ قدیمہ کے متعلق (جن کی بابت، اور تو اور خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا، معلومات کا کچھ ذخیرہ نہ تھا) تاریخی واثری انکشافات سے جو کچھ اُبھر کر سامنے آرہا ہے وہ ان خطوط ونقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ قرآنِ کریم میں ہے، بلکہ ان کی تائید وتصدیق کرتا چلا جارہا ہے۔

قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد

اور اصل یہ ہے کہ جہاں کہیں حقیقت کی نمود ہوگی، ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن یکسر حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اس میں ظن وتخمین اور ریب وتشکیک کی کہیں گنجائش نہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام "مسلّمات" افسانوں میں تبدیل ہوتے چلے جارہے ہیں، قرآنی اجمالات کی توثیق وتصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے دیجئے۔ وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۚ (۴۱/۵۳)

وہ وقت دور نہیں کہ ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی نفسیاتی دنیا (یا عربوں کے اپنے اندر اور ان کے باہر کی اقوام میں) اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔

حضرت نوحؑ کی بعثت اپنی قوم کی طرف

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں سلسلۂ آمد ورفت اور ذرائع رسل ورسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں موجود تھا ایک مستغنی عن الغیر وحدت (SELF_CONTAINED UNIT) تھا جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا، جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝

(۷/۵۹ نیز ۱۱/۲۵ ؛ ۲۳/۳۳ ؛ ۲۹/۱۴ ؛ ۷۱/۱۰)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا، "اے میری قوم! صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ایک بڑے ہی (ہولناک) دن کا عذاب تمہیں پیش نہ آ جائے۔

حضرت نوحؑ بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۲۶/۱۰۶)

"اور جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا، "کیا تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت نہ کرو گے۔"

ویسے بھی، قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا اس لئے قبائل کے نام بھی یا اُن کے جدِّ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے یا اس قبیلہ کی کسی عظیم الشان شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآنِ کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ

نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے

اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے بلکہ آپ کی قوم آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی اور حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہورِ نتائج کا وقت آ چکا تھا۔ سورۂ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ (۲۶/۱۰۵)

قومِ نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰیَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ (۲۵/۳۷)

اور جب قومِ نوح نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا اور (آنے والے) انسانوں کے لئے ایک مثال بنا دیا اور قانونِ مکافات کی رُو سے ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب

تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیبِ رُسل اُن کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی (یعنی یہ نہیں کہ قومِ نوحؑ کے بقیہ افراد کی آیندہ نسلوں نے تکذیبِ رُسل کی تھی جس کی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصّوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے)۔ بہرحال، یہ رسول حضرت نوحؑ سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپ کے ہمعصر ہوں، قرآن سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابی قومِ نوح کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۵۱/۴۶)

اور اس سے قبل نوح کی قوم تھی۔ وہ لوگ قانونِ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔

قومِ نوحؑ کی حالت

اور جیسا کہ ظاہر ہے اس فسق و عصیان کا نتیجہ سرکشی اور ظلم تھا۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ۝ (۵۳/۵۲)

اور اس سے قبل نوح کی قوم کے لوگ سرکش اور ظالم تھے۔

ان لوگوں نے خدائے واحد کی عبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بُت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی تو اُن کی قوم کے سرغنوں نے قوم سے کہا کہ

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۝ (۷۱/۲۳)

انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑو اور ودّ اور سوّاع اور یغوث اور نسر دیوتاؤں کو مت ترک کرو۔

دعوتِ حضرت نوحؑ اور توحید

یہ تھے وہ حالات جن کے اندر حضرت نوحؑ تشریف لائے۔ آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدائے واحد کی عبودیت اختیار کرنے کی دعوت دی کہ یہی پیغام حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کا سنگِ بنیاد ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۵۹)
یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس قوم کی طرف (تبلیغ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا "اے میری قوم! اللہ ہی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوائے کوئی الٰہ نہیں۔

سورۃ ہود میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۫ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۙ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ۝ (۱۱/۲۵-۲۷) نیز ۲۳/۲۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) "میں تمہیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت و محکومیت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانین خداوندی سے انکار کی راہ اختیار کی تھی کہا، ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں پست درجے کے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں ہم تو تم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

خدا کی محکومیت یہ دعوتِ نوحی کا اوّلین اور اساسی اصول تھا۔ یعنی خدا کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اس کے مرکز کی اطاعت کی جائے۔ اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۚ (۲۶/۱۰۷-۱۰۸) نیز ۷۱/۳)

میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا (حکومتِ الٰہیہ کا) امانت دار ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری

(بہ حیثیتِ مرکزِ اوّل) اطاعت کرو۔

اِنقلابی دعوت

دعوتِ نوحیؑ کی تعلیم کے ان عناصر پر بھی غور فرمایئے۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو اس قوم کے آباء واجداد (اسلاف) سے متوارث چلا آتا تھا اور ان کے سرداران یعنی اربابِ ثروت و حکومت کے تغلّب و اقتدار کے خلاف بے غل و غش بغاوت! تاریخِ انسانیت کے اوراق کو اُلٹتے جایئے۔ حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق و صداقت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں۔ معتقدات خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آباء واجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو انسان کے نزدیک ایسے گراں بہا متاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے چھننے سے اس کی ساری کائنات لُٹ رہی ہے لیکن کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے! اگر تپ دق

تقلیدِ آباء

کے جراثیم، جو انسان کو اپنے آباء سے وراثتاً ملے ہوں، یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں تلف کر دیا جائے، تو معتقدات کے جراثیم ایسے مقدّس کیوں تصوّر کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے! حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحیٔ مبین کی شکل میں انسانی رشد و ہدایت کے لئے ملتی ہے۔ اپنے ذاتی خیالات و تصوّرات کو بھی اسی کی روشنی میں پرکھئے اور ان معتقدات کو بھی جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہوں۔ لیکن انسان کی اس شوریدہ بختی کو کیا کہیئے کہ وہ ہر پرانی (قدیم) چیز کو تقدّس کا لبادہ اڑھا دیتا اور اسے تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جب سب سے پہلی دعوتِ حق و صداقت کا ذکر کیا تو اس اہم حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ صداقت کے قبول کرنے میں سب سے پہلے کونسا جذبہ مانع ہوتا ہے، یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ، کورانہ تقلید کا مسلک۔ آپ دیکھیں گے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر حضور خاتم النبیّینؐ تک ہر داعیٔ حق و صداقت کی آواز کے جواب میں یہی کچھ کہا جاتا رہا کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے آباء واجداد کی روش کے خلاف ہے، اس لئے ہم اسے قبول نہیں کر سکتے (۱۴/۱۰)۔ اور اسے چودہ سو سال

ہر زمانہ میں یہی لغزش کی گھاٹی رہی ہے

پیشتر تک ہی محدود کیوں رکھئے! کیا آج بھی جب یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ! اپنے معتقدات و تصوّرات کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں تو اس

کے جواب میں کیا وہی پرانی آواز نہیں دہرائی جاتی کہ ہم اسی چیز کو حق سمجھتے ہیں جو اسلاف سے منتقل ہو کر چلی آرہی ہے اور اس کے خلاف جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں؟ زمانے کے تغیرات سے صرف پیکر بدلا کرتے ہیں، روح تو وہی چلی آتی ہے۔ حق و صداقت کی روح بھی ایک ہی ہے اور اس کے مقابل میں باطل کی طاغوتی روح بھی ایک ہی۔

دوسری رکاوٹ

اعترافِ حق و صداقت کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں نشۂ حکومت وسطوت ہے۔ یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ یہ صیدؔ صیّاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتواں انسان، زبردست اور قوی انسانوں کے پنجۂ تغلّب و تسلّط میں تڑپتے، پھڑکتے، سسکتے، بلبلاتے، سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دیں گے۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور اور ناتواں انسانوں کو جابر و ظالم انسانوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں چھوڑ دیں جہاں وہ پوری سرفرازی و سربلندی سے "انسانوں" کی طرح چل پھر سکیں اور انسان اور خدا کے درمیان کوئی دوسری

صحیح آزادی کی دعوت

طاقت حائل نہ ہو اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوائے کسی اور کا محکوم نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اربابِ حکومت و تسلّط اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ اس قسم کی انقلاب انگیز آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ وہ اپنی ابلیسانہ سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے دامِ تغلّب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں۔ داعیانِ حق و صداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ ہے جس سے تصادم و تزاحم ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے جس دعوت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس تصادم کا ذکر بھی کیا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗئِكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۲۳/۲۴)

اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی وہ یہ سن کر (لوگوں سے) کہنے لگے کہ

یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے ؟ مگر چاہتا ہے، تم پر اپنی بڑائی جتلائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا ؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا ؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سُنی نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تصادم اس سلسلۂ آسمانی کے ساتھ ہر مقام پر رہے گا، کہ جیسا کہ "ابلیس و آدم" میں بتایا جا چکا ہے، ابلیس نے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے، اس لئے خدائی نظام کے ساتھ طاغوتی نظام ہمیشہ برسرِ پیکار رہے گا۔ بقول اقبالؒ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سرمایہ دار گروہ کی طرف سے مخالفت

آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن نے ان مخالفین کے لئے اَلْمَلَاءُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں، یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوں، جن کے پاس کثرت سے مال و دولت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے زور سے اقتدار کی کرسیاں حاصل کر لیتے ہیں اور پھر غریب انسانوں سے اپنا حکم منواتے ہیں۔ اسی کا نام (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں) نظامِ سرمایہ داری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آسمانی انقلاب جس کے داعی حضرات انبیائے کرامؑ تھے، اسی غیر خداوندی نظام کو مٹانے کے لئے آتا تھا جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔ وہ ان ذرائع رزق کو انسانوں کے ہاتھوں سے چھین کر، قانونِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے، تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ اس انقلاب کی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصادم ہے جس کا ذکر سب سے پہلی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں سامنے آ رہا ہے (۵۹-۷/۶۴)۔ اس مخالفت کی وجہ بھی سُن لیجئے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا
...... اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○ (۲۶-۱۱/۲۸)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جنہوں نے کفر کی راہ

اختیار کی تھی، کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو
اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ ہم میں نچلے درجے کے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے
پیچھے ہو لئے ہیں، ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے
ہو۔

نوح نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار
کی طرف سے دلیلِ روشن لئے ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے وحی کی رحمت بھی عطا
کردی ہو، مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟ یہ تو ہم
کر نہیں سکتے کہ اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ (۲۶/۱۱۱)

(قوم کے سرداروں نے کہا) کیا ہم تمہاری باتوں پر (اے نوح) یقین کرلیں۔ حالانکہ (ہم دیکھ رہے
ہیں کہ صرف کمینے (نچلے درجے کے لوگ) تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں؟

ان آیات پر غور فرمایئے۔ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو صاحبِ دولت و ثروت تھا اور وجاہتِ
مخالفت میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کیا ہم اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں جو رذیل لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس سے

طبقاتی تقسیم

معلوم ہوا کہ حق وصداقت کی دعوت پر لبیک، سب سے پہلے غریب طبقہ کی طرف
سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اربابِ ثروت و حکومت کے جور و استبداد
سے تنگ آ چکے ہوتے ہیں اور ہر اس آواز کا بطیبِ خاطر استقبال کرتے ہیں جو انہیں آزادی اور سچی آزادی کی
طرف دعوت دے اور زندگی کی خوشگواریوں سے ہمکنار کردے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ زمانۂ حضرت نوحؑ میں
طبقات کی تقسیم وجود میں آچکی تھی، یعنی وہ قبائلی زندگی کا ایسا ابتدائی زمانہ نہیں تھا جس میں انسانی عزت و
تکریم، دولت و ثروت کے معیار سے نہ ماپی جاتے۔

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶/۱۱۲)

(حضرت نوحؑ نے) کہا کہ ان کے (پیشہ اور) کام سے مجھ کو کیا بحث۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت انسانوں کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے وجود میں آچکی تھی جو

ذات پات کی تقسیم کا بنیادی پتھر ہے اور جو انسانی مساوات کی جڑ پر ایسی کاری ضرب تھی کہ یہ لعنت انسانوں سے آج تک دُور نہیں ہو سکی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا منصب، مساواتِ انسانی کو قائم کر کے عزّت و عظمت کا معیار تقوےٰ قرار دینا تھا، یعنی یہ معیار کہ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے اور اس طرح نوعِ انسانی کی پرورش و منفعت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو، وہی معاشرہ میں سب سے زیادہ عزّت و توقیر کا مستحق ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کا جواب اس پر شاہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجۂ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مؤمنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا، یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیّہ کر چکی ہے کہ وہ خود بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور انہی قوانین کو معاشرہ میں رائج کرے گی۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۚ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ؕ (۲۶/۱۱۵—۱۱۲)

نوحؑ نے کہا ان کے پیشہ اور کام سے مجھ کو کیا بحث؟ ان سے حساب کتاب لینا، خدا کا کام ہے، کیا خوب ہو، جو تم اس بات کو سمجھو اور میں تو یہ کرنے سے رہا کہ تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا رہوں۔ (نیز $\frac{11}{29}$ ؛ ۱۰/۷۲) ؛ ۲۶/۱۰۹)۔

اگر میں انہیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے یہاں مجرم ٹھیرایا جاؤں گا۔ کہئے! اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکتا ہے؟ (۱۱/۳۰)۔

یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس، مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟ (۱۱/۳۱)۔

اربابِ استبداد کا جواب

اس کے جواب میں قوم نے کیا کہا؟ وہی جو سرکش اور متکبر کیا کرتے ہیں!

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۱۱/۳۲)۔

اس پر ان لوگوں نے کہا، اے نوحؑ! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا۔ (اب ان باتوں

سے کچھ بننے والا نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس بات کا وعدہ کیا ہے، وہ ہمیں لا دکھا۔
یعنی تو جو ہمیں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا، درانحالیکہ ہم نہایت خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف ہو جائے گی!

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ .....
..... وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۱/۳۵-۳۳)

نوحؑ نے کہا، تباہی اور بربادی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق آیا کرتی ہے تم اسے روک نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو پھر میری نصیحت تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ تمہارے فیصلے تمہارے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اس کی طرف جانا ہے۔

(حکمِ الٰہی ہوا، اے نوح!) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آدمی نے (یعنی نوح نے) اپنے جی سے یہ بات گھڑلی ہے؟ تو کہہ دے، اگر میں نے یہ بات گھڑلی ہے تو میرا جرم مجھ پر، اور تم جو جرم کر رہے ہو (اس کی پاداش تمہارے لئے) میں اس سے بری الذمہ ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حضرت نوحؑ خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی انہی میں گزاری تھی۔ قوم نے اس سے پیشتر ان سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سُنی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے سمجھا کہ یہ (معاذاللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہے جو نہ ہماری دیدہ ہیں نہ شنیدہ ہیں۔ انہوں نے کہا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (۲۳/۲۵؛ ۵۴/۹)

(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

تخویف و ترہیب

لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں، اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں کی طرح بے ربط و بلا مقصد باتیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی ہر جنبش کا ایک خاص قبلہ

مقصود کی طرف منجر ہوتی ہے تو وہ ان اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آتے جو قوّت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۞ (۲۶/۱۱۶)

اے نوحؑ! اگر تم (اپنے مشن سے) باز نہ آؤ گے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

یہ دھمکی انفرادی طور نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے تحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۞ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۞ (۷۱/۲۱-۲۲)

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اسے نقصان ہی زیادہ پہنچایا اور انہوں نے بڑی بھاری سازش کی تدبیر کر رکھی ہے۔

دھمکیوں کے جواب میں.... لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت چھوڑ دی؟ ایسا کس طرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تخویف و ترہیب ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۞ (۱۰/۷۱)

اگر تم پر بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) کھڑا ہوں اور قوانینِ خداوندی کے مطابق تمہیں پند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو، اسے ٹھان لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی پہلو نظر سے رہ نہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے؟)

مخالفت کی انتہا چنانچہ ان کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت نوحؑ ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ (۲۳/۳۹)؛(۵۴/۱۰)

(اور کہا) خدایا انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

حضرت نوحؑ کی پکار وہ اس سرکش قوم کی متمردانہ روش سے اس قدر تنگ آچکے اور ان کے انکار و مخالفت سے اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے اللہ سے التجا کی کہ

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے پروردگار! تو نافرمان لوگوں (کا نام و نشان) صفحۂ زمین پر باقی نہ چھوڑیو۔

اس لئے کہ

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا

(۷۱/۲۷)

اگر تُو نے ان نافرمان و سرکش لوگوں کو (سلامت) چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی (نسل سے پیدا ہونے والی) اولاد بھی (موروثی اور تربیتی اثرات کی وجہ سے) بدکردار و سرکش ہوگی۔

کشتی کی تیاری ابتدا میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ آخر میں اللہ کے قانونِ مکافات کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آگیا۔ اِدھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔ اُدھر قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مہلت کا زمانہ گذر کر نتیجہ مرتب ہونے کا وقت آگیا۔ حضرت نوحؑ سے ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کر لو۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ (۱۱/۳۶-۳۷)؛(۲۳/۲۷-۳۰)

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس پر (بیکار کو) غم نہ کھا۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کردے اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہوجانے والے ہیں۔

قوم کا تمسخر یہ کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سردار ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود ان کی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت انہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ...... وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (۳۸ — ۱۱/۳۹)

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کا کوئی (سردار) گروہ ان پر سے گذرتا، تو ان کو کشتی بنانے میں مشغول دیکھ کر تمسخر کرنے لگتا۔ نوحؑ کی طرف سے انہیں جواب ملتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو (اڑا لو) اسی طرح ہم بھی (تمہاری بیوقوفیوں پر ایک دن) ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہوجائے گا کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کرے، پھر دائمی عذاب بھی اس پر نازل ہو۔

ظہورِ نتائج کا وقت کشتی تیار ہوگئی اور عذاب کا وقتِ معیّن آپہنچا۔ حکم ہوا۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ...... وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (۴۰ — ۱۱/۴۱)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ جب وہ وقت آگیا کہ ہماری ٹھہرائی ہوئی بات ظہور میں آئے اور زمین کے چشموں نے جوش مارا تو ہم نے (نوحؑ کو) حکم دیا کہ ہر قسم کے (جانوروں کے) دو دو جوڑے کشتی میں لے لو اور اپنے اہل کو بھی ساتھ لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کی روش ثابت کر چکی ہے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے نہیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی لے لو جو ایمان لاچکے ہیں۔ اور نوحؑ کیساتھ ایمان نہیں لائے تھے، مگر بہت تھوڑے آدمی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۟ ...... جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ (۱۱ — ۵۴/۱۴).

پس ہم نے آسمان (بادلوں) کے دروازے برسنے والے پانی سے کھول دیئے اور زمین سے چشمے کھول دیئے، تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس معاملہ کے لئے جس کا قانونِ مکافات کی رُو سے اندازہ معین ہو چکا تھا' ایک جگہ جمع ہو گیا اور ہم نے اُسے (نوح کو) میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کرا دیا۔ وہ ہماری نگرانی میں چل رہی تھی اور غرق ہونے کی سزا ان کے لئے تھی جنہوں نے اس سے انکار کیا تھا۔

زمین سے پانی، آسمان سے پانی، پوری کی پوری وادی لبریز۔ اس کے بعد۔

وَ قِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (11/44)

اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا کہ اے زمین! اپنا پانی پی لے! اور اے آسمان تھم جا! اور پانی کا چڑھاؤ اُتر گیا اور حادثہ انجام پا گیا اور کشتی، جودی، پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ہلاکت اس گروہ کے لئے ہو گئی، جس نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔

اس طوفانِ بلا کے سامنے سرکش و مغرور قوم اور اس کے وہ تمام ساز و سامان جن کے بل بوتے پر وہ ظلم و استبداد کی زندگی بسر کر رہے تھے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور اس تباہی سے وہی محفوظ رہے جو کل تک بے یار و مددگار اور بے ساز و سامان سمجھے جاتے تھے اور جن کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ طوفان تھما، کشتی جودی پر جا رُکی اور ارشاد ہوا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (11/48)

حکم ہوا۔ اے نوح! اب کشتی سے اُتر۔ ہماری جانب سے تجھ پر سلامتی اور برکتیں ہوں' نیز ان جماعتوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔ اور دوسری کتنی ہی جماعتیں ہیں (بعد کو آنے والی) جنہیں ہم (زندگی کی خوشگواریوں سے) بہرہ مند کریں گے۔ لیکن وہ صحیح راہ اختیار نہ کریں گے۔ اس لئے انہیں (پاداشِ عمل میں) ہماری طرف سے عذابِ دردناک پہنچے گا۔

یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے "اہل" کو عذابِ الیم سے محفوظ رکھا اور مخالفین کو نیست و نابود

کردیا۔ (۷۶ ـ ۷۷/۲۱)؛ (۷۲ ـ ۷۵/۳۷)۔

اہل کا مفہوم

اِن آیات میں "اہل" کے لفظ پر غور کرو۔ یہ اپنے اندر ایک عظیم الشان حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے جو تاریخِ انسانیت میں مہمات اصول میں سے ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کے اہل کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ عام اصطلاح میں "اہل" سے مراد کنبہ اور خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن آسمانی لغت میں اس سے مفہوم کچھ اور ہے۔ سورۃ المؤمنون میں اہل میں ایک استثناء (EXCEPTION) ہے۔

فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا...... اِنَّھُمْ مُّغْرَقُوْنَ٥ (۲۳/۲۷)

پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ جب ایسا ہو کہ ہمارے حکم کا وقت آجائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں (ہر جانور کے) دو دو جوڑے ساتھ لے لے اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر اہل کے ایسے لوگوں کو نہیں جن کے لئے پہلے فیصلہ ہو چکا۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے بارے میں کچھ ہم سے عرض معروض نہ کیجیو۔ وہ ڈوب کر رہیں گے!

اس کی تفسیر سورۃ نوحؑ میں ان الفاظ سے کر دی گئی ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا٥ (۷۱/۲۸)

(نوحؑ نے کہا) اے میرے رب میری اور میرے ماں باپ کی حفاظت فرما اور اس کی جو ایمان لاتا ہوا میرے گھر میں داخل ہوا اور (ایسے اہلِ خانہ کے علاوہ عام) مومن مردوں اور مومن عورتوں کی اور ظالموں کو جو (ایمان نہیں لاتے) تباہی اور بربادی میں بڑھاتے جائیو۔

اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار

اس سے واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں اہل سے مراد کیا ہے۔ یہاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم، نسب اور قرابتداری کی رُو سے نہیں ہوتی بلکہ کفر اور ایمان کی رُو سے ہوتی ہے۔ دعوتِ نوحی میں یہ مقام ایسا بلند ہے جسے قرآنِ کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے تاکہ یہ اصولی اور اساسی معیارِ تقسیم واضح طور پر سامنے آجائے کیونکہ انسانی تمدن اور عمرانیت کی صحیح اور غلط تعمیر اسی معیار کے صحت اور سقم پر مبنی ہے۔ ذرا غور کیجئے،

چاروں طرف طوفانِ بلا انگیز موجزن ہے۔

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قف (۱۱/۴۲)

اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑوں کی طرح اُٹھتی ہیں، کشتی انہیں لئے جارہی ہے

بیٹا سامنے آجاتا ہے۔ محبتِ پدری جوش میں آتی ہے۔ آواز دیتے ہیں۔

وَ نَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (۱۱/۴۲)

اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

بیٹا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ٥ (۱۱/۴۳)

اُس نے کہا، "میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا۔ وہ مجھے پانی کی زد سے بچالے گا۔" نوح نے کہا (تو کس خیالِ خام میں پڑا ہے) آج اللہ کی ٹھہرائی ہوئی بات سے بچانے والا کوئی نہیں، مگر ہاں وہی جسے اس کی رحمت اپنے آغوش میں لے لے۔ اور (دیکھو) دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی۔ پس وہ انہی میں ہوا جو ڈوبنے والے تھے۔

حضرت نوحؑ بیٹے کی ضد اور حماقت کے انجام سے واقف ہیں۔ وہ اس کے انجام (تباہی و غرقابی) کے تصور سے گھبرا اُٹھتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ٥ (۱۱/۴۵)

اور نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا، خدایا میرا بیٹا تو میرے اہلؑ میں ہے اور یقیناً تیرا وعدہ

لے سورۂ نوح کی آیت (۷۱/۲۸) جو پہلے درج کی جاچکی ہے اور جس میں حضرت نوحؑ نے صرف انہی "اہلِ خانہ" کی مغفرت کی دعا کی ہے جو صاحبِ ایمان ہوں، زیرِنظر واقعہ کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

سچا ہے۔ تجھ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔
اس درخواست کے جواب پر غور فرمائیے کہ یہی جواب تاریخِ انسانیت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ؀ (۱۱/۴۶)

(خدا نے) کہا' اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ وہ تو (سرتاپا) عملِ بد ہے (یعنی جب وہ تیری راہ پر نہ چلا اور بد عملوں کا ساتھی ہوا' تو فی الحقیقت تیرے حلقۂ قرابت سے باہر ہو گیا۔ اب اسے اپنا نہ سمجھ) پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں اس بارے میں سوال نہ کر میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جانا۔

نسلی امتیاز اور قوموں کی تقسیم

واقعہ تو اتنا سا ہے لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ اس پر مزید غور کریں کہ اس کے اندر کس قدر عدیم النظیر حقیقت مضمر ہے۔ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں اور درختوں کی ابتدائی انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں وجہِ جامعیت اشتراکِ نسل تھی، یعنی ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد مل جُل کر اکٹھی رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ تھا۔ یہاں ایک قبیلہ، وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے تصادم پر ان قبائل میں جنگ و پیکار کے مظاہرے بھی رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس جنگ میں حریف و حلیف ہونے کا معیار حق و باطل کا معیار نہ تھا، بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا، یعنی قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی زندگی۔ اب ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر اپنے زمانہ میں پہنچ جائیے جو علم و تمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دورِ جہالت سے اتنا مختلف سمجھتا ہے۔ جتنا انسان اپنے آپ کو حیوان سے مختلف قرار دیتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیمِ انسانی کا تعلق ہے' اس دورِ تہذیب و تمدن کا انسان اُس دورِ جہالت و ظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے۔

آج کی تقسیم

وہاں انسانوں کی تقسیم' قبائل کی رُو سے ہوتی تھی' یہاں وہ تقسیم اقوام کی رُو سے ہوتی ہے۔ اور قوم کیا ہے؟ قبیلہ

کی پھیلی ہوئی شکل۔ یعنی جب ایک قبیلہ بڑا ہو جائے تو اُسے قوم کہا جاتا ہے۔ قوموں کی ابتدائی تقسیم اختلافِ نسب کی رُو سے ہوئی، (مثلاً ایرانی، تورانی، سامی) یا اختلافِ رنگ کی بنا پر (مثلاً سفید، سیاہ اور زرد اقوام)۔ اس بنیادی تقسیم سے آگے بڑھئے تو چھوٹی چھوٹی تقسیمیں جغرافیائی حدود کی رُو سے طے پاتی ہیں، یعنی کسی دریا یا پہاڑ کی حدود کے اندر بسنے والے لوگ دوسری قوم۔ غور فرمائیے! بایں ہمہ ادّعائے تہذیب و تمدّن، انسان ابھی تک اسی چکر میں گرفتار ہے جہاں سے اس نے اپنی تمدّنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ ذرا یورپ کی تقسیمِ اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر ان کی سبعیت و بہیمیت اور وحشت و درندگی پر غور کیجئے۔ کیا آپ کو آلاتِ حرب و ضرب کی نوعیت اور سامان و ذرائع تباہی و بربادی کی ساخت و پرداخت کے علاوہ اُس دورِ جہالت اور اِس دورِ تمدّن میں کچھ بھی فرق نظر آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اس لئے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق مسائل کا صحیح حل صرف وحی کی روشنی میں مل سکتا ہے اور یورپ اس روشنی سے محروم ہے۔ فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَھُوْنَ۔ (۲/۱۵)

نیشنلزم کی لعنت

آج یورپ جس جہنّم کے عذاب میں گرفتار ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نے احترامِ آدمیت کے بجائے قومیت پرستی (NATIONALISM) کو اپنا شعارِ زندگی بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے یہ دنیا انسانوں کی بستی کے بجائے درندوں کا بھٹ بن کر رہ گئی ہے۔ یورپ اس قومیت پرستی کے ہاتھوں کس قدر تنگ آچکا ہے، یہ ہم سے نہیں بلکہ خود یورپ والوں کی زبان سے سنئے۔ الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مسلط کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدّعی ہوں...... ان تمام وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (ص ۱۴۶)

اس سے پیشتر یہی پروفیسر صاحب لکھ چکے ہیں کہ موجودہ دَور کی لڑائیوں کی بنا وہ کشمکش اور جذبۂ رقابت

ومنافست ہے جو مختلف اقوام کے دلوں میں مختلف اقوام کو کچلنے کے لئے پیدا ہوتا ہے[1] (صــ۲) - ان مباحث کا اصلی مقام تو حکومتِ خداوندی کا عنوان ہے۔ لیکن ان اشارات سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ انسان بایں ہمہ دعولئے تمدن وتہذیب ہنوز اسی لعنت میں گرفتار ہے جس میں وہ قبائلی زندگی کے دَور میں تھا۔ یہ ہے وہ روش جس پر انسان نے اپنی تمدنی زندگی کی بنیاد، تنہا اپنے ذہن کی روشنی میں رکھی۔ اس کے برعکس، اس مسلکِ حیات کو دیکھئے جو وحی کی روشنی میں متعین کیا گیا۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جونہی ان کی دعوت کی ابتدا ہوتی ہے قوم دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک وہ جو اس دعوتِ آسمانی پر ایمان لاتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس کی تکذیب ومخالفت کرتا ہے۔ اس دوسرے طبقے میں صاحبانِ دولت وثروت ہیں، اونچے گھرانے کے افراد ہیں۔ دوسری طرف مفلس ونادار انسانوں کی جماعت ہے جنہیں اوّل الذکر طبقہ "اراذل" شمار کرتا ہے لیکن یہ جماعتِ مؤمنین (حزب اللہ) اللہ کے قانون کی حفاظت اور رسول کی رحمت وشفقت کے سائے میں بڑھتی ہے۔ جماعتِ مخالفین خود انہی کی قوم کے افراد ہیں۔ یقیناً ان کے رشتہ دار بھی ہوں گے۔ لیکن ان کے ساتھ اب ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے تعلقات کی بنیاد اب ایک اور ہی جذبہ ہے اور وہ جذبہ ایمان کا ہے۔ حتٰی کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی چونکہ مکذبین کی جماعت میں ہے، اس لئے اس قدر قریبی رشتے کے باوجود ان کے "اہل" میں سے قرار نہیں پاتا۔ اب "اہل" اور "غیر" کی تقسیم کا معیار کچھ اور قرار پاچکا ہے۔ اب ان کے "اہل" وہ "غیر" ہیں جن سے اس سے بیشتر قرابت داری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دعوتِ نوحی سے اس حقیقتِ عظمٰی کی ابتدا ہوئی۔ اس سے آگے آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کے زمانہ میں اس تقسیم کے مظاہرے سامنے آتے جائیں گے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی اس تقسیم کی رُو سے کفّار کی جماعت میں شامل تھی، نبی کے اہل میں سے نہیں تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ اس تقسیم کی رُو سے "غیروں" میں شامل تھے، اپنوں میں سے نہیں تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم باوجود اشتراکِ وطن، قومِ فرعون سے الگ تھی، لیکن قومِ فرعون میں سے جو لوگ اشتراکِ ایمانی میں حضرت

---

[1] نیشنلزم کے متعلق "ابلیس وآدم" میں وحی کے عنوان میں بھی لکھا جاچکا ہے اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔ ویسے اگر آپ تفصیلی بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" ملاحظہ کیجئے۔

نوحؑ کے ساتھ تھے وہ قوم مومنین سے قرار دیئے گئے۔ یہ سلسلہ اسی طرح وسیع ہوتا چلا گیا، تا آنکہ رسول کافۃ للناس کے عہد مبارک میں تمام نوعِ انسانی کی تقسیم اسی اصول کے تحت قرار پا گئی۔ قرآن کریم نے جہاں "قوم الکافرین" کہا ہے تو اس میں دنیا میں ہر گوشے میں بسنے والے کفار آ گئے۔ جب "قوم الظّٰلمین" اور "قوم الفاسقین" اور "قوم المجرمین" کہا گیا تو تمام صفحۂ ارض کے ظالمین و فاسقین و مجرمین اس جدید "قومیت" کے حلقے میں آ گئے۔ اس کے برعکس، جب ارشاد ہوا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۱۰-۴۹) تو اس قومیت کی عالمگیریت و آفاقیت بھی حدود نا آشنا اور قیود فراموش قرار پائی۔ لہٰذا اس اصول کی رُو سے ساری دنیا کے مومن، باوجود اختلافِ رنگ و زبان، وطن، نسب ایک قوم کے فرد اور اس کے برعکس، دنیا بھر کے منکرین، جماعتِ مخالف کے افراد۔ ان دونوں جماعتوں میں دنیا بھر کے اشتراک و وجوہات کے باوجود کوئی اشتراک نہیں تا آنکہ وہ آسمانی وجۂ اشتراک یعنی ایمان کے رشتہ سے اس قومیتِ حقّہ کے رُکن نہ بن جائیں کہ

اندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیارِ قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیلِ آسمانی نہ تھی، لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراکِ وطن یا نسل کو وجۂ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعارِ ملّی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیارِ تقسیمِ انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آ چکا ہے اور اس کے اربابِ فکر و نظر قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ مشہور فرانسیسی مورّخ رینان "ESSAY ON NATIONALITY" میں لکھتا ہے کہ

> انسان کی روح دریاؤں کے رُخ اور پہاڑوں کی سمتوں میں مقید نہیں ہو سکتی۔ وطن کی سرزمین انسان کے لئے جائے قیام اور کشمکشِ کاروبار کے لئے ایک میدان مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان (اس کے لئے) روح مہیا کرتا ہے۔ اس مقدس تشکیل کے لئے جسے قوم (یا ملّت) کہا جاتا ہے، آدمی ہی سب کچھ ہے۔ مادّی اسباب میں سے کچھ بھی اس کے لیے کافی

نہیں ہوسکتا۔

اور (LORD BRYCE) اپنی کتاب (INTERNATIONAL RELATIONS) میں لکھتا ہے کہ

جس چیز پر کسی قوم کی اندرونی اور سب سے گہری زندگی کا انحصار ہے وہ مذہب ہی ہے۔

یورپ کا ایک اور مدبّر (HENRY SIDGWICK) اگرچہ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا (اس لئے کہ اس کے سامنے یورپ کی مختلف اقوام موجود ہیں جو ایک مذہب (عیسائیت) کے باوجود الگ الگ قومیت کی مدّعی ہیں) لیکن جس شے کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے وہ اسلام میں مذہب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں "من تو شدم تو من شدی" کا شعور پیدا ہو جائے۔ یہ شعور کہ وہ ایک "جسدِ واحد" کے مختلف اعضاء ہیں ..... اگر ان میں یہ شعور موجود ہو تو ہم انہیں ایک قوم کے افراد قرار دیں گے خواہ ان میں کوئی اور وجۂ جامعیت ہو یا نہ ہو — (ELEMENTS OF POLITICS)۔ اسلام میں یہ شعورِ یگانگت اس وحدتِ فکر و نظر سے پیدا ہوتا ہے جس کا نام ایمان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم مختلف شعوب و قبائل (اقوام و ملل) کا اعتراف (RECOGNISE) کرتا ہے لیکن صرف تعارفی غرض کے لئے، اس سے زیادہ اور کسی مقصد کے لئے نہیں۔ جیسے کسی شخص کے پانچ سات بیٹے ہوں تو وہ تعارف (پہچان) کی خاطر ان کے الگ الگ نام رکھ لیتا ہے یا جس طرح، محض انتظامی غرض کے لئے کسی مملکت کے مختلف خطّے (صوبے) بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کا کچھ تعارفی نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، دنیا کے مختلف خطّوں میں بسنے والے ممالک میں تعارفی نشانات کو روا رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ تفریق ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث یا قومی عصبیت یا غیریت کا موجب بننے لگے تو یکسر غیر اسلامی ہے اور اس کا مٹانا نہایت ضروری۔ قرآنِ کریم کی رُو سے معیارِ فضیلت فقط تقویٰ ہے اور بس! تمام انسان ایک اصل کی مختلف شاخیں ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اس لئے یہ چیز کہ کوئی شخص کسی آدمی کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے یا اس کا وطن کونسا ہے، نہ وجہ امتیاز بن سکتا ہے نہ باعثِ تفریق۔ قرآنِ کریم نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ

لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ (۴۹/۱۳)

اے نوعِ انسانی! ہم نے تمہیں (سب کو ایک ہی طرح) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (لیکن یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا خبردار ہے۔

چونکہ نسل کی بنیاد پر قبائل کی تقسیم میں ایک دوسرے پر برتری اور فضیلت کا امکان زیادہ تھا (کہ اونچی اور نیچی ذاتیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی دعوت کے ذکر میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ اگر کسی کا اپنا بیٹا بھی، کسی دوسری آئیڈیالوجی (ایمان) کو مانتا ہے تو وہ اور اس کا باپ دونوں ایک جماعت کے رکن، ایک برادری کے فرد اور ایک قوم کے آدمی نہیں بن سکتے۔

عملِ غیر صالح کی ایک اور توجیہہ

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶) سے بعض حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا یہ بیٹا ان کی بیوی کے عملِ بد کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ○ (۶۶/۱۰)

ان لوگوں کے لئے جو (حق و صداقت کی دعوت کا) انکار کرتے ہیں، اللہ نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے زیر تھیں لیکن انہوں نے ان کی خیانت کی تو وہ اللہ کے (فیصلے کے) مقابلہ میں دونوں ان کے کسی کام نہ آ سکے (وہ تباہ ہو کر رہیں اور رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت ان کے کسی کام نہ آ سکی) اور (ان سے) کہا گیا کہ تم دونوں جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

لیکن حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی اس "خیانت" سے خیانتِ عصمت مراد لینا دُور افتادہ سی بات ہے۔ چنانچہ خود اس آیت سے متصل آیت۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ (۶۶/۱۱)

اور ایمان والوں کے لئے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے عرض کیا اے میرے رب! میرے لئے اپنے پاس جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے نجات دے اور مجھے ظالمین کی قوم سے بچاتے رکھ۔

ان آیات میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کا تقابل، فرعون کی بیوی سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ تقابل یہاں کفر و ایمان کا تقابل ہے، عصمت و بے عصمتی کا نہیں۔ پھر حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے کا معاملہ کفر و ایمان سے متعلق تھا۔ اگر ان لوگوں کا خیال صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر حضرت نوحؑ کا بیٹا "انہی کا بیٹا ہوتا" تو اسے عذابِ خداوندی سے نجات مل جاتی، خواہ وہ دعوتِ نوحی کا منکر ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ یہاں تو بتانا ہی یہ مقصود تھا کہ خواہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو اگر جماعتِ مخالف (منکرین) میں شامل ہے تو نسبی تعلق اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا، جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو نسبی رشتہ کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ اور حضور خاتم النبیینؐ کے عہدِ ہمایوں میں بدر و حنین کے میدانوں نے دیکھ لیا کہ کس طرح نسبی تعلقات، ایمانی رشتہ پر قربان کئے جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت نوحؑ (کے بیٹے کی طرح ان) کی بیوی بھی ایمان نہیں لائی تھی اور اس کا حشر بھی وہی ہوا تھا جو دوسرے کفار کا ہوا۔ نہ حضرت نوحؑ کا باپ ہونا ان کے بیٹے کے کام آیا، نہ ان کا خاوند ہونا ان کی بیوی کے کسی کام۔ دین میں باہمی تعلق کی بنیاد ایمان ہے نہ کہ رشتہ داریاں۔

عذابِ الٰہی اور مادّی اسباب

انکارِ رشد و ہدایت کے سلسلہ میں دوسرا اہم گوشہ عذابِ الٰہی کا فلسفہ ہے۔ اس کی تفصیلی بحث کا تو یہ مقام نہیں لیکن یہاں اجمالی اشارات ضروری سمجھے گئے ہیں کیونکہ دعوتِ آسمانی کے سلسلے میں شروع سے اخیر تک یہ ٹکڑا مشترک ہے۔ قومِ نوحؑ کی غرقابی کے واقعہ پر سرسری مورخانہ نگاہ صرف اتنا بتا سکے گی کہ پانی کا بلا انگیز

طوفان آیا اور (سوائے ان لوگوں کے جو ایک کشتی میں سوار تھے) سب غرق ہو گئے۔ ان کی بستیاں نذرِ سیلاب ہو گئیں۔ سارے علاقہ میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ جہاں اس شدت کا سیلاب آتا ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین نے اس امر کی تحقیق کی بھی کوشش کی ہے کہ اس طوفان (DELUGE) کا طبیعی سبب کیا تھا۔ مثلاً 'SUSS' کا خیال ہے کہ "خلیج فارس کا ساحل کسی عظیم الشان آتش فشاں لہر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا طوفانِ بادِ تند (CYCLONE) شامل ہو گیا۔

(ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS)

لیکن ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم ان واقعات کا ذکر کس انداز سے اور کس مقصد کے لئے کرتا ہے قومِ نوحؑ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کی تباہی سیلاب سے ہوئی۔ اس کے بعد قومِ عاد، قومِ ثمودؑ قومِ لوط وغیرہ کے ضمن میں ہم دیکھیں گے کہ ان کی تباہی زلزلہ کے جھٹکوں، کوہِ آتش فشاں کی شررباریوں اور آندھی کے جھکڑوں وغیرہ سے ہوئی یعنی خارجی کائنات کے طبیعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بنے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھے یا انہیں ان کی تباہی کا موجب بنا دیا گیا تھا؟ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ آج بھی زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں۔ سیلاب بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ آندھیوں کے طوفان چلتی ہوئی ریل گاڑیوں کو الٹا کر دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حوادث کسی قوم کی بدعملیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے اخلاقی بدعملیاں شروع کیں اور ان پر اس قسم کا طبیعی حادثہ وارد ہو گیا۔ یا یہ کہ اس قسم کے حوادث میں صرف بدعمل لوگ ہی تباہ ہوتے ہوں، نیک اعمال والے اس سے محفوظ رہتے ہوں۔ یہ طبیعی حوادث دنیا کے ہر خطے میں آتے رہتے ہیں اور ان میں اچھے اور برے ہر قسم کے انسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ یہ حوادث نہ تو کسی قوم کے غلط اخلاقی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے صرف بداعمال لوگ تباہ ہوتے ہیں۔

ابتداءً میرا بھی یہ خیال تھا کہ ان حوادث اور اُن اقوام کے اعمال میں ایک بنیادی ربط تھا۔ لیکن قرآن پر مزید غور و تدبر نے میری راہ نمائی اس طرف کی ہے کہ یہ حوادث ان کے اخلاقی اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہ اُن کی تباہی کا ذریعہ بنا دیئے جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے طبیعی حادثہ کا علم، اس رسول کو قبل از وقت مل جاتا تھا اور اس سے کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ یا تو اس سے

محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر کرے یا اُس سے پہلے اس جگہ سے نکل کر اپنے ساتھیوں سمیت دوسری جگہ چلا جائے۔ چنانچہ ہم نے حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہے کہ انہیں اس آنے والے طوفان کا علم قبل از وقت دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ وہ اس سے بچنے کے لئے کشتی بنالیں۔ وہ اپنے مخالفین کے سامنے کشتی بنانے میں مصروف تھے۔ لیکن چونکہ ان مخالفین کا انداز ہی یہ ہوگیا تھا کہ وہ ان کی ہر بات کو غلط بات سمجھتے اور اس کی تکذیب کرتے تھے، اس لئے وہ بجائے اس کے کہ حضرت نوحؑ کی بات کو سچا سمجھ لیتے اُلٹا ان کا مذاق اڑانے لگے۔ چنانچہ سیلاب اپنے وقت پر آیا۔ حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت اس کشتی کے ذریعہ اس تباہی سے محفوظ رہ گئے اور باقی قوم غرق ہوگئی۔ لہٰذا اُن حوادث کے ذریعے ان اقوام کی تباہی میں اگر کوئی "مافوق الفطرت" عنصر تھا تو اتنا کہ اس رسول کو آنے والے حادثہ کا علم قبل از وقت دے دیا جاتا تھا اور وہ اپنی اور اپنی جماعت کی حفاظت کا مناسب انتظام کر لیتا تھا۔ لیکن نبیٔ اکرمؐ کے زمانہ میں مخالفین کی تباہی کے لئے یہ ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اور چونکہ نبیٔ اکرمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اس لئے اب اس قسم کے حوادث کے قبل از وقت علم مل جانے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا اب قوموں کی تباہی کی یہ صورت اس شکل میں باقی نہیں رہی جس شکل میں یہ اقوامِ سابقہ کے سامنے آیا کرتی تھی۔

قرآن نے قوموں کی موت اور زندگی کے ابدی قوانین دے دیئے ہیں اور یہ بتا دیا ہے کہ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی، جو ان کے خلاف جائے گی وہ تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ جو قوم اپنے معاشرہ کی عمارت غلط بنیادوں پر استوار کرتی ہے وہ اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کی تباہی خود اس غلط معاشرہ کی بنیادوں کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ اس کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے، یعنی قوموں کے اجتماعی اعمال ان کی زندگی اور موت کا باعث بنتے ہیں اور یہ نتائج خدا کے اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جن میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا نہ ہی کسی میں یہ قوت ہے کہ وہ ان قوانین کے نتائج کو بدل دے۔ قوموں کے عروج وزوال کے فیصلے اسی غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتے ہیں اور اسی کو ان کی "تقدیر" کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اقوامِ سابقہ کی تباہی اور اقوامِ حاضرہ کی ہلاکت کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن اقوامِ سابقہ کا تذکرہ اس لئے کرتا ہے کہ بتایا جائے کہ انہوں نے صحیح نظامِ زندگی کی دعوت کو نہ مانا اور اس دعوت دینے والوں کی مخالفت کی اور وہ تباہ و برباد ہوگئے۔ اصل مقصد ان کی غلط

روشِ زندگی کی طرف توجہ منعطف کرانا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے ذرا واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ:

(۱) دنیا میں طبیعی واقعات (PHYSICAL EVENTS) قوانینِ فطرت کے مطابق واقع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی قوم کی بداخلاقی یا حُسنِ اخلاق کا ان پر اثر نہیں پڑتا۔

(۲) طبیعی حوادث (سیلاب، زلزلہ، آندھیاں، جھکڑ، خشک سالی وغیرہ) سے حفاظت (یا ان کی وجہ سے پہنچے ہوئے نقصان کا ازالہ) طبیعی اسباب و ذرائع سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کبھی (مذہب کی زبان میں) نیک عمل یا بدعملی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسا البتہ ضرور ہوتا ہے کہ جس قوم میں اجتماعی بدکرداری (CORRUPTION) آجائے یا جو قوم (مثلاً) عیش و عشرت میں غرق ہو کر اپنے ملک کے نظم و نسق کی طرف سے غافل ہو جائے تو ان کی اس بدنظمی کی وجہ سے اس قسم کے طبیعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں، یعنی یہ حوادث رونما تو ان کی اس طبیعی بدنظمی کی وجہ سے نہیں ہوتے لیکن ان کی بدنظمی کی وجہ سے ان کا نقصان سخت ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ جو قوم اپنے نظم و نسق کو درست رکھے وہ اس قسم کے نقصانات سے یا بالکل محفوظ رہ سکتی ہے یا ان کا ازالہ بعجلت کر لیتی ہے۔

یہی پہلے ہوتا تھا، یہی اب ہوتا ہے۔ اس "سنت اللہ" میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (۳۵/۴۳)۔

(۳) اقوامِ سابقہ جب آرام طلبی، سہل انگاری اور عیش سامانی کی زندگی میں جذب ہو جاتی تھیں تو وہ اپنے اجتماعی نظم و نسق کی طرف سے غافل ہو جاتی تھیں۔ خدا کے رسول، محض واعظ نہیں ہوتے تھے۔ وہ قوموں کو ان کی اس قسم کی بدعملیوں سے بھی آگاہ کرتے تھے لیکن قوم ان کی ایک نہیں سنتی تھی اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جاتی تھی کہ وہ ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی۔

(۴) حضرات انبیائے کرامؑ یا تو اپنی نگہ دور رس سے یا خدا کی طرف سے وحی کی بنا پر، کسی آنے والے طبیعی حادثہ کو ذرا پہلے بھانپ (یا معلوم) کر لیتے تھے۔ وہ قوم کو اس سے آگاہ کرتے اور کہتے کہ وہ اپنی حفاظت کا سامان کر لیں۔ لیکن وہ اپنی خوئے سرکشی اور ہٹ کی بنا پر کان نہ دھرتے۔ نتیجہ یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ اپنے اور اپنی جماعت کے بچاؤ کا انتظام کر لیتے اور باقی ماندہ (سرکش) قوم اس حادثہ کی وجہ سے تباہ ہو جاتی۔

یہی کچھ اُس زمانے میں ہوتا تھا، یہی کچھ آج ہو گا۔ آج، ان اقوام کو متنبہ کرنے والے "رسول" نہیں ہوں گے، انہی کے دیدہ ور ہوں گے۔ جو ان کی مان لے گا، تباہی سے بچ جائے گا۔ جو نہ مانے گا تباہ ہو جائے گا اور یہ تباہی

اجتماعی ہو گی۔ جس قوم کے انجینئر بند کی تعمیر کے وقت سیمنٹ کی جگہ ریت استعمال کریں گے وہ قوم سیلاب کی نذر ہو جائے گی۔ قوم کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایسا انتظام کیوں نہ کیا کہ سیمنٹ کی جگہ ریت کا استعمال نہ ہو۔

حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی کہ

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اور نوح نے دعا کی، اے اللہ ان نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑیو۔

کیا طوفانِ نوحؑ عالمگیر تھا؟

بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور تمام صفحۂ ارض اس کی لپیٹ میں آگیا تھا اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں اور دانستہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے۔ تورات (کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر مینہ برساؤں گا اور ہر اس ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔ (پیدائش ۷/۴) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد (۷/۱۲) ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا (۷/۲۴) اور ساتویں مہینے سفینۂ نوح ارارط کی پہاڑیوں پر جا کر رکا اور دسویں مہینے میں جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں۔ (پیدائش ۸/۵-۴) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتئ نوح میں تھے ان کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۷/۲۴-۲۱)۔ لیکن قرآنِ کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کا مخاطب اپنی قوم سے تھا۔ ان کی دعوت انہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہٰذا یہ تباہی بھی انہی پر وارد ہوئی۔ باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ طوفانِ نوحؑ کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی۔ باقی رہا یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی دعا میں یہ کہا تھا کہ

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ۔

تو اس میں (اَلْاَرْضِ) سے مراد تمام صفحۂ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی۔ قرآنِ کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں 'اَلْاَرْض' سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصۂ حضرت موسیٰؑ

میں فرمایا ہے کہ۔

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ (۱۰/۸۳)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش بادشاہ تھا۔

یہاں الارض ملکِ مصر کے لئے آیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرّد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا، بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ...... (۳۸/۲۶)۔

اے داؤد! ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤدؑ کی سلطنت تمام صفحۂ ارض پر نہیں تھی، بلکہ ایک خاص خطّۂ ملک میں تھی۔ لہٰذا اُن مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں، بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعۂ زیرِ نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصّۂ حضرت نوحؑ میں "الارض" سے ہے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ (۲۹/۱۴)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔

عمرِ نوحؑ

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی؟ اگر تورات کی جائے تو حضرت نوحؑ آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ نو نو سو سال کی لکھی ہیں۔ چین کے مذہب TAOISM کا ایک بہت بڑا مبلغ KWANG چوتھی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ یہ وہ بتانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم رُو بہ انحطاط نہیں ہوا۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی۔ یہ عرصۂ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا، یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ زیرِ نظر آیت میں ہے۔

فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱۴)

اس میں ایک ہزار کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِيْنَ کے ساتھ عَامًا کا۔ سَنَةٍ اور عَامًا دونوں کے معنی سال ہیں اس فرق کے ساتھ کہ سَنَةٍ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں اور عامًا خوشحالی کے سال کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا۔

اس ساڑھے نو سو برس کی مدت کو حضرت نوحؑ کے زمانۂ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نو سو باون (۹۵۲) سال کا فرق ہے۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے، تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور طلب ہے۔ عربی لغت میں سَنَةٌ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں، یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اَلْفَ سَنَةٍ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ہیں، اس لئے اگر خَمْسِيْنَ عَامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔

بہرحال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی، اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں اپنا

ثابت کردیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

یہ ہے قومِ نوحؑ کی داستانِ عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر وحی فرمایا:۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۹/۱۱)

(اے پیغمبرؐ!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ پس تو ان تاریخی شواہد کی روشنی میں اپنے منصب پر استقامت سے جمارہ انجام کار متقیوں ہی کے لئے ہے۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے قصے نبیٔ اکرمؐ کے زمانہ میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے حضورؐ اور اہلِ عرب اُن سے واقف تھے۔ پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امورِ غیب ہیں جن سے نہ نبیٔ اکرمؐ آگاہ تھے نہ ان کی قوم۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفاصیل قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبان زدِ خلائق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصۂ قومِ نوحؑ کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے بیان کردہ قصے اور قرآنِ کریم

تورات کی تفاصیل

کا مقابلہ کرکے دیکھئے' حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ (اس) تورات میں ذہنِ انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے اور قرآنِ کریم کے بیان میں کس قدر صداقت و پاکیزگی ہے۔ قصصِ قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مؤرخانہ وقائع نگاری مقصود نہیں ہوتی، بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصۂ قومِ نوحؑ میں اہم نکات یہ ہیں کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرّد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گذر گیا تو وہ قوم طوفان کے ذریعے ہلاک ہوگئی۔ اب دیکھئے کہ بائبل طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے۔

"اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال

روز بروز صرف بد ہی ہوتے ہیں ٥ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتاتا اور نہایت
دل گیر ہوا ٥ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا ۔
انسان کو اور حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک کیونکہ میں ان کے بنانے
سے پچھتاتا ہوں ٥ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔" (پیدائش ۵ ـ ۶/۸)

ذرا غور فرمائیے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالقِ ارض وسمٰوٰت نے بنانے کو تو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنا لے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کر دیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحۂ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصدِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوحؑ برپا کیا گیا۔

(۲) کتابِ پیدائش کے مذکورہ صدر بیان، نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رُو سے طوفانِ نوحؑ عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحۂ ارض پر جس قدر ذی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ تاریخی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار عنوان "طوفان" (DELUGE) کے تحت لکھتا ہے کہ

ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ اربابِ تحقیق وخبر کے نزدیک بالکل مرفوع القلم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآنِ کریم کی رُو سے یہ طوفان صرف قومِ نوحؑ کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے۔

(۳) تیسرا اہم نکتہ پسرِ حضرت نوحؑ کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم میں بتایا گیا ہے کہ اُس کے غیر صالح اعمال اُسے کس طرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ "اپنا" ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائبل میں پسرِ نوحؑ کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتابِ پیدائش کے نویں باب میں ہے:۔

اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا ٥ اور اس کی مے پی کر نشے میں
آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا۔ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا
اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی ٥ تب سم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں
پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا۔ پر ان کی پیٹھ اس کی طرف تھی کہ انہوں
نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا ٥ جب نوح اپنے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے

بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا ○ تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا ○ پھر بولا خداوند سمؔ کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہو ○ خدا یافت کو پھیلاتے اور وہ سمؔ کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ (کتاب پیدائش ۲۰۔۲۷/۹)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل حام کا قصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا ستر دیکھ لیا، لیکن اُس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ قصور حام کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزاوار اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسول کو ایک ایسی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے جس سے سعید فطرت کا تصور بھی کانپ اُٹھے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعتِ مرتبت اور علوِ مدارج درخشندہ و تابناک صورت میں آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوحؑ خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۙ (۳/۳۲)

بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عبدِ شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ○ (۱۷/۳)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا! اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسن نتائج سے بھرپور ہوتے تھے۔

خدا کے مؤمنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَلَقَدْ نَادَانَا نُوحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ○ .... إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ○ (۷۵ ـ ۳۷/۸۱)

اور یقیناً نوحؑ نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو کربِ عظیم سے نجات دی۔

اور اس کی نسل کو ہی باقی رہنے والوں میں رکھا اور آنے والوں میں اس کا (نیک) نام باقی رکھا۔ نوحؑ پر اقوامِ عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵۷/۲۶)

اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسول بنا کر بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذرّیت) میں سے ہدایت پر بھی ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

خدا نے ان کی پکار کو سنا اور اسے شرفِ قبولیت سے نوازا۔

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝ (۲۱/۷۶) ؛ (۳۷/۷۶)

اور (اسی طرح) نوحؑ کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوں) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے ہمیں پکارا تھا (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دیدی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکاماتِ الٰہیہ کے سچے فرمانبردار، پیکرِ تسلیم و رضا اور مظہرِ اطاعت و انقیاد تھے۔ (۷۱/۳-۱)

مُسْلِم آیت (۱۰/۷۲) میں مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے نگینے کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقامِ نبوت وہ مقام ہوتا ہے جہاں خدا کے قوانین و احکام کی کامل اطاعت ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں صحیح اختیار کی پوری شان جلوہ ریز ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ قرآنِ کریم نے جس سب سے پہلے رسول کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلۂ زرّیں میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ انسان اسی گرامی مرتبت خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کا راز ہے اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضور ختمی مرتبتؐ کے عہدِ ہمایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا۔ گویا سلسلۂ رسالت و نبوت کی داستان قدسی اسلام اور اُمتِ مسلمہ ہی کی داستان ہے۔

لہٰذا، تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ بنابریں یہ کہنا کہ قرآن میں مذکور واقعہ تورات سے اخذ کیا گیا ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے امم سامیہ آئے جن کا ذکرِ جلیل آئندہ اوراق کے لئے وجہ زینت و مایۂ افتخار ہوگا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء ہیں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۱۷/۳)

تم (اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا۔ وہ ایک عبدِ شکور تھا۔

انہی کی نسل آگے بڑھ کر مختلف ندیوں اور دریاؤں کی صورت میں صفحۂ ارض پر پھیلی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ (۳۷/۷۷)

اور ہم نے اسی نسل کو باقی رہنے والوں میں سے بنایا۔

تاریخ کے پارینہ اور منتشر اوراق اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال آہستہ آہستہ اسی مؤسس اولیٰ کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہدِ کہن کے متعلق کیا کیا امور منصۂ شہود پر آئیں گے۔ سرِ دست ارباب نظر کے لئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (DELUGE) کی داستانیں دنیا کے قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر کرتی ہے۔ یونان، ایران، ہندوستان، چین حتیٰ کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیر الاوّلین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصّہ بڑے دلچسپ انداز میں مذکور ہے۔ ست پت برہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی

کے لئے غسل کا پانی لایا گیا، تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفانِ عظیم سے نجات دلا دوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا اور اس کی ہدایت کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو ویدوں کو چرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ راز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی۔ اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفانِ بلا انگیز برپا کر کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم آنے والے انکشافات، ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصوں کی قدرِ مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہرحال، قرآنِ کریم میں جس طوفان کا قصہ مذکور ہے اُسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک "پرانا قصہ" نہیں، اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینے میں تقدیرِ اُمم کے خطوط اُبھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ قرآن میں سلسلۂ انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کا آغاز حضرت نوحؑ کے قصہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر حضرت آدم کو سب سے پہلا نبی تصور کیا جاتا ہے اور اس سے مراد لئے جاتے ہیں وہ "آدم" جو جنت سے نکلے تھے۔ "جنت سے نکلنے والے آدم" کے متعلق ہم "ابلیس و آدم" میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ وہ کسی خاص فرد کا ذکر نہیں بلکہ خود نوعِ انسانی کا ذکر ہے۔ وہ کسی خاص فرد "آدم" کی کہانی نہیں، خود "آدمی" کی سرگذشت ہے۔ قرآن میں آدمی کے بجائے آدم کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے "جنت سے نکلنے والے آدم" سب سے پہلے نبی نہیں ہیں۔ البتہ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا...... (۳/۳۲)

اس میں آدم کا لفظ نوح کے ساتھ آیا ہے اور ان کے لئے لفظ اِصْطَفٰی آیا ہے۔ اگرچہ اس لفظ سے بالضرور نبوت ہی مراد نہیں ـــ قرآن میں یہ لفظ غیر از نبی کے لئے بھی آیا ہے ـــ لیکن اگر اس سے نبوت ہی مراد لے لی جائے، تو اس آیت (۳/۳۲) سے زیادہ سے زیادہ یہ مترشح ہو گا کہ حضرت نوحؑ سے پہلے جو انبیاء گذرے تھے یا جو ان کے ہم عصر تھے، ان میں سے کسی کا نام آدم بھی ہو گا۔ (انگریزی زبان میں اب بھی لوگوں کے نام ADAM

ہوتے ہیں۔ یہ آدمؑ بہرحال "جنّت سے نکلنے والے آدم" نہیں تھے۔ (جیساکہ اوپر لکھا گیا ہے) وہ آدم کوئی ایک فرد نہیں تھا۔ ویسے بھی قصّۂ آدمؑ میں جس معصیت کا ذکر ہے (یعنی خدا کے حکم سے دیدہ دانستہ سرکشی) وہ کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی۔ اس کے مرتکب عام آدمی ہی ہوسکتے ہیں۔

خلاصۂ مبحث

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطّۂ زمین اور کونسی نسل سے ہوئی، یہ مسئلہ ایک مدّت سے اربابِ علم وتحقیق کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کا رُخ اسی طرف ہے کہ اس کی ابتداء عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل آنے والی تہذیب وتمدن کی مؤسّس تھی۔ اسی قوم میں، دجلہ وفرات کی وادیوں میں، آج سے قریب چھ سات ہزار سال پیشتر، حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس قوم میں طبقات کی تقسیم اور پیشوں کے اعتبار سے تفریق وتمیز شروع ہوچکی تھی۔ اربابِ اقتدار وثروت نے اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت کی جو حکومت واختیار اور رزق کے سرچشموں کو ان سے چھین کر خدا کے قانون کے سپرد کردینے کا مدّعی تھا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور یوں دو محاذ بالمقابل قائم ہوگئے۔ جب اربابِ سطوت واقتدار کا جور واستبداد حد سے بڑھ گیا اور اس امر کا یقین ہوگیا کہ ان کا ناسور لاعلاج ہے تو مکافاتِ عمل کے اٹل قانون کے ماتحت حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کرکے بچا لیا گیا اور باقی سب نذرِ طوفان ہوگئے۔ مخالفین میں حضرت نوحؑ کا اپنا بیٹا بھی تھا اور آپ کی بیوی بھی۔ لیکن انہیں نبی کی قرابت داری اس ہلاکت وتباہی سے نہ بچاسکی جو ان کی سرکشی کا نتیجہ تھا۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ وہ درحقیقت حضرت نوحؑ کے "اہل" میں سے نہ تھے، دنیا میں انسانوں کی تقسیم کا ایک ایسا بنیادی اصول سامنے کردیا ہے جس نے نسلی، جغرافیائی، لسانی، وطنی حدود وقیود کو مٹا کر ساری تقسیم وتفریق حزب اللہ اور حزب الشّیطان کے اصول پر رکھ دی ہے۔

قصّۂ حضرت نوحؑ کی تفاصیل تورات میں بھی ہیں۔ لیکن ان تفاصیل کو دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان میں ذہنِ انسانی کی افسانہ طرازیوں نے کس درجہ دخل اندازی کی ہے اور یوں آسمانی تعلیم کو کس طرح مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔

"طوفان" کا تذکرہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم کے اساطیر الاوّلین میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ مزید تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات تمام روئے زمین کی آبادی کی اصل کو شاید

اس خطہ کی طرف مرکوز کردیں جس میں طوفانِ نوحؑ برپا ہوا تھا۔

اس مقام پر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ حضرت نوحؑ نے جس تعلیم کی دعوت دی اس کی مخالفت قوم کے اربابِ دولت واقتدار کی طرف سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعلیم محض "خدا کی پرستش" کے متعلق ہوتی تو اس کی مخالفت خصوصیت سے اربابِ دولت واقتدار کی طرف سے کیوں ہوتی۔ "پرستش کے معاملہ میں تو عوام" سب سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں، یہ مخالفت ان کی طرف سے ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ عوام تو اس دعوت کے ساتھ تھے اور اوپر کا طبقہ اس کا مخالف تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس سے اربابِ دولت واقتدار کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت میں ایڑھی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ جس انقلاب کی طرف دعوت دیتے تھے اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ رزق کے سرچشموں کو افراد کے پنجے سے چھڑا کر قانونِ خداوندی کے تابع کر دیا جائے تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بن سکیں۔ یہی وہ دعوت ہے جس کی مخالفت ہمیشہ اربابِ حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ قرآن نے سب سے پہلی دعوت میں اس کشمکش کا ذکر کیا ہے اور یہی کشمکش اس کے بعد ہر دعوت میں نظر آئے گی۔

وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

آہ قومے دل زِ حق پرداختہ
مُرد و مرگِ خویش را نشناختہ

حضرت ہود علیہ السلام

(قومِ عاد)

جیسا کہ سابقہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے، تورات کی رُو سے اقوامِ عالم کی تقسیم حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں (یافت، حام اور سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تورات کی اس تقسیم کی تاریخی حیثیت کچھ ہی ہو، لیکن تحقیقاتِ جدیدہ اس نتیجہ تک ضرور پہنچ چکی ہیں کہ عرب اور اس کے گرد و پیش (شام عراق وغیرہ میں) اُمم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قبیلہ **عاد** کا تھا۔ قبیلہ کیا! یہ تو ایک عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف حضرت موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیجِ فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر اور شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال (ق۔م) ان تمام علاقوں پر اسی قوم کا تسلط و اقتدار نظر آتا ہے۔ **سام کے بیٹے ارم** کی نسبت سے انہیں **عادارم** بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو اڑھائی ہزار سال (ق۔م) اس قوم کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا، تو اس زمانہ میں قوموں کے عروج و زوال کی رفتار کے اعتبار سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی ابتدا کب سے ہوئی ہو گی؟ یوں سمجھئے کہ قومِ نوحؑ کی بربادی کے بعد جب یہ علاقے دوبارہ آباد ہوئے تو **بنی سام** کی پہلی ترقی اسی **قومِ عاد** سے ہوئی ہے۔ یہی قومِ عاد ہے جس کی طرف حضرت **ہودؑ** مبعوث ہوئے۔ ان کا مقامِ بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ **احقاف** صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب **ربع خالی** کہا جاتا ہے، احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کو ہ تمثال

ریت کے ٹیلے، خوف و دہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں. لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اُڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اُسے اس طرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر محکمۂ آثارِ قدیمہ والے ہی ان کا سُراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے. کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبادیاں، قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں. کم از کم ایک کا ذکر تو سُن لیجئے. یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہودؑ کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے، اِلّا ان کے جو حضرت ہودؑ کے ساتھ بچا لئے گئے اور جو پھر عادِ ثانیہ کہلائے. کیونکہ عادِ اولیٰ وہ تھے جنہیں اُن کی اپنی غلط روشِ زندگی کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیا گیا.

قومِ نوحؑ کی جانشین

قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد قومِ عاد کو ان کا جانشین بنایا گیا اور انہیں دنیا میں بڑا اقتدار و تسلط اور وسعت و قوت عطا فرمائی.

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۶۹)

تم اس حقیقت کو سامنے لاؤ کہ اس نے کس طرح قوم نوحؑ کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی. پس چاہیئے کہ اللہ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو، تاکہ ہر طرح کامیاب ہو.

فارغ البالؔ و مرفّہ الحالؔ

آبپاشی و سیرابی کے لئے قدم قدم پر چشمے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات، افراد اور مواشی کی کثرت، یہی کچھ اُس زمانہ میں قوت و سطوت کے استحکام و حصول کے ذرائع تھے. غرضیکہ ہر شے کی فراوانی. حضرت ہودؑ نے انہیں قوانینِ الٰہیہ کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہی انعاماتِ خداوندی کی طرف اشارہ کیا تھا.

وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ (۲۶/۱۳۲-۱۳۴)

اور اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت رکھو جس نے تمہیں وہ چیزیں بکثرت دیں جو تمہیں معلوم ہیں.

اُس نے تمہیں مواشی اور اولاد بکثرت دی (نہ صرف یہی بلکہ) باغات اور چشمے بکثرت دیئے!
وہ ایسے ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے حکومت کرنی ہے۔

وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ (۲۶/۱۲۹)

اور (اے قوم عاد!) کیا تم مضبوط مضبوط قلعے بناتے ہو' شاید تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہو گے؟

ستونوں والے

اسی بنا پر قرآنِ کریم نے انہیں "ستونوں والے" کہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ۝ (۸۹/۸-۶)

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ (کون سی قوم عاد! وہی) بڑے بڑے ستونوں والی قوم ارم، جس کے مثل شہروں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

جیسا کہ دنیا کی بڑی بڑی صاحبِ قوت و سطوت اقوام کا شیوہ ہوتا ہے' وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنی بڑی بڑی یادگاریں قائم کرتے تھے جن کی افادیت کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ محض اس قوم کے جذبۂ تکبّر و تعلّی کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں' حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ (۲۶/۱۲۸) "تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسی عمارات بطور یادگار بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں"۔

علم و بصیرت بھی

غرضیکہ انہیں ایسا تمکّن فی الارض عطا ہوا تھا کہ شاید ہی کسی دوسرے کے حصّہ میں آیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ تمام قوت و حشمت' جہالت کو لئے ہوئے نہ تھی، بلکہ انہیں ذرائع علم (سماعت و بصارت و قلب) بھی عطا ہوتے تھے۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً (۴۶/۲۶)

اور ہم نے انہیں وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو ہم نے زمین میں تمہیں بھی نہیں بخشی اور انہیں (سننے کے لئے) کان، (دیکھنے کے لئے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لئے) دل (عقل و شعور)

عطا کئے تھے۔

قرآن نے سمع و بصر کے الفاظ اس علم کے لئے استعمال کئے ہیں جو مظاہرِ فطرت پر غور و خوض کے بعد حاصل ہوتا ہے، یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) جو حواس کے ذریعے مشاہدات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سمع و بصر، حواس کے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ تیسرا لفظ افئدۃ ہے۔ اس کے معنی "MIND" کے ہیں، یعنی مشاہداتِ فطرت سے معلومات حاصل کر لینے کے بعد، قلب اور دماغ کے ذریعے استنباطِ نتائج کرنا۔ اس قسم کا علم تھا جو قومِ عاد کو حاصل تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اس علم کے ماحصل (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ سائنس کی ایجادات وغیرہ) کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ قوانینِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ علم کے ماحصل نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کیا جائے۔ لیکن جو قومیں غلط روشِ زندگی پر چلتی ہیں وہ ان قوتوں کو باقی انسانوں کی غلامی کا ذریعہ بنا لیتی ہیں اور ان کی محنت کی کمائی کے سلب و نہب (EXPLOITATION) کو اپنی کاریگری قرار دے لیتی ہیں۔ یہی کچھ قومِ عاد کرتی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ہر مستبد قوم کی طرح ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جن قوموں پر ہاتھ ڈالا، آہنی شکنجے میں جکڑ لیا کہ ان کی غلامی کے جال کا کوئی حلقہ ڈھیلا نہ ہونے پائے۔

وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ ۚ (۲۶/۱۳۰)

اور جب تم لوگوں پر گرفت کرتے ہو تو بڑے اجبروت بن کر گرفت کرتے ہو (کہ کوئی تمہارے چنگل سے نکلنے ہی نہ پائے)۔

تکذیبِ رُسُل اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رسول بھیجے۔ لیکن نشۂ حکومت و قوت میں پیغاماتِ خداوندی پر کان کون دھرتا ہے؟ انہوں نے متواتر ان رسولوں کی تکذیب کی اور اپنے ظلم و استبداد میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

کَذَّبَتۡ عَادُ ۣ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۚۖ (۲۶/۱۲۳)

قومِ عاد نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

قوانینِ خداوندی سے بغاوت اور اپنے سرکش و جابر اربابِ حکومت کا اتباع، یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔

وَ تِلۡکَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَ عَصَوۡا رُسُلَہٗ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۵۹﴾ (۱۱/۵۹)

یہ ہے سرگذشت عاد کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا، ان کے رسولوں کی نافرمانی کی اور اپنے متکبر سرداروں کی اطاعت اختیار کی۔

حضرت ہودؑ

بالآخر جب جور و استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہو گئی اور سنت اللہ (قانونِ مکافات) کے مطابق ان کی غلط روشِ زندگی کے ظہورِ نتائج کا وقت قریب آپہنچا تو آخری کوشش کے طور پر اُن کی طرف اُنہی میں سے (ایک رسول حضرت ہودؑ) کو بھیجا گیا۔

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۷/۶۵ نیز ۱۱/۵۰، ۲۶/۱۲۴؛ ۴۶/۲۱)

اور (اسی طرح) ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے قوم! اللہ کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟

خدا کی حکومت کی طرف دعوت

آپ آئے اور اس سرکش و متمرد قوم کو اسی پیغامِ ازلی کی دعوت دی جو ہدایتِ آسمانی کی اصل و اساس ہے، یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزاوار فقط ایک ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ (۷/۶۵؛ ۱۱/۵۰؛ ۴۶/۲۱)۔

قوانینِ الٰہیہ اور دنیاوی برکات

قوم قوت و سطوت کی مالک تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایتِ آسمانی کے اتباع سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم حکومت و دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زاویوں اور خانقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہودؑ نے اس باب میں ایک ایسی حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباعِ قوانینِ الٰہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (۱۱/۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو! تم قوانینِ الٰہیہ کی حفاظت میں آجاؤ، یعنی غلط روش چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کرو۔ وہ تم سب پر برستے ہوئے بادل بھیجے گا (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو

جائیں گے) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھا دے گا (کہ روز بروز گھٹنے اور کمزور ہونے کی جگہ اور زیادہ بڑھتے اور قوی ہوتے جاؤ گے)۔ اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اس سے مُنہ نہ موڑو۔

یہ ہے عظیم فرق آسمانی ہدایت اور ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ تصورِ مذہبیت میں۔ ذہنِ انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یکجا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ دنیا سے مراد ہے قوت و سطوت، دولت و حشمت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دینداری سے مفہوم ہے بےکسی و بیچارگی، عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگواریوں سے نفرت کی جائے اور ترکِ لذائذ سے "پرہیزگاری" کو مقصدِ حیات قرار دیا جائے۔ لیکن یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ دنیا بھر کے سرکش و متمرد انسانوں سے قوت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعت مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے بلکہ قوانینِ خداوندی کے ماتحت نظم و ضبطِ عالم کو ترتیب دے اور تمام نعمائے دنیا کو نوعِ انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے عام کر دے (تفصیل ان اشارات کی اپنے مقام پر آئے گی)۔ حضرت ہودؑ نے یہی فرمایا کہ میں جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ فقط نظامِ معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہو گی کہ

نظامِ حکومتِ خداوندی کی عملی تشکیل

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ (۲۶/۱۲۵-۱۲۶، ۲۶/۱۳۱)

میں تو تمہارے لئے ایک امانت دار (خدا کا) پیغامبر ہوں۔ تو تم اللہ کے قوانین کی نگہداشت کرو اور اس کے لئے میری (یعنی ان احکام کی جو میں خدا کی طرف سے تمہیں پہنچا رہا ہوں) اطاعت کرو۔

غور کیجئے، منصبِ رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ نہیں، بلکہ اس حکومتِ خداوندی کے مرکزِ اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۲۷ ؛ ۱۱/۵۱)

میں اس بات کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو صرف پروردگارِ عالم پر ہے (اور بس!)

تکذیب، اربابِ اقتدار کی طرف سے

یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہودؑ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کس طرح اس نظام کو قبول کر لیں! سب سے پہلی تکذیب حسبِ معمول قوم کے سرداروں کی طرف سے ہوئی، انہی سرداروں کی طرف سے جن کے گھروں میں" برتن بھرے ہوئے تھے۔"

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۷/۶۶)

اس پر قوم کے مرفّہ الحال لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا کہ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو۔

اس کے جواب میں حضرت ہودؑ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝......

...... فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۶۷-۶۹)

ہودؑ نے کہا" بھائیو! میں احمق نہیں ہوں۔ میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، فرستادہ ہوں۔ میں اس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اور یقین کرو کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں۔ کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے؟ خدا کا یہ احسان کرو کہ اس نے قومِ نوحؑ کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی پس چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو، تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔

ان آیاتِ جلیلہ میں دو تین باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ نشۂ حکومت و دولت میں سرمست

انسان، دعوت الی الحق کو کس طرح نفرت و استہزاء سے ٹھکراتا ہے۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ اور لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ پر غور کیجئے۔ تمرد و سرکشی کی بدمستیاں کس طرح چھلکتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ پھر مقابلہ میں جواب دیکھئے! کس قدر متانت و سنجیدگی کا مظہر ہے۔ شکن بجبیں نہیں، کف بدہاں نہیں، نعل بر آتش نہیں، گالی کا جواب (معاذ اللہ) گالی نہیں، کوئی اوچھا پن نہیں، سفاہت نہیں۔ اپنے مقامِ بزرگ و بلند پر پہاڑ کی طرح محکم کھڑے ہیں۔

محکم چوں کوہسار

اس لئے کہ اپنی دعوت کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہے۔ قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کی مخالفت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قومِ مخالف کے جدال و قتال کی بہ نسبت ان کی طرف سے تکذیب و استہزاء کا ذکر بڑا نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ جدال و قتال بھی اپنے مقام پر آزمائش کی گھاٹیاں ہیں۔ لیکن ایک داعیؑ مصلح کی راہ میں تکذیب و تحقیر کی منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ عام انسانوں پر نگاہ ڈالئے۔ وہ بالعموم بڑی بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کریں گے، لیکن جونہی ان پر کسی نے تنقید (CRITICISM) کی یا ان کا استہزاء (RIDICULE) کیا، ان کی بات کو جھوٹا بتایا، ان کی دعوت کا مذاق اُڑایا تو وہ فوراً آپے سے باہر ہو گئے اور پھر اس کے بعد ایسی چوکڑی بھولے کہ حصولِ مقصد و نصب العین کے لئے تگ و تاز کے بجائے اسی تنقید و تنقیص کی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ استہزاء و تنقیص کے مرحلہ میں دامنِ ضبط و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، فی الواقعہ من عزم الامور ہے اور آسمانی انقلابِ ربوبیت کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ سردارانِ قوم کی اشتعال انگیز تنقیص پر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد حضرت ہودؑ کے متین و سدید جواب پر۔ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دوسری چیز وہی ذہنِ انسانی کی عجوبہ پسندی؛ یعنی قوم کو حیرت و استعجاب اس امر پر ہے کہ انہی جیسا ایک انسان (رَجُلٌ مِّنْكُمْ) اور دعوائے رسالت! قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۴/۱۰)۔

انہوں نے کہا کہ تم تو محض ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اور کوئی مافوق الفطرت چیز بھی تمہارے پاس نہیں) مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۱/۵۳)۔ اس لئے

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ؀ (۱۱/۵۳)

تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ نہیں سکتے اور نہ ہی تمہاری بات مان سکتے ہیں۔

پھر وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ تم جو (معاذ اللہ) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو اس کا

سبب ہماری سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں آتا کہ تم نے جو ہمارے دیوی دیوتاؤں کی تکذیب کی ہے تو تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ (۱۱/۵۴)

ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے۔ (اسی لئے تو اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے)۔

یہ جگر سوز طعن و تشنیع دیکھئے اور پیغمبرانہ جواب ملاحظہ فرمایئے کہ

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ (۱۱/۵۴)

ہودؑ نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، مجھے ان سے کچھ سروکار نہیں۔ میں ان سے سراسر بیزار ہوں۔

اسلاف پرستی

یہاں تک تو نشۂ قوت و دولت کی سرمستیوں کے مظاہرے تھے۔ اب دنیائے معتقدات اور اس کی جذبات پرستی کی طرف آیئے، یعنی وہی سازِ کہن کہ چونکہ تمہاری دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ہم میں آباء و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے، اس لئے ہم اس دعوت کی تکذیب کرتے ہیں! وہی اسلاف پرستی اور وہی قدامت پسندی!

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ (۷/۷۰)

انہوں نے کہا، کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک ہی خدا کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرلیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے آئے ہیں!

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے اس ادّعا کے جواب میں حضرت ہودؑ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس میں اربابِ فکر و نظر کے لئے حکم و بصائر اور معارف و حقائق کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ فرمایا۔

اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (۷/۷۱)

جس چیز کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو اس کی حقیقت کیا ہے؟ فقط اتنی کہ وہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لئے ہیں اور جن کے لئے خدا نے کوئی سند نہیں اتاری۔

تبیانِ حقیقت اس چھوٹے سے ٹکڑے پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کتنی عظیم حقیقت اس کے اندر منعکس ہے۔ یہ روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتدا میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا جس کا کچھ نام رکھ لیا گیا۔ جب وہ دو چار نسلیں متوارث چلا آیا، تو اس کی کہنگی، وجۂ تقدس ہو گئی اور وہ نام دل کی انتہائی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ عقل و بصیرت کی کوئی دلیل اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک پتھر، پہاڑ کے کسی گوشے میں پڑا ہے، تو فقط پتھر ہے۔ لیکن اُسے کسی چبوترہ پر الگ نصب کر کے اس کا کچھ نام رکھ دیجئے۔ اس نام کی ترویج دو تین نسلوں تک مسلسل ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ اس کی روایتی عظمت دلوں میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی اور اس طرح وہی پتھر جو "گمنامی" کے ایک گوشے میں پڑا تھا، قلوب و نگاہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ حالانکہ چشمِ حقیقت بین کے نزدیک محض نام رکھ دینے سے اس کی ماہیت اور حقیقی قدر و قیمت (INTRINSIC VALUE) میں کچھ فرق نہیں آ گیا۔ اب اس خارجی دنیا سے ہٹ کر ذرا اپنے دماغ کے بُت کدہ کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے "پتھر" ایسے رکھے ہیں جن کی قدر و قیمت کے متعلق آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل و شہادت نہیں کہ ان کے نام کی عظمت نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آتی ہے اور محض قدامت کی بنا پر ان ناموں میں شانِ تقدس پیدا ہو چکی ہے۔ دیکھئے کہ یہ نام آپ کے نزدیک اس قدر مقدس بن چکے ہیں کہ اُن کے خلاف آپ ایک لفظ تک سننا نہیں چاہتے! پھر یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قدر و قیمت کے پرکھنے کے لئے کیا معیار مقرر فرمایا ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۷/۷۱) یعنی ان چیزوں کی عظمت و تقدس کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند تمہارے پاس نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ ہو۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھ کر دیکھ لیجئے۔ یہ "دھرم کانٹا" جو وزن بتائے وہی درست اور صحیح ہے، خواہ آپ کا ذہن یا اسلاف پرستی کے معتقدات کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ محض اسماء کو دلیل اور حجت سمجھ لینا، حقیقت

فراموشی اور خود فریبی ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے فقط ایک ہے مَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ جو اللہ نے نازل کیا ہے۔

تکذیب میں شدت

حضرت ہودؑ کی دعوت اور قوم کی طرف سے تکذیب برابر آگے بڑھتی گئی۔ طبیب کی شفقت اور مریض کی ضد متوازی چلتی گئی۔ حضرت ہودؑ ان سے بار بار کہتے تھے کہ دیکھو! قوانینِ الٰہیہ سے سرکشی کا مسلک چھوڑ دو، ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوگا۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسمان کی فضا میں کس طرح اس وبا کے جراثیم پھیلتے جا رہے ہیں جو قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت تم پر عذاب بن کر مسلط ہو جائیں گے اور پھر کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔ لیکن قوت اور دولت کا نشہ ان باتوں کی طرف کب کان دھرنے دیتا ہے؟ سرکش و متمرد انسان دیکھتے تھے کہ جس طرف ان کا قدم اٹھتا ہے عروج اور ترقی آگے بڑھ کر رکاب تھامتی ہے۔ ان بڑھتی ہوئی کامیابیوں اور چڑھتی ہوئی کامرانیوں میں ہلاکت و بربادی کا تصور بھی کیسے آسکتا تھا؟ لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے کہ بادۂ رنگیں کے اثرات سے جو سرخی چہرے پر دوڑتی ہے، وہ خون کی تازگی اور صحت کی شگفتگی کی سرخی نہیں ہوتی بلکہ شفق کی سرخی ہوتی ہے جو غروبِ آفتاب کا نقاب رنگیں بن کر نگاہوں کو فریب دیتی ہے۔

وَ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَھُمۡ فَصَدَّھُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ وَ کَانُوۡا مُسۡتَبۡصِرِیۡنَ ۙ (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو!) شیطان نے اُن کی بداعمالیوں کو اُن کی نگاہوں میں خوشنما بنا رکھا تھا چنانچہ (اس کے نتیجہ میں) شیطان نے اُنہیں (صحیح راستہ (کی طرف آنے) سے روکے رکھا۔ (انہوں نے شیطان کی تعلیمات کی اندھا دھند تقلید کی اور اپنی عقل و بصیرت سے مطلق کام نہ لیا) حالانکہ وہ لوگ سمجھ بوجھ رکھنے والے اور حقائق کو دیکھنے والے تھے۔

وہ مستبصرین تھے

غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کس قدر جامع ہیں۔ شیطان حق و صداقت کی راہ روکے کھڑا تھا اور جس راستہ پر وہ چل رہے تھے اُسے اُس نے جذبات کی گلکاریوں سے ایسا فریبِ نظر بنا دیا تھا کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ان حسین و دلفریب پھول کی کیاریوں کے نیچے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے ہولناک غار ہیں، حالانکہ وہ مستبصرین تھے،

آنکھیں رکھتے تھے، صاحبِ دانش و بینش تھے۔ قرآن نے اس مقام پر عقل و بصیرت اور "شیطنت" کے تقابل سے نگاہ کا رُخ ایک عظیم حقیقت کی طرف پھیر دیا ہے۔ "شیطنت" کے معنی ہیں ان جذبات کی غلامی جو وحی کے تابع نہ چلیں۔ اگر انسان پر یہ جذبات غالب آ جائیں تو اس کی عقل اسے کبھی صحیح راستہ پر نہیں لا سکتی، بلکہ (جیسا کہ کتاب "ابلیس و آدم" باب 'وحی' میں بتفصیل بتایا جا چکا ہے) عقل تو ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے لئے اسباب و ذرائع بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بھی تراشتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ قومیں جو وحی کے غیر متبدّل اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتیں "مستبصرین" ہونے کے باوجود، بربادی کے جہنّم میں جا گرتی ہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے قومِ ہودؑ کے "مستبصرین" کے تبصرہ سے نگاہ کا رُخ پھیرا ہے۔ سورۃ احقاف میں انہی "مستبصرین" کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۧ (۴۶/۲۶)

اور ہم نے انہیں وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو ہم نے زمین میں تمہیں بھی نہیں بخشی اور انہیں (سننے کے لئے) کان، (دیکھنے کے لئے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لئے) دل (عقل و شعور) عطا کئے تھے مگر جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے ضد اور سرکشی کی روش اختیار کی تو اُن کے کان آنکھیں اور دل کچھ بھی کام نہ آ سکے اور (بالآخر) جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ان پر نازل ہو کر رہا۔

غور کیجئے۔ سمع و بصر و قلب، علم و عقل کے ذرائع سب موجود ہیں لیکن وحی کی روشنی سے مُنہ موڑنے کی وجہ سے وہی کیفیت ہو چکی ہے جو آج مستبصرینِ مغرب کی ہے جن کی دُوربینیں مریخ تک کے احوال و کیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں لیکن تباہی و بربادی کا جو سیلاب ان کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہوتا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا اور جب کوئی "دیدہ ور" ان سے کہتا ہے کہ ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے (اقبال ؒ)

تو یہ لوگ اُس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس روشنی کے زمانہ میں یہ "دقیانوسی خیالات" کا مبلغ کہاں سے آگیا؟
جب حضرت ہودؑ نے ان مکذبین سے کہا کہ:

اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۲۶/۱۳۵﴾

میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔

تو اس کا جواب کیا ملا؟

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَکُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ۙ﴿﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ۙ﴿﴾ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿﴾ (۲۶/۱۳۶-۱۳۸)

انہوں نے جواب دیا، اے ہودؑ! خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنے ہم پر سب برابر ہے (ہم تیری نصیحتوں سے کوئی اثر لینے والے نہیں)۔ یہ تو (ہمیشہ سے) دقیانوسی (خیالات کے) لوگوں کی عادت رہی ہے (کہ خواہ مخواہ لوگوں کو ڈراتے رہا کرتے ہیں)۔ ہمیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا۔

تنذیر وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انہیں ان کے اعمال کے عواقب و انجام سے آگاہ کرتے تھے لیکن وہ ہر بار یہی کہتے تھے کہ

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿﴾ (۷/۷۰، نیز ۴۶/۲۲)

اس کے جواب میں حضرت ہودؑ فرماتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ؏

حقیقت ہے! نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ (۷/۷۱)

ہودؑ نے کہا، یقین کرو، تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہو چکا ہے (تمہاری آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں کہ تمہیں اس کے آثار دکھائی نہیں دیتے)۔

وہ پوچھتے ہیں کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ ارشاد ہوتا کہ

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۫ۖ وَ اُبَلِّغُکُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰکِنِّیْۤ اَرٰىکُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿﴾ (۴۶/۲۳)

اس کا علم تو صرف خدا ہی کے پاس ہے کہ یہ کب وارد ہوگا۔ (میرا کام صرف یہ ہے کہ) جو ہدایت

دے کر مجھے بھیجا گیا ہے وہ تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتی رہتی ہے۔

اوچھے ہتھیار

جب مجادلہ و مباحثہ سے کام نہ چلا تو قوم اُن حربوں کو لے کر مقابلہ میں آگئی جو اربابِ قوت و استبداد کا آخری جواب ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغاماتِ الٰہیہ کا مبلغ اور حقیقت کا مبصر ہو، وہ بھلا اس تخویف و ترہیب سے کس طرح گھبرائے؟ حضرت ہودؑ نے فرمایا۔

...... فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ .... اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ (۱۱/۵۵ - ۵۷)

تم سب میرے خلاف مل کر جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو، ضرور کرو اور مجھے (ذرا بھی) مہلت نہ دو۔ (پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟) میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ کوئی حرکت کرنے والی شے نہیں کہ اس کے قبضہ سے باہر ہو۔ میرا پروردگار (حق و عدل کی) سیدھی راہ پر ہے (یعنی اُس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی)۔ پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور (مجھے تو نظر آ رہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دیدے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگرانِ حال ہے۔

ظہورِ نتائج کا وقت

حجت کا اتمام ہو گیا۔ قانونِ مکافات کے مطابق وہ وقت آ پہنچا جب اعمال کی کھیتی پک جاتی اور اس کے نتائج نمودار ہو جاتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ .... كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (۴۶/۲۵ - ۲۴)؛ (۴۱/۱۶ - ۱۵)۔

پھر جب انہوں نے (آنے والی تباہی کو) ایک بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کا رُخ کرتے ہوئے دیکھا تو (خوش ہو کر) کہنے لگے یہ تو ہم پر برسنے والا بادل ہے (ان کے اعمال کے نتائج نے جواب میں کہا " نہیں۔ یہ برسنے والا بادل نہیں!) بلکہ یہ وہی عذابِ الٰہی ہے جس کی تم جلدی کیا کرتے تھے۔ یہ تو آندھی ہے جس میں ایک بہت دردناک عذاب ہے جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر

چیز کو تباہ کر ڈالے گی۔" چنانچہ (دہی ہوا کہ) وہ ایسے (برباد ہو کر) رہ گئے کہ اُن کے مکانات (کے کھنڈروں) کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ (دیکھو) مجرم قوموں کو ہم اُن کے اعمال کا بدلہ اس طرح دیا کرتے ہیں۔

بربادی وہی بادِ تند و تیز (آندھی اور جھکڑ) جس سے ریت کے تودے بستیوں اور آبادیوں کو قبرستانوں میں منتقل کر دیتے ہیں! اسی کو دوسری جگہ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ کہا گیا ہے۔ (۵۱/۴۱)

آندھی کا یہ طوفان مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک جاری رہا (۶ ـ ۶۹/۷) اور اس طرح وہ قوم جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نشانات نصب کرتی، بڑے بڑے ستونوں پر عمارات اور اپنے سے بڑھ کر کسی کو طاقت ور نہ سمجھتی تھی، ایک آندھی (CYCLONE) کا مقابلہ نہ کر سکی اور ہلاک ہو گئی (۱۳۹ ـ ۲۶/۱۴۰)، اس طرح ہلاک کہ ان کی جڑ تک کٹ گئی۔

وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ (۷/۷۲)

اور جنہوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا تھا، ہم نے ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

وہ حال اور مستقبل دونوں میں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ ..... اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝ (۵۹ ـ ۱۱/۶۰)

یہ ہے سرگذشت عادؔ کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے قوانین (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائے اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے اور قیامت کے دن بھی۔ تو سُن رکھو کہ قومِ عادؔ نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور سُن رکھو کہ عاد کے لئے اپنی محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی قوم تھی!

یہ قوم دنیا سے نیست و نابود ہو گئی اور جس طرح حضرت ہودؑ نے انہیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا اُن کی جگہ دوسری قوم نے لے لی کہ مکافاتِ عمل کی رُو سے استبدال و استخلافِ قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اٹل قانون ہے۔ (۱۱/۵۷)

جماعتِ مومنین بچالی گئی

حضرت ہودؑ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دے دیا تھا (جس طرح حضرت نوحؑ کو طوفان کا پیشتر علم دے دیا گیا تھا) اور وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے تھے لیکن انہوں نے تو فیصلہ ہی یہ کر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہودؑ کہیں اُسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ و برباد ہو گئے اور حضرت ہودؑ اور ان کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے (۱۱/۵۸ نیز ۷/۷۲)۔ ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عادِ ثانیہ کہا گیا اور جو تباہ کر دی گئی اسے عادِ اولیٰ۔

وَ اَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَ اِۨ الْاُوْلٰى ۙ (۵۳/۵۰)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے جس نے عادِ اولیٰ کو ہلاک و برباد کر دیا۔

نگہِ بازگشت

قومِ عاد کے اس سانحۂ عبرت آموز پر نگۂ بازگشت ڈالیے اور دیکھئے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر اُبھر کر سطح پر نظر آ رہی ہیں۔ قوم، قوت و دولت اور حکومت و سلطنت کی مالک ہے اور اسے اللہ کا فضل و احسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر سرکشی و تمرّد پر اُتر آتی ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو! اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کر لو اور اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھاتا جائے گا (يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ)۔ وہ نہیں مانتی تو اس پر ایک رسواکن عذاب نازل کیا جاتا ہے لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى) اس سے صاف ظاہر ہے

محکومی و رسوائی خدا کا عذاب ہے

کہ قوانینِ خداوندی کے ماتحت عزت و شوکت، حکومت و سطوت، قوت و ثروت اللہ کے انعامات ہیں اور ذلت و رسوائی کی زندگی عذابِ خداوندی ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قوم نوح کا جانشین بنایا گیا تھا (۷/۶۹) اور جب اُس نے پیغاماتِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو، اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا (۱۱/۵۷)۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت و حشمت کی وارث کوئی دوسری قوم بنا دی جائے۔

سعد و نحس قرآنِ کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ دن بڑا "منحوس" تھا جب اُن پر اللہ کا عذاب طاری ہوا.
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ........
وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ (۴۱/۱۶)؛ (۵۴/۱۹)۔

پھر ہم نے دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی کا عذاب چکھانے کے لئے چند منحوس دنوں میں اُن پر ایک سخت آندھی بھیجدی اور (یہ تو کچھ بھی نہیں ہے) بلا شبہ آخرت کا عذاب زیادہ رُسوا کُن ہوگا اور وہ (وہاں کسی قسم کی) امداد نہیں کئے جائیں گے۔

اس کو قرآنِ کریم نے ایک بڑا دن (عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ) بھی کہا ہے (۴۶/۲۱؛ ۲۶/۱۳۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ سعد و نحس کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے بُرے اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے تو وہ گھڑی اس کے لئے نحس ہے۔ لہٰذا سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے ستاروں کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ سو جو خود محکوم و مسخر ہو وہ دوسرے کے مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہ ہے اس قومِ عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو، ان کے اُجڑے ہوئے مساکن میں تمہارے لئے کون کون سے سامانِ بصیرت مدفون ہیں۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ قف (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو، پھر ایسا ہوا کہ تمہارے پروردگار نے) عاد اور ثمود کو ہلاک کیا اور یہ بات (یعنی ان کی تباہی) تمہارے لئے ان کی آبادیوں سے ظاہر ہو گئی ہے۔

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اُٹھ بیٹھے۔ جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے اس کے لئے ان ویرانوں کی ٹھیکریاں عروج و زوالِ اُمم کی ہزاروں خاموش داستانیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴/۳۲) کیا کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے!

لُقمان (حکیم)

حضرت ہودؑ کے بعد ترتیب کے لحاظ سے، حضرت صالحؑ (قوم ثمود) کا تذکرہ آنا چاہیئے لیکن قرآن کریم نے ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ بالتصریح حضرات انبیائے کرامؑ کے زمرہ میں شامل نہیں لیکن اس کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ہودؑ مع اپنے متبعین کے، اپنی برباد ہونے والی قوم کے دیار و مساکن سے نکل کر حجاز کی جانب آ گئے تھے اور اسی علاقہ میں ان کی نسل (عادِ ثانیہ) بڑھی اور پھیلی۔ ان میں ایک نیک سیرت حکمران گذرا ہے جسے **لقمان** کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران حضرت ہودؑ کی شریعت کا متبع تھا اور اپنی حکمت و دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا[1]۔ ایک قدیمی کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔

یہی لقمانؑ ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے خصوصیت سے کیا ہے۔ اس ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب انسانی عقل و بصیرت، وحی کی روشنی میں، فیصلے کرتی ہے تو وہ فیصلے کس قدر صاف، واضح اور انسان کو سلامتی کے راستوں پر لے جانے والے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا نظام ہی یہ ہے کہ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنے معاملات کے فیصلے عقل و فکر کی رُو سے کئے جائیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عقل و وحی، علم و عشق، ذکر و فکر، خبر و نظر، خرد و جنوں کا یہی وہ حسین امتزاج ہے، جو اسلام کا طرّۂ امتیاز ہے۔ قرآن نے اسی مقصد کے پیشِ نظر **لقمان** کی حکمت آموز باتوں کا ذکر کیا ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۳۱/۱۲)۔

اور ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا فرمائی تھی اور کہا تھا کہ وہ اس حکمت کی روشنی میں مصروف

[1] مزید تصریحات "خلاصۂ مبحث" میں دیکھئے۔

عمل رہے تاکہ اس کی ساعی بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔ یاد رکھو! جو اس طرح کوشش کرتا ہے
اس کی کوشش کے نتائج خود اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں، ورنہ اللہ ان باتوں سے
بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے حضرات انبیائے کرامؑ کے ضمن میں بھی فرمایا ہے کہ انھیں "کتاب و حکمت" عطا کی گئی تھی اور حکمت بھی اسی طرح منزل من اللہ تھی جس طرح کتاب۔ وہاں کتاب سے ضابطۂ خداوندی مرتب ہوتا ہے اور حکمت سے ان قوانین کی غایت و مقصود۔ یہاں کہا گیا ہے کہ لقمان کو حکمت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اس حکمت سے مراد انسانی فراست نہیں، بلکہ وحیٔ الٰہی ہے۔ لیکن چونکہ قرآن میں کسی جگہ لقمان کا نام انبیاءؑ کے زمرہ میں نہیں آیا اس لئے خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد انسانی فراست ہی ہے، وہ وحی نہیں جو انبیاء سے مخصوص ہوتی تھی۔

اس سے آگے ہے:۔

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳۱/۱۳)۔

اور (یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ برخوردار! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔

شرک ظلم عظیم ہے شرک کو ظلم عظیم کہہ کر ایک عظیم حقیقت کو دو لفظوں میں سمو دیا گیا ہے۔ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس جگہ رکھنا جہاں اسے ہونا نہیں چاہیئے۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اب اس سے بڑھ کر بے محل بات اور کونسی ہو سکتی ہے کہ انسان مخلوق کو خود خالق کا مقام دے دے (تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ اس کے بعد اس علام الغیوب کے متعلق فرمایا۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ (۳۱/۱۶)

(اور دیکھو، لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا (یاد رکھو) بلاشبہ اعمال (کسی کے بھی ہوں) اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ہوں۔ پھر وہ کسی پتھر کی چٹان میں (رکھ دیئے گئے) ہوں یا آسمانوں کے اندر یا زمین کے اندر ہوں، خدا ان کے نتائج کو ضرور مرتب کردے گا۔ بلاشبہ خدا بڑا باریک بین اور خبردار ہے۔

دیکھئے! اس مخلوق اور خالق کا فرق کیسا نمایاں طور پر سامنے آگیا؟ اس قسم کا علم سوائے لطیف و خبیر کے اور کسے ہو سکتا ہے؟ پھر احکامات کی طرف توجہ دلائی کہ

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۳۱/۱۷)

پھر کہا، اے میرے بیٹے! صلوٰۃ کو قائم رکھنا اور معروف کا (لوگوں کو) حکم دینا اور منکر سے روکنا اور جو کچھ (مشکل یا مصیبت) تمہیں پیش آئے اس پر ثابت قدم رہنا۔ بلاشبہ یہ باتیں بہت ہی اہم باتیں ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی میں انفرادی اور اجتماعی نشوونما کی دونوں صورتیں سامنے آگئیں۔ ایک خداشناس کے لئے اس سے بڑا جوہر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خود اللہ کے قوانین کے سامنے جھکے اور ملک میں قوانینِ الٰہیہ کی ترویج کرے؟ اسی کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور جب کوئی مصیبت آجائے تو اس وقت پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے۔ بلکہ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت کے بھروسے پر مردانہ وار اس کا مقابلہ کرے کہ یہ فی الواقع بڑی بات ہے۔

اس کے بعد معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝

(۱۸ — ۱۹/۳۱)

اور کہا لوگوں سے (مغرورانہ طریقہ پر) منہ نہ موڑنا اور نہ ہی زمین پر اکڑ کر چلنا۔ بلاشبہ خدا کسی مغرور اور متکبر کو پسند نہیں فرماتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اعتدال قائم) رکھنا اور آواز کو (بھی

نرم اور پست رکھنا۔ بلاشبہ آوازوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت آواز گدھے کی آواز ہے
(جو بہت اونچی اور بہت سخت ہوتی ہے۔ آواز کی اس بلندی اور سختی سے بچنا چاہیئے۔)
غور فرمایئے، ایک شاہزادہ کو کس طرح حسنِ اخلاق اور فروتنی کی نصیحت کی جارہی ہے؟
متذکرہ صدر نصائح پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چند ٹکڑوں میں تطہیرِ فکر و نظر، منصبِ حکومت اور اصلاحِ معاشرہ کے مختلف گوشوں کو کس طرح جامع طور پر یکجا کر دیا گیا ہے؟ جنابِ لقمان کا ذکر چونکہ سلسلۂ انبیائے عظام میں نہیں کیا گیا اس لئے ہم انہیں رسول قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن اس تعلیم کے متعلق واضح ہے کہ شمعِ نبوت سے اکتسابِ ضیا کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ھودؑ کی تعلیم اُس وقت تک ہنوز اپنی اصلی شکل میں موجود تھی اور جب اس تعلیم کو قرآن کریم کی بھی سند مل جائے تو اس کی صحت و عظمت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔
یہ ہیں وہ لُقمان جو آج حکمت و دانائی اور دانش و بینش میں زبانِ زدِ خلائق ہیں۔ جب کسی کے پاس آسمانی قندیل ہو تو اس کے نورِ بصیرت کی کرنیں کیوں نہ دنیا بھر میں پھیل جائیں؟ ؎

گرچہ خوردیم نسبت ایست بزرگ
ذرّۂ آفتاب ساما نیم

خلاصۂ مبحث

قومِ نوحؑ کی بربادی کے بعد بنی سام کی پہلی ترقی، قومِ عاد سے ہوئی جن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا۔ اس قوم کو قوت و حشمت اور دولت و ثروت کی فراوانی عطا ہوئی تھی۔ انہی کو عادِ آرم یا ذات العماد بھی کہتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کے اوپر بڑے مشیّد قلعے اور اونچے اونچے نشانات تعمیر کرتے تھے۔ دولت و حشمت کے ساتھ انہیں دانش و بینش بھی عطا ہوئی تھی لیکن چونکہ یہ چیزیں ضابطۂ خداوندی کے تابع نہ تھیں اس لئے ان کے نتائج امن و اصلاح کے بجائے ظلم و فساد کی صورت میں سامنے آتے تھے۔ ان کے نظامِ زندگی کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ان کی طرف حضرت ھودؑ مبعوث ہوئے، انہوں نے آکر وہی انقلاب انگیز دعوت پیش کی جو وحیٔ آسمانی کا مقصدِ اوّلیں ہوتی ہے، یعنی سرکش و متکبّر طاغوتی نمائندوں کے ہاتھوں سے قوت و اقتدار اور رزق کے سرچشمے چھین کر خدا کے نظامِ ربوبیّت کے تابع لے آنا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک طرف سردارانِ قوم کے

غلبہ واستیلاء پر زد پڑتی تھی اور دوسری طرف دنیائے مذہب کے اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللہ کی تقدس و عقیدت کی مسندیں چھنتی تھیں. اس لئے ان دونوں کی طرف سے مخالفت یقینی تھی. ارباب حکومت نے تمسخر واستہزاء اور ترہیب و تخویف سے کام لیا اور مذہب کے خودساختہ علمبرداروں نے یہ کہہ کر عوام کو مشتعل کیا کہ دیکھو! یہ نئی تعلیم تمہارے آباء واجداد کے مسلک کے خلاف ہے اور اس داعیٔ انقلاب کا مسلک یہ ہے کہ تمہیں تمہارے اسلاف کی روش سے بیگانہ بنا دے. جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ لوگ علم و عقل بھی رکھتے تھے لیکن جب علم و عقل جذبات کے تابع آجائیں تو نہ وہ علم، علم رہتا ہے اور نہ وہ عقل، عقل بلکہ اس وقت ان دونوں کا فریضہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ جذباتی مقاصد کے بروئے کار لانے کے ذرائع بن جائیں چنانچہ یہی اس قوم کے ساتھ ہوا. انہوں نے عقل و ہوش سے سوچا ہی نہیں کہ ہمیں ہلاکت و بربادی کے کیسے عمیق و مہیب جہنم سے بچا کر امن و عافیت کی جنت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے. انہوں نے مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی. حضرت ہودؑ نے امکان بھر کوشش کی کہ وہ اپنے نظامِ حیات کو نظامِ خداوندی کے صحیح خطوط پر لے آئیں. لیکن چونکہ اس سے ان کی ہوسِ خون آشامی کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے انہوں نے اس دعوت کی طرف کان ہی نہ دھرا. چنانچہ ان کے جرائم سنگین سے سنگین تر ہوتے گئے اور جب قانونِ مکافات نے اندازہ کر لیا کہ ان کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے اور اس کا زہر جسدِ انسانیت کے صالح حصہ کے لئے بھی ہلاکت آفریں بنتا جا رہا ہے تو اس اٹل قانون کے مطابق یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اس زہر آلود حصہ کو کاٹ کر الگ پھینک دینا ہی ضروری ہے چنانچہ ان پر تباہی کا عذاب آیا اور آندھی کے ایک قیامت خیز طوفان نے ان بستیوں کو مدفن بنا دیا اور اس کے بعد دنیا میں صرف ان کے افسانے باقی رہ گئے.

طبیعی حوادث کا اقوام کی تباہی سے کیا تعلق ہے، اس کے متعلق حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں لکھا جا چکا ہے.

قومِ عادؑ کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک مردِ دانشمند و نیک سیرت (لقمان) کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً حضرت ہودؑ کی شریعت کے متبع تھے. انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو نصیحتیں کی ہیں، چونکہ وہ ابدی حقائق پر مبنی ہیں، اس لئے قرآن کریم نے انہیں اپنے دامنِ حفاظت میں جگہ دے کر بقائے دوام عطا کر دی ہے. لقمان (حکیم) کی تاریخی حیثیت ابھی تک تیقن کے ساتھ متعین نہیں ہو سکی. (آنے والے زمانہ کے انکشافات اس فریضہ کو بھی ادا کر دیں گے) ہم نے اُن کا جو زمانہ متعین کیا ہے وہ قیاسی ہے اور بعض ایسی روایات پر مبنی، جو دوسری

روایات سے زیادہ قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بھانجے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ حضرت داودؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور ایک ہزار سال تک زندہ رہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک حبشی غلام تھے۔ مستشرقین بھی اس باب میں کوئی یقینی رائے نہیں رکھتے۔ سیل کا خیال ہے کہ یہ، یونانی ایساپ (AESOP) سے الگ کوئی اور شخصیت نہیں۔ DR. SPRANGER کا خیال ہے کہ یہ ایوبؑ کے الکسائی ALKAI ہی کا دوسرا نام ہے۔ HITTI اپنی تاریخِ عرب میں اسی خیال کا حامل نظر آتا ہے۔ تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال ۱/۳۰) اور لموایل بادشاہ (امثال ۱/۳۱) کی حکمت کی باتیں، عرب کے لقمان کی نصائح سے ملتی جلتی ہیں۔ اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسمٰعیل میں سے ہونا چاہیئے۔ غرضیکہ کثرتِ تعبیر سے یہ خواب ابھی تک پریشان ہے۔ اور جیساکہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اس کا حل آنے والے زمانہ کے انکشافات کا منتظر۔ قرآن کریم، تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس لئے اس نے لقمان کی تذکیر و موعظت سے بحث کی ہے، حسب ونسب اور مقام و زمان سے نہیں اور یہیں تک ہمیں بھی اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہیئے۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا
(۲۷/۵۲)

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

حضرت صالح علیہ السّلام

قومِ ثمود

اُمَمِ سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقّی کا زمانہ عادِ اُولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصّہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ حِجران کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادیٔ قریٰ کے گرد و پیش کا میدان بڑا سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز۔ قرآنِ کریم نے اس قوم کو عاد کا جانشین بتایا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (۷/۷۴)

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ خدا نے تمہیں قومِ عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو۔ پس اللہ کی قدرتوں کو یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی

نہ پھیلاؤ۔
حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے پیشتر ان کی تباہی ہو چکی تھی کیونکہ دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بدکرداریوں سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو قومِ نوح و عاد و ثمود کا ہوا تھا (۴۰/۳۲-۳۰)
اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق م سے لے کر ۱۶۰۰ ق م تک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنی نوازشات کی گہرباری فرما رکھی تھی۔ انہیں متمکّن فی الارض کیا تھا (۷/۷۴)۔ قومِ عاد کی طرح یہ لوگ بھی میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے جو فنِ سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷/۷۴؛ ۱۵/۸۲)۔ پُر فضا باغات، لہلہاتی کھیتیاں، صاف و شفاف اُبلتے ہوئے چشمے (۲۶/۱۴۹-۱۴۷)۔

دولت و سطوت

وادیٔ قریٰ میں سنگین عمارات۔

وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۙ (۸۹/۹)

اور (کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے پروردگار نے) قوم ثمود کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ (کون سی قوم ثمود) وہی جنہوں نے پہاڑوں کے دامنوں میں بڑی بڑی چٹانوں کو تراشا اور مکانات بلکہ قلعے بنائے تھے)۔

قومی اکثریت اور جنود و عساکر۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ؕ (۸۵/۱۸-۱۷)

(اور اے پیغمبرِ اسلامؐ تمہیں لشکروں (جنود و عساکر) کی خبر بھی پہنچی (یا نہیں؟ کونسے جنود و عساکر؟) فرعون اور قومِ ثمود کے جنود و عساکر کی!

یہ تھی وہ قوم جن کی طرف خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی دولت و حشمت، حکومت و قوت کے نشے میں قوانینِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ (۱۵/۸۰)

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسول کی بات جھٹلائی۔

یہاں ان کے دارالحکومت کی نسبت سے اصحٰب الحجر کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ان کا نام مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ۚ (۲۶/۱۴۱)

اور (دیکھو) قومِ ثمود نے رسولوں کی بات جھٹلائی۔

سورۂ قمر میں ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ (۵۴/۲۳)

(اور دیکھو) قومِ ثمود نے (انکار و بدعملی کے بدنتائج سے ڈرانے والوں کی بات جھٹلائی۔

بعثت حضرت صالحؑ

تا آنکہ جب ان کی سرکشی و عدوان حد سے بڑھ گئی اور قانونِ مشیت کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو ان کی طرف، اسی قبیلہ سے حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ (۷/۷۳، نیز ۱۱/۶۱؛ ۲۶/۱۴۲؛ ۲۷/۴۵)

اور (دیکھو) ہم نے قومِ ثمود کی طرف انہی کے بھائی بندصالح کو مبعوث کیا۔

اس وقت ہر جابر و مستبد قوم کی طرح اس قوم کی بھی یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ ملک میں فسادؔ برپا کرتے تھے اس لئے ان سے کہا گیا کہ

وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (۷/۷۴)

اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ۔

مفسدین کی قوم

اربابِ حکومت و اقتدار بلے حد سرکش و مفسد تھے۔

لہ فساد برپا کرنے سے ہمارا ذہن ڈاکہ زنی، قزاقی، بدامنی وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لیکن فساد کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ نظام جو غیرخداوندی قوانین پر مشتمل ہو، فساد ہے۔ (خواہ اس میں بظاہر کیسا ہی امن کیوں نہ ہو) اور اس کے مقابلہ میں اصلاح صرف اسی نظام کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی پر قائم ہو۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے فساد اور مفسد کی قرآنی اصطلاحات کے صحیح معنی سمجھ میں آسکیں گے۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر ملے گی)۔

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۙ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ ○ (۱۵۱-۱۵۲/۲۶)

اور (دیکھو، صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے قوم ثمود!) حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین پر فساد برپا کرتے رہتے ہیں اور (کبھی) اصلاحِ احوال (کا ارادہ بھی) نہیں کرتے۔

جب رزق کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی تو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کو فَسَادٌ فِي الْأَرْضِ کہا جاتا ہے، یعنی انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں۔ جب یہ ناہمواریاں (قوانینِ خداوندی کے مطابق) ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں تو اسے اصلاح کہا جاتا ہے۔ قومِ ثمود کے معاشرہ میں اسی قسم کی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دار الحکومت میں نوؔ وزراء تھے جن کے سپرد علاقہ کا انتظام تھا اور چونکہ پورے کا پورا نظامِ حکومت بگڑ چکا تھا اس لئے یہ سب کے سب مفسد و مستبد تھے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ ○ (۴۸/۲۷)

اور شہر میں نوؔ آدمی (سربرآوردہ اور ذمہ دار) تھے جو (ہمیشہ) ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور اصلاحِ حال (کی تو طرف توجہ ہی) نہیں کرتے تھے۔

ان کا سرغنہ ان سب سے بڑھ کر شقی و بدبخت تھا۔

إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ۖ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ .... (۱۲-۱۳/۹۲)

(اور یاد کرو) جب اُس (قوم) کا بدبخت ترین شخص اُٹھا، تو اللہ کے رسول (صالح) نے ان لوگوں سے کہا......

ان حالات کے ماتحت بھلا احکامِ الٰہیہ کی طرف کون توجہ دیتا؟

وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۙ (۸۱/۱۵)

اور (دیکھو) ہم نے انہیں اپنے قوانین عطا کئے (مگر انہوں نے اُن سے کوئی نفع نہ اُٹھایا)۔ چنانچہ وہ اُن سے روگردانی کرنے والے ہی رہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک نکتہ پر غور کیجئے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس قوم میں فساد عام ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ان کے مرکزی مقام (دارالحکومت) میں نو سربرآوردہ ایسے تھے جو درحقیقت اس فساد کے سرچشمہ تھے۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قوموں میں فساد کا ذمہ دار دراصل اوپر کا طبقہ ہی ہوتا ہے۔ عوام تو ان کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ جس قسم

اوپر کا طبقہ

کا اوپر کا طبقہ اسی قسم کے عوام۔ اگر اُوپر کے طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو قوم خود بخود اصلاح یافتہ ہو جاتی ہے۔

وہی دعوتِ انقلاب

یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت صالحؑ کی بعثت ہوئی۔ آپ تشریف لائے اور قوم کو اسی اساسی اور اصولی پیغامِ خداوندی کی طرف دعوت دی جو آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی اولین کڑی ہے۔ فرمایا :۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۷۳، نیز ۲۷/۴۵؛ ۱۱/۶۱)

اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (حاکم اور آقا) نہیں۔

حکومت صرف ایک خدا کی، کسی انسان کی نہیں اور اس حکومت کی عملی تشکیل اس طرح کہ دلوں میں تقویٰ اور مرکز کی اطاعت۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۚ (۲۶/۱۴۲-۱۴۴)

اُن سے اُن کے بھائی بند صالح نے کہا کہ "کیا تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت نہیں رکھتے؟ یاد رکھو! میں تمہارے لئے خدا کا ایک امانت دار پیغامبر ہوں۔ خدا کے نظام کی حفاظت میں آجاؤ اور (کیونکہ میں اس نظام کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہوں) میری اطاعت (اور فرمانبرداری) کرو۔

یعنی مفسدین کی حکومت کی اطاعت مت کرو، بلکہ اطاعت فقط حکومتِ الٰہیہ کی کرو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۚ وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ

يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (۲۶/۱۵۲-۱۵۰)

پس قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری (بحیثیتِ مرکز) اطاعت کرو اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو، جو (صرف یہی جانتے ہیں کہ) ملک میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں اور (کبھی) اصلاحِ حال (کا ارادہ تک) نہیں کرتے۔

کتنا بڑا اعلانِ بغاوت اور کیسا نعرۂ انقلاب ہے! حقیقت یہ ہے کہ علمبردارانِ حکومتِ خداوندی دنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ دوسرے انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک کی حکومت کی جگہ کسی دوسرے کی حکومت قائم کردی جائے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حکومت و اقتدار کی کنجیاں انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر اقتدار و اختیار کے حقیقی مالک، خدائے ارض و سمٰوٰت کے سپرد کردی جائیں۔ اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے جس میں کسی انسان کو کسی شکل میں، کسی دوسرے انسان پر حکومت کا حق ہی حاصل نہ ہو اور رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ سب انسان برابر اور ایک خدا کے قانون کے محکوم جو ربّ العٰلمین ہے جس کی حکومت میں ظلم و استبداد، سلب و نہب اور غصبِ حقوق کا امکان ہی نہیں، یہ تھی وہ حکومت جو حضرت صالحؑ قائم کرنا چاہتے تھے! وہ اربابِ قوت و سلطنت جن کے چہرے کی سرخیاں اور حریمِ ناز کی رنگینیاں انسانی خون کی رہینِ منت تھیں کس طرح اپنے اقتدار و اختیار سے دست کش ہو کر مخلوقِ خدا کے خدام کی صف میں کھڑے ہو جاتے؟ لہٰذا وہی ہوا جو ہوتا چلا آیا ہے اور جو ہوتا چلا جائے گا۔ کمزور و ناتواں اور مظلوم و مقہور انسانوں نے جو انسانی چیرہ دستیوں سے تنگ آ چکے تھے اس دعوتِ ربّانی پر آگے بڑھ کر لبیک کہا اور اربابِ دولت و قوت اس کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے!

اربابِ قوت کی طرف سے مخالفت

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا .... اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۷/۷۶-۷۵)

قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا) گھمنڈ تھا انہوں نے مومنوں سے کہا، یعنی ان لوگوں سے جنہیں ان کی چیرہ دستیوں نے سخت کمزور کر رکھا تھا کہ کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالحؑ خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ (یعنی ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں دکھائی

نہیں دیتی) انہوں نے کہا ہاں، بے شک۔ جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اُس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اس پر ان سرکش و متمرد سرداروں نے کہا، تمہیں جس بات کا یقین ہے، ہمیں اس سے انکار ہے۔

وہ آمادۂ پیکار تھے۔ لیکن حضرت صالحؑ ایک ناصحِ مشفق کی طرح انہیں برابر سمجھاتے چلے جاتے تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبریں نہ کھودو۔ لیکن نشۂ حکومت میں ان نصائح کو سنتا کون ہے؟

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ؕ...... بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ۝ (۴۶-۴۷/۲۷)

صالحؑ نے کہا کہ اے میری قوم! تم بھلائی (کامیابی و کامرانی) سے پہلے (اُس کے بجائے)، برائی (ہلاکت و تباہی) کو کیوں جلدی مانگ رہے ہو؟ تم اللہ کے قوانین کی حفاظت میں کیوں نہیں آجاتے تاکہ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچ جائے۔ (اور دونوں جہان کی کامیابیاں تمہارے قدم چومیں)، وہ (کم بخت) بولے کہ ہم تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں (ایمان لانے والوں) کو (اپنے لئے) منحوس سمجھتے ہیں (کہ تم نے خواہ مخواہ ہماری عیش و عشرت میں کھنڈت ڈال دی) اس پر صالحؑ نے (جواب میں) کہا کہ تمہاری یہ نحوست خدا کے قانونِ مکافات کی وجہ سے ہے۔ تم وہ لوگ ہو جو (بہت جلد) عذابِ الٰہی میں مبتلا کئے جاؤ گے!

وہی دیوانگی کی تہمت

یہ نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور وہ (معاذ اللہ) اُن کا مذاق اڑاتے۔ وہ کہتے کہ (ظالم بدہن) تم پر کسی نے جادُو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ (۲۶/۱۵۳)

انہوں نے کہا کہ (اے صالح!) اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے!

انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ ایک ہمارے جیسا انسان دعوائے رسالت میں سچا کیسے ہو سکتا ہے؟

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۱۵۴)

انہوں نے کہا کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو (پھر تم رسول

کیسے ہو گئے؟) پس اگر تم سچے ہو تو (اپنے اس دعوے پر) کوئی نشانی (معجزہ) لاؤ!

ایک انسان رسول یعنی اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم اُمم سابقہ کے احوال و کیفیات میں دیکھ چکے ہیں، یعنی ان سے کہا جاتا تھا کہ میں جس نظام کی طرف دعوت دیتا ہوں اسے عقل اور فکر کے معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ اس میں بھلائیاں ہی بھلائیاں نظر آتی ہیں یا نہیں اور وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہم بھلا اپنے جیسے انسان کو خدا کا رسول کیسے مان لیں۔ اگر تم خدا کے رسول ہو تو ہمیں کوئی محیّر العقول بات کر کے دکھاؤ۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۵۴/۲۴﴾

تو انہوں نے کہا، کیا ہم ایسے آدمی کا اتباع کریں گے جو ہم ہی میں سے ہے اور اکیلا ہے، پھر تو ہم ایک (بڑی) گمراہی اور پاگل پن میں مبتلا ہوں گے۔

بشر کے ساتھ واحد کے ٹکڑے پر بھی غور کیجئے۔ چونکہ وہ نشۂ قوت میں بدمست تھے اس لئے یہ کہتے تھے کہ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا جس کے ساتھ کوئی بہت بڑی جماعت ہوتی تو اس جماعت کی قوت سے ڈر کر ہم اس کی بات مان بھی لیتے۔ لیکن اب ہم اس کی بات کیوں مانیں جب یہ بالکل اکیلا ہے، اور پھر جیسا کہ

ہٹ سفا شریر النفس لوگوں کی افتاد ہے، وہ اصول سے ہٹ کر ذاتیات پر اُتر آتے ہیں اور حق و صداقت کی دعوت کا جواب گالیوں سے دیتے ہیں۔ قومِ ثمود نے بھی یہی کیا۔ کہنے لگے۔

ءَاُلْقِیَ الذِّکْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ هُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۵۴/۲۵﴾

(اور دیکھو! انہوں نے کہا) کیا ہم سب لوگوں کے درمیان سے (خدا کو ایک یہی ملا تھا کہ) اس پر وحی نازل کی گئی (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بڑا ہی جھوٹا اور بہت ہی شیخی باز ہے۔

اُدھر سے یہ دریدہ دہنی اور اِدھر سے فقط جواب اتنا کہ

سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْکَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۵۴/۲۶﴾

کل (یعنی مکافاتِ عمل کے دن) وہ بہت جلد جان لیں گے کہ جھوٹا اور شیخی باز کون تھا۔

وُہی اسلاف پرستی یہ اربابِ قوت و ثروت کا رویہ تھا۔ ان کے ساتھ مذہبی پیشوا آگے بڑھے اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا کہ یہ شخص تمہیں تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ (۱۱/۶۲)

لوگوں نے کہا" اے صالح! پہلے تو تُو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں[1] تجھ سے وابستہ تھیں۔ (مگر یہ ایک دم تجھے کیا ہوگیا) کیا (اب) تو ہمیں اس سے بھی روکتا ہے کہ ہم ان کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کریں جن کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) ہمارے باپ دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اُترتی ہی نہیں۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہی جو کورانہ تقلید کے مسلک کا صحیح جواب ہو سکتا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ (۱۱/۶۳)

صالح نے کہا! اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت (نبوت) مجھے عطا فرمائی ہو تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں؟ تم (اپنی بات منوا کر) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے، تباہی کی طرف لے جانا چاہتے ہو۔

یعنی تم اپنے مسلک کی صحت کے ثبوت میں فقط یہ دلیل رکھتے ہو کہ یہ تمہارے آبا و اجداد سے متوارث چلا

---

[1] یہاں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ یہ اقوام اپنے انبیائے کرامؑ کے متعلق بصد حسرت و یاس یہ کہتی ہیں کہ تم سے تو ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا؟ اس سے واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ اپنے دعوئے نبوت سے پیشتر اپنی اقوام میں ممتاز شخصیت کے مالک ہوتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ امتیاز ان کے کیرکٹر اور قابلیت کی بنا پر تھی۔ اس لئے پیغاماتِ الٰہیہ کے حاملین شروع ہی سے بلند سیرت و کردار کے مالک ہوتے تھے۔

آرہا ہے اور میرے پاس میرے اللہ کی عطا فرمودہ وہ قندیلِ فروزاں ہے جس کی روشنی میں حق و باطل الگ الگ دکھائی دیتے ہیں. پھر کہیے کہ میں ایسی شمع نورانی کو چھوڑ کر اندھوں کی لاٹھی کے پیچھے کس طرح چل پڑوں؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ایک پیغمبر بھی اپنے آپ کو قوانینِ الٰہیہ کی معصیت کے انجام سے محفوظ خیال نہیں کرتا! اور قانونِ مکافات کا تقاضا بھی یہی ہے. یہ ہے وہ ایمان جس پر نظامِ خداوندی کی ثریا بوس عمارت مستحکم ہوتی ہے، یعنی اس نظام میں سب سے برگزیدہ و بلند ترین ہستی بھی اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کا مطیع و فرمانبردار سمجھتی اور اس کی خلاف ورزی سے خوف کھاتی ہے.

خفیہ سازشیں اِدھر سے تذکیر و موعظت اور اُدھر سے تکذیب و تہدید ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی خفیہ سازشیں بھی، کہ اربابِ قوت و استبداد کے یہی حربے ہیں جو حق و صداقت کا گلا گھونٹنے کے لئے ہمیشہ استعمال کئے جاتے ہیں.

وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ○ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○

(۴۸ – ۲۷/۴۹)

اور (دیکھو) شہر میں نو آدمی تھے جو (ہمیشہ) ملک میں فساد برپا کرتے رہتے تھے اور (کبھی) اصلاح (کا خیال) نہیں کرتے تھے. انہوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسمیں کھاؤ کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھر والوں پر یکبارگی حملہ (کر کے انہیں قتل کر دیں گے اور) پھر (جب پوچھ گچھ ہوگی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موجود نہیں تھے (نہ ہمیں اس بارے میں کوئی خبر ہے) اور ہم (اپنے اس بیان میں بالکل) سچے ہیں!

ایک اہم نکتہ اس مقام پر ذرا رُکئے اور ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے. یہاں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ "تم اللہ کی قسم اٹھاؤ." اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے تھے. اس سے ظاہر ہے کہ دین جب بگڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو

اس میں خدا پر ایمان تو ہوتا ہے لیکن اس خدا کا تصور وہ نہیں رہتا جو وحی نے عطا کیا تھا۔ اُن لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کے مدّعی تھے، لیکن رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لئے ہوئے تھے۔ حضرت صالحؑ انہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے تو اس سے مراد یہ تھی کہ اُن کا اپنے تصور کے مطابق خدا پر ایمان، ایمان نہیں تھا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ تھے کہ حکومت صرف اس کے قوانین کی کی جائے اور رزق کے سرچشموں کا مالک بھی اس کو سمجھا جائے۔ یہ ہے فرق "مذہب" میں خدا پر ایمان اور "دین" میں خدا پر ایمان میں! (تفصیل اس کی "اسلام کیا ہے" میں ملے گی)۔

اب آگے بڑھئے۔ اس قوم کے مفسدین خفیہ سازش کر رہے تھے کہ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو چپکے سے قتل کر دیا جائے۔ ان خفیہ تدابیر کا جواب لوحِ مکافات کی پیشانی پر ایک ہلکی سی ہنسی کے آثار کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ حضرت صالحؑ نے انہیں بار بار آگاہ کیا لیکن انہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ حتّٰی کہ ان لوگوں نے، جو آنکھیں بند کئے ہلاکت و بربادی کے جہنّم کی طرف بڑھے جا رہے تھے، علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ جاؤ اس عذاب کو لے آؤ جس کی یوں دھمکی دیتے چلے آ رہے ہو!

وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝ (۷/۷۷)

انہوں نے کہا" اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا۔

ناقۂ صالحؑ

انسان بھی کس قدر خود شکن واقع ہوا ہے! اپنی ہلاکت کو بُلا بُلا کر گھر دکھاتا ہے۔ ان کی پاداشِ عمل کا وقت آ پہنچا تھا۔ مہلت کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ لیکن آخری حجّت کے طور پر حضرت صالحؑ نے کہا کہ دیکھو یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ تم کلامِ خداوندی کا احترام کرنا چاہتے ہو، ایک محسوس چیز تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں کھول کر بات نہیں بتائی گئی۔

حضرت صالحؑ نے جس محسوس شے کو بطور فیصلہ پیش کیا اس تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ مابہ النّزاع بات کیا تھی۔ اُس زمانہ میں مویشی اور چراگاہیں، چشمے اور کھیت، سب سے بڑی دولت ہوتے تھے۔ ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص

کر لیتے تھے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے تھے۔ حضرت صالحؑ کا پیغام یہ تھا کہ یہ چشمے اور چراگاہیں ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مُفت ملے ہیں[1] اس لئے انہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ بالآخر انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ہم سب کے جانوروں کو یکساں طور پر چراگاہوں میں چرنے اور چشموں سے پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ نہ کسی پر زیادتی ہو نہ کسی کے حقوق میں کمی۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے کہا کہ اس بات کا عملی ثبوت (کہ تم اس معاہدہ کا احترام کرتے ہو یا نہیں) یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اُسے آزاد چرنے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تمہارے قلوب، قانونِ خداوندی کے احترام کی طرف مائل ہیں۔ اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو وہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روش پر قائم ہو۔ فرمایا۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۷/۷۳، نیز ۱۱/۶۴)

یہ "خدا کی اونٹنی" تمہارے لئے ایک (فیصلہ کُن) نشانی ہے۔ پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے۔ اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ ورنہ عذابِ جانکاہ تمہیں آپکڑے گا۔

اِس ناقہ کے لئے پانی پینے کی باری ٹھہرا دی۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ۚ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۲۶/۱۵۵-۱۵۶)

(اور دیکھو) صالحؑ نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ پانی پینے کے لئے ایک اس کی باری ہے اور ایک مقررہ دن میں تمہاری (یعنی تمہارے جانوروں کی) باری ہے۔ اسے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچانا (ورنہ یاد رکھو) پھر تمہیں ایک بڑے دن (یومِ مکافاتِ عمل) کا عذاب آپکڑے گا۔

---

[1] "خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین"۔ بس یہ ہے دین کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ۔ نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق ــــ "اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے"۔

ان تمام حدود و شرائط سے مقصود فقط یہ دیکھنا تھا کہ وہ احکامِ الٰہیہ کے احترام کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں یا نہیں۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ ۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ (۵۴/۲۷-۲۸)

(اور دیکھ، اے صالح!) ہم اس اونٹنی کو آزمائش بنا کر بھیج رہے ہیں لہٰذا تو اُن کا نگران رہ اور استقامت سے کام لے اور انہیں بتا دے کہ پانی کی ان کے درمیان تقسیم ہے (یہ اونٹنی اپنی باری پر پانی پیئے گی اور ان کے جانور اپنی باری پر) تو (اپنی اپنی) باری پر ہر باری والا حاضر ہوا کرے گا۔

اسی لئے اس اونٹنی کو ایک کھلی ہوئی نشانی کہا گیا ہے کہ اس سے ان کی قلبی کیفیات و رجحانات محسوس و مشہود طریق سے بےنقاب ہو سکتے تھے۔

وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ (۱۷/۵۹)

اور ہم نے قومِ ثمود کو اونٹنی دی کہ ایک آشکارا نشانی تھی۔ لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا (اور نشانی سے عبرت نہ پکڑی) اور ہم نشانیاں تو صرف اس لئے متعین کرتے ہیں کہ لوگ (انکار و سرکشی کے نتائج سے) ڈریں۔

کھلی ہوئی سرکشی کرنے کو تو ان لوگوں نے معاہدہ کر لیا تھا لیکن سرمایہ پرستی اور اقتدار خواہی کی لذت اتنی آسانی سے چھوٹا نہیں کرتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے قول و اقرار کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۷/۷۷)

غرضکہ انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انہوں نے کہا' اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو' تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو!

اونٹنی کو کسی نے یونہی اتفاقیہ زخمی نہیں کیا، بلکہ ان سرکشی کرنے والوں نے خاص اہتمام سے اپنے سرغنہ کو بُلایا اور اُس نے بھرپور ہاتھ سے اُسے ہلاک کیا۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿۵۴/۲۹﴾

چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا (بلایا) پس اُس نے (اونٹنی پر بھرپور) وار کیا اور ہلاک کر ڈالا!

ہلاک کرنے کو تو کر گئے، لیکن جب اس کا احساس بیدار ہوا کہ ہم نے کس قدر پختہ عہد کیا تھا اور اب اس سے کس طرح بیدردی سے پھر گئے ہیں، تو دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿۲۶/۱۵۷﴾

غرضکہ انہوں نے اُس (اونٹنی) کو ہلاک کر ڈالا۔ (مگر پھر بعد میں) نادم ہوئے۔

چنانچہ وقت گذرتا گیا اور اس قوم کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ ان کا معمول یہ ہو گیا کہ حضرت صالحؑ نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی تکذیب کی اور اس سے برعکس سمت کو چلے۔ چنانچہ حضرت صالحؑ نے آخر میں کہا کہ آتش فشاں پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ یہ پھٹنا چاہتا ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا سامان کرو۔ لیکن انہوں نے حسبِ معمول اس کا بھی مذاق اڑایا۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ﴿۱۱/۶۵﴾

صالح نے کہا" تم تین دن تک اپنے گھروں میں کھا پی لو۔ یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ نکلے گا۔

غور کیجئے، انہیں تین دن پہلے بتایا جاتا ہے کہ اب تمہاری تباہی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے اس لئے انہوں نے اس وعید کا بھی مذاق اڑایا اور آنے والی تباہی کی کوئی پرواہ نہ کی۔[1]

---

[1] یہی ہے وہ چیز جسے ہم تذکرۂ حضرت نوحؑ کے ضمن میں بصراحت لکھ چکے ہیں کہ ہوتا صرف اس قدر تھا کہ ان حوادث کے متعلق حضرات انبیائے کرامؑ کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تھا۔ (خواہ فراست کی بنا پر یا وحیٔ خداوندی کی رُو سے) وہ اپنے اس علم کو چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کا اعلان کر دیتے تھے۔ لیکن چونکہ قوم ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے ان کے اس اعلان کو بھی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) نہیں لیتی تھی اور اپنی حفاظت کا سامان نہیں کرتی تھی اس لئے تباہ ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد؟

اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کے تصور سے آج بھی ہر قلبِ سلیم سینے میں دھڑکنے لگ جاتے اور ہر دیدۂ عبرت چشم حیراں بن جاتے۔ اُن آگ سے بھرے ہوئے (آتش فشاں) پہاڑوں میں ایک دھماکا ہوا جس سے ایک چیخ، ایک گرج، ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قومِ ثمود کی بستیاں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

ہلاکت انگیز عذاب!

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ (۷/۷۸)

پھر ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔

یہاں اس عذاب کو ایک لرزہ انگیز دہشت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے زور کی کڑک سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝ (۱۱/۶۷-۶۸) نیز (۱۵/۸۳-۸۴) ؛ (۴۱/۱۷) نیز (۲۹-۳۱/۵۴)

اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، ان کا حال یہ ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے آ لیا۔ جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ (وہ اس طرح اچانک مر گئے) گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سُن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے قانون سے انکار کیا اور ہاں سُن رکھو کہ ثمود کے لئے محرومی ہوئی!

اللہ کی تدبیر

قومِ ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی تھی وہ تو ناکام و نامراد رہی اور قانونِ مکافات کی وہ خفیہ تدبیر جو یوں اُن کے پاؤں کے نیچے پختگی کو پہنچ رہی تھی، اس طرح اُبھری کہ کوئی اُبھرنے والا سامنے نہ رہا۔

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۵۰ - ۲۷/۵۲)

اور (دیکھو) ایک خفیہ تدبیر انہوں نے کی تھی اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور انہیں اس کا کوئی احساس و شعور تک نہیں تھا۔ پس ذرا غور تو کرو کہ ان کی خفیہ تدبیر کا انجام کیسا رہا (یہی رہا نا!) کہ ہم نے انہیں اور اُن کی (پوری) قوم کو سب کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ چنانچہ (آج) اُن کے مکانات خود ان کے ظلم (انکار و بدعملی) کی وجہ سے (بالکل) ویران پڑے ہوئے ہیں۔ ان واقعات میں بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہوں (عبرت و موعظت کی بڑی) نشانی ہے۔

وہ اس ہلاکت و تباہی کے خوفناک طوفانِ آتشیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اتنے عاجز و بے بس تھے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ کر سکے اور اس آفتِ جہاں سوز سے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ (۴۳ - ۵۱/۴۵)

اور (تمہارے لئے اے پیروانِ دعوتِ اسلامی!) ثمود (کے حالات) میں عبرت ہے۔ جب اُن سے کہہ دیا گیا کہ (تمہارے لئے کچھ مدت تک مہلت ہے۔ چنانچہ) وقتِ معین تک کھا پی لو۔ چنانچہ (وہ اپنے انکار و بدعملی سے باز نہ آئے اور) انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی اختیار کی۔ بالآخر انہیں ایک کڑک نے آپکڑا۔ حالت یہ تھی کہ وہ (یہ سب کچھ) دیکھ رہے تھے (مگر کچھ نہ کر سکتے تھے) اُنہیں کھڑا ہونے کی بھی طاقت نہیں تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے[1]

ہلاکت اور ایسی ہلاکت! تباہی اور اس قدر تباہی!!

---

[1] ظاہر ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے انہیں قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا تو اگر وہ ان کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھتے اور وہاں سے نکل جاتے تو اس تباہی سے محفوظ رہتے۔ حضرت صالحؑ اور ان کی جماعت اسی طرح اس تباہی سے محفوظ رہی تھی کہ وہ قبل از وقت وہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ○
وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ○ (۳۸-۲۵/۳۹)

اور عاد کو اور ثمود کو اور اصحاب الرّس کو اور ان کے درمیان میں بہت سی اُمّتوں کو ہم نے تباہ کردیا۔ (اُمم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی مؤثر اور بلیغ) مثالیں بیان کیں (مگر انہوں نے ان سے کوئی اثر نہ لیا اور (جب مکافاتِ عمل کا وقت آپہنچا، تو) ہم نے ہر ایک کو بالکل ہی برباد کردیا۔

بھلا قانونِ مکافات کی گرفت سے کوئی چھوٹ سکتا ہے!

وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰى ○ (۵۳/۵۱) نیز (۶۹/۵)

اور (دیکھو، تمہارے پروردگار نے) ثمود کو بھی تباہ کردیا۔ چنانچہ اسے (صفحۂ ہستی پر) باقی نہیں رکھا۔

یہ تھا عذاب جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجۂ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ (۱۵۸-۲۶/۱۵۹)

چنانچہ (دیکھو) انہیں قانونِ مکافات کے عذاب نے آپکڑا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں (نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک بڑی) نشانی ہے اور (بات یہ تھی کہ) ان میں سے اکثر (معاندانہ انکار اور ضد کی وجہ سے قبولِ حق کی صلاحیت کو کھو چکے تھے اور) ایمان لانے والے نہیں تھے (چنانچہ وہ تباہ ہوگئے)۔ بے شک تیرا رب عزیز اور رحیم ہے۔

یہاں آیت کے اخیر میں، خدا کے "عزیز و رحیم" ہونے کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ عزیز تو صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بڑھ کر غلبہ و اقتدار کس کا ہوسکتا ہے؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایسا کرنا خدا کی صفتِ رحیمیت کا بھی تقاضا تھا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے۔ ان کی ہلاکت، رحمتِ خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے سامانِ رزق کو سطحِ ارض پر بکھیر رکھا ہے۔ لیکن مستبد قومیں انہیں اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور مخلوقِ خدا بھوکوں مرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا بجھایا گیا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ

کریں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی تھیں۔ یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو تباہ و برباد ہونے دیا جاتا اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمتِ خداوندی (خدا کی ربوبیتِ عامہ کی اسکیم) کا تقاضا یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کر دیا جائے۔

سورۃ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَا ۝ اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (۹۱/۱۱-۱۵)

(اور دیکھو) قومِ ثمود نے اپنی سرکشی کے ساتھ سچائی کو جھٹلایا۔ جب اُن کا بدبخت ترین (سرغنہ) کھڑا ہوا تو اللہ کے رسول نے (آخری اتمامِ حجت کے طور پر) خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی اور اُس کے پانی پینے (کی باری) کے متعلق کہا۔ چنانچہ انہوں نے رسول کو جھٹلایا اور اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا۔ بالآخر اُن کے جرائم کی وجہ سے اُن کے پروردگار نے اُن پر تباہی بھیج دی (اور ایسی تباہی بھیجی کہ) انہیں (تہس نہس کر کے زمین کے) ساتھ ہموار کر دیا اور (خدا جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا قانونِ مکافات کسی کو پکڑتا ہے تو) خدا اس خیال سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

قانونِ مکافات کی ہمہ گیری

آپ آخری آیت پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری و نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت فگن اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی بِذَنْۢبِهِمْ کا ٹکڑا اُبھر اُبھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شانِ جبروت و کبریائی (معاذ اللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لاپرواہی اور بدمستی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے جس کی رُو سے نظامِ کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے جس میں ایک ذرۂ بے مقدار سے لے کر عظیم الشان کروں تک ذرا سی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال قانونِ جزا و سزا کی گرفت سے کب باہر جا سکتے ہیں؟ اور جب اس قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ نافذ

ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کے جذبات اثر انداز نہیں ہوسکتے کہ وہ جہاں رحمٰن و رحیم ہے وہاں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردہ ساز کو اُٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (قانونِ مکافاتِ عمل کا حاکمِ مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک شائبہ ہے کہ اگر قانونِ مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔ لہٰذا وَ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا وہ محورِ عظیم ہے جس کے گرد تمام نظامِ کائنات گردش کر رہا ہے، خارجی کائنات بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی جس کا فیصلہ عدل اور رحمتِ عامہ کے تقاضوں کے مطابق ہو، اسے اپنے فیصلے کے عواقب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جماعتِ مومنین کو بچا لیا گیا

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ ہلاکت بہت قریب آ رہی ہے، یعنی حضرت صالحؑ کو اس آنے والے حادثہ کا علم پہلے دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر ان لوگوں سے کنارہ کش ہو کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ (۷/۷۹)

پھر صالحؑ اُن سے کنارہ کش ہو گیا، یہ کہتے ہوئے کہ "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (۱۱/۶۶)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا، تو ہم نے صالحؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا۔ (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

اس لئے کہ وہ مومنین ومتقین کی جماعت تھی۔

وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (۲۷/۵۳ نیز ۴۱/۱۸)

اور (دیکھو) ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے ہلاکت سے محفوظ رکھا اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ تھے بھی متقی (اس لئے اس کے مستحق تھے!)۔

ان بقایائے ثمودؔ سے جو نسل آگے بڑھی انہیں ثمودِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ ہے قومِ ثمود کی داستانِ عبرت انگیز جو صاحبِ علم و بصیرت کے لئے اپنے اندر سامانِ عبرت رکھتی ہے اور جن کی اُجڑی ہوئی بستیاں ہر رہ گذر سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ؏

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۲۷/۵۲)۔

چنانچہ یہ ان کے مکانات ویران پڑے ہیں۔ بلا شبہ (اُن کی) اس (عبرت انگیز تباہی) میں اُن لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہیں (بڑی) نشانی ہے۔

اسی داستان کو قرآنِ کریم نے بغیر نام لئے سورۂ المؤمنون کی چند آیات میں یوں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ قوم نوحؑ کی غرقابی کے بعد ارشاد ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝..... ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ (۳۱ ــ ۲۳/۴۲)

پھر ہم نے قومِ نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا۔ ان میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا (اس کی دعوت بھی یہی تھی) کہ "اللہ ہی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و فساد کے نتائجِ بد سے) ڈرتے نہیں۔ اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی (لوگوں سے) کہنے لگے اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا

ہے۔ جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو بس سمجھ لو تم تباہ ہوئے۔ تم سُنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں امید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے، تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا۔ کیسی اَن ہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع دلاتا ہے! (بھلا دوبارہ زندہ ہونا کیسا؟) زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں۔ یہیں مرتے ہیں، یہیں جینا ہے۔ ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر جی اُٹھیں۔ کچھ نہیں، یہ ایک مفتری ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنا دی۔ ہم کبھی اس کی بات ماننے والے نہیں (اس پر رسول نے) کہا "خدایا! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر! حکم ہوا، عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کئے پر شرمسار ہوں گے۔" چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے انہیں آ پکڑا، اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح اُنہیں پامال کر دیا۔ تو محرومی ہو اس گروہ کے لئے کہ ظلم کرنے والا ہے! پھر ہم نے ان کے بعد قوموں کے اور بہت سے دَور پیدا کئے۔

اور اس کے بعد وہ نقطۂ ماسکہ جو قوموں کی موت و حیات کے لئے ایک اٹل قانون کی حیثیت سے لئے ہوئے ہے یعنی

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ (۲۳/۴۳)

کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

یہ وقتِ معین (اجل) کسی قوم کے اجتماعی اعمال کے ظہورِ نتائج کا نام ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ظلم اور زیادتی سے ہلاک نہیں کرتا۔ یہ ہلاکت ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ (۱۱/۱۱۷)

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو (یونہی) ظلم سے ہلاک کر دے درآنحالیکہ ان کے رہنے والے (باقی رہنے کی) صلاحیت رکھتے ہوں۔

سورۃ المؤمنون کی مندرجہ صدر آیات کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم صرف اس زندگی کو آخری زندگی سمجھے وہ کبھی اپنی عیش سامانیوں کو چھوڑ کر نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی۔

اس کے لئے تو صرف وہی آمادہ ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ زندگی کو مسلسل آگے چلنا ہے اور اگلی زندگی میں خوشگواریوں کا معیار یہ ہے کہ اس زندگی میں دوسروں کی پرورش کے لئے کیا کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ قرآن سرمایہ پرستی کے خون آشام نظام کو مٹانے کے لئے ایمان بالآخرۃ کو بنیادی تصور قرار دیتا ہے۔

رسول اجرِ رسالت نہیں مانگتا

قومِ ثمود کا قصہ یہیں تک ہے ..... لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جن پر آگے بڑھنے سے پیشتر مزید غور و تفکر کی ضرورت ہے۔ آپ نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہو گا کہ قرآنِ کریم نے ان حضرات کا یہ قول خصوصیت سے درج کیا ہے کہ "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے" حضرت صالحؑ کے تذکرہ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَ مَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ

(۲۶/۱۴۵)

اور میں تم سے (اپنی) اس (رہنمائی و ہدایت) پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف تمام جہانوں کے پالنے والے ہی کے ذمہ ہے (اور بس)۔

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا قرآنِ کریم نے یوں بتکرار ذکر کیا ہے۔ ایک داعیِ الی الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتِ رشد و ہدایت کا معاوضہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک تبلیغِ پیاماتِ الٰہیہ اور قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے جدّوجہد ایک اہم فریضہ ہے جس کی ادائیگی اس پر لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ انسانوں سے اس کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔ اور یہ اس داعیِ الی الحق کے عدیم النظیر کیریکٹر کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ واضح رہے کہ دنیا میں معاوضہ صرف روپیہ کی شکل میں ہی نہیں ہوا کرتا۔ ذرا علم و فضل کی مسندوں، زہد و تقویٰ کے آستانوں اور رہبرانِ ملّت کی بارگاہوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کس قدر متنوع شکلیں ہیں جن میں اپنی "بے لوث" خدمات کا معاوضہ طلب کیا جاتا ہے! نذرانہ نہیں تو مخدومیت اور طاعت اور اطاعت بھی اکثر اوقات پرستش کی حد تک، کبرِ نفس کے تقاضوں کی تسکین۔ اَنَا الۡمَوۡجُوۡد دلاغیری کے بلند آہنگ دعاوی، تنقید کی حد سے ماورائیت اور کم از کم نام کی شہرت، جھوٹی عزت! اور ان تمام داعیات و اقتضایات کے باوجود بلا مُزد و معاوضہ خدمت کا دعوےٰ! کتنا

بڑا فریب ہے جو اپنے آپ کو اور دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک حق و صداقت کے داعی کی روش ان سب سے الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر قدم "اللہ کے لئے" اٹھتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا اعلان یہ ہوتا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ (۶/۱۶۲)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہہ دو میری صلوٰۃ اور میرے فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے!

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی اقدام خلوص و صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کا جذبۂ محرکہ خالص للّٰہیت نہ ہو، یعنی اس کے صلہ میں محسوس معاوضہ تو ایک طرف، اس قسم کے غیر محسوس رجحاناتِ قلبی و ذہنی کو بھی دخل نہ ہو۔ کام کو اپنا فرض سمجھ کر انجام دیا جائے اور اس پر یقین رکھا جائے کہ جو کام قانونِ خداوندی کے مطابق کیا جائے اس کا معاوضہ اس کے نتائج ہوتے ہیں جو خود اس کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ اسی کا نام ہے

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ

نَاقَۃُ اللّٰہ دوسری چیز یہ کہ اس اونٹنی کو جس کا ذکر قصۂ حضرت صالحؑ میں آیا ہے، ناقۃ اللہ سے موسوم اور آیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۷/۷۳)

یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے۔ پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرلے۔ اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذابِ جاں کاہ تمہیں آ پکڑے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس اونٹنی کو ناقۃ اللہ کیوں کہا گیا تھا اور وہ کس بات کی نشانی تھی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اونٹنی، عام اونٹنیوں جیسی اونٹنی تھی۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کی تخلیق غیر معمولی انداز سے بطور خرقِ عادت ہوئی تھی۔ محض آیت کے لفظ سے یہ سمجھ لینا کہ اس کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی تھی، قرآن کے اسلوبِ بیان اور حقیقی تعلیم سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ قرآن نے کشتیٔ حضرت

نوحؑ کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ آیت (نشانی) تھی

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۹/۱۵)

الغرض ہم نے نوحؑ کو اور (اُس کے ساتھی) کشتی والوں کو (اُس عذابِ غرق سے) محفوظ رکھا اور ہم نے اس کشتی کو جہان (والوں) کے لئے ایک نشانی بنادیا تھا۔

حالانکہ وہ عام طریقہ کے مطابق ہی تیار ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ (۳/۹۷)

اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

کعبہ بھی آیت ہے

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خدا کے اس گھر کی تعمیر میں بھی کسی خرقِ عادت واقعہ کا دخل نہ تھا۔ معمارِ حرم (علیہ السلام) نے اس کی تعمیر اسی طرح کی تھی جس طرح اور مکانوں کی کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ملّتِ حنیفہ کے لئے مرکزِ محسوس اور ان کی موت وحیات کے پرکھنے کی ایک کھلی ہوئی علامت (آیت) ہے۔ جس طرح قومِ ثمود سے کہا گیا تھا کہ یہ ناقۃ اللہ تمہارے کفر وایمان کے پرکھنے کی ایک نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو یہ تمہاری اٰيٰتِ اِلٰى اللہ کی نشانی ہوگی اور اگر اسے ضرر پہنچایا تو اس سے تمہارا انکار و جحود واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کی ایمانی قوّت وضعف کے پرکھنے کا معیار بیت اللہ ہے۔ اگر ان میں بیت اللہ کی حفاظت کی ہمت رہی تو یہ ان کی ملی زندگی اور حرارتِ ایمانی کی دلیل ہوگی۔ اور اگر اس پر دوسروں کا اثر غالب آگیا تو یہ ان کی اسلامی موت کی نشانی (آیت) ہوگی۔ قومِ ثمود نے ناقۃ اللہ کی حفاظت نہ کی اور اللہ کے رسواکن عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (۱۱/۶۶)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو ہم نے صالحؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کیساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا۔ (اے پیغمبرؐ!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوّت والا اور سب پر غالب ہے!

اور ہم بیت اللہ کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو ذلّت ورسوائی کا عبرت انگیز عذاب ہم پر مسلّط ہوگیا اور قومِ ثمود کی طرح اس چالیس کروڑ "ہجومِ مومنین" کی یہ حالت ہوگئی کہ

فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ ۙ كَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا ؕ (۱۱/۶۷-۶۸)

جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

اپنے دیار وامصار میں یوں مُردوں کی طرح اوندھے پڑے ہیں گویا ان میں کبھی زندوں کی طرح بسے ہی نہ تھے!

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ (۲۶/۱۵۸)

یقیناً اس کے اندر ایک نشانی ہے۔

وَ مَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ (۲۶/۱۵۸)

اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر ان حقائق وعبر پر "ایمان" نہیں رکھتے۔ یونہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ہماری ہی عبرتناک داستان ہے کسی اور کا قصہ نہیں۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے اس سے بالتخصیص یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے مشترکہ فائدے کے لئے ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قوم ثمود کے اکابر' مویشیوں کی نسبت امیروں اور غریبوں کی طرف کرکے' غریبوں کے مویشیوں کو چشموں کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ جب ان سے اس بات پر معاہدہ ہوا کہ یہ چشمے اور چراگاہیں سب کے مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے تو اس کے لئے بطور نشان یہ کہا گیا کہ یہ ایک اونٹنی جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی امیر آدمی کی ہے' نہ غریب کی۔ یہ خدا کی مخلوق ہے اسلئے اسے خدا کی زمین میں چرنے کا حق ہے۔ ناقۃ اللہ اور ارضِ اللہ میں یہی خصوصیت مضمر ہے۔ اُسی طرح' جیسے خدا نے کعبہ کو بیتی (میرا گھر) کہہ کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے مفاد کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے گا۔

واضح رہے کہ ارض کو اسی لئے ارض اللہ کہا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "نظامِ ربوبیت" یا "خدا اور سرمایہ دار" میں ملے گی)۔

خلاصۂ مبحث اُمم سابقہ کا دوسرا شہرہ قبیلۂ ثمود تھا جس کا مسکن وادیٔ قریٰ اور دارالحکومت حجر تھا۔ یہ قوم بھی دولت و قوت کی فراوانی کی مالک تھی، لیکن عاد کی طرح مفسد فی الارض۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔ انھوں نے ان کی دعوتِ انقلاب کی سخت مخالفت کی اور وہی کچھ کیا جو اس سے قبل عاد نے حضرت ھودؑ سے کیا تھا۔ وہی اعتراضات، وہی اسلاف پرستی کا جذبہ، وہی قوت پر زعمِ باطل قرآن اس ضمن میں جس بات کو نمایاں طور پر اُبھار کر سامنے لایا ہے وہ یہ ہے کہ جب انسانوں نے مل جل کر تمدنی زندگی شروع کی تو اسی زمانے سے "امیر و غریب" کی کشمکش شروع ہو گئی جو اب تک جاری ہے۔ کچھ لوگوں نے کسی نہ کسی طرح قوت حاصل کر کے، رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح کمزور اور ضعیف ان کے دستِ کرم کے محتاج ہو گئے یہی احتیاج تھی جس کی وجہ سے غریبوں کا طبقہ، صاحبِ قوت و دولت طبقہ کا غلام بن گیا اور ان کی زندگی کا مقصد ان کے آرام و آسائش کے سامان فراہم کرنا قرار پا گیا۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی آمد کے بنیادی مقاصد میں سے یہ بھی تھا کہ وہ رزق کے سرچشموں کو ان مستبد قوتوں کے فولادی پنجوں سے چھڑا کر، انھیں نوعِ انسانی کی ضروریات کے لئے عام کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس انقلابی تحریک کی سب سے بڑھ کر مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہوتی تھی جن کے ہاتھوں سے رزق کے یہ سرچشمے چھینے جاتے تھے۔ اسی کشمکش کا منظر ہے جو "ناقۂ صالح" کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اُس زمانے میں، لوگوں کی سب سے بڑی دولت مویشی تھے اور پانی ان کی زندگی کا سب سے بڑا آسرا — یہ اکابرین پانی کے چشموں پر قابض ہو جاتے تھے اور غریبوں اور کمزوروں کے مویشیوں کی ان تک رسائی نہیں ہونے پاتی تھی۔ (ہم آگے چل کر داستانِ حضرت موسیٰؑ میں دیکھیں گے کہ طاقت وروں اور کمزوروں کے جانوروں کے پانی پینے کا یہ انسانیت سوز منظر مدین کی چراگاہ میں کس طرح نکھر کر سامنے لایا گیا ہے) حضرت صالحؑ نے ان اکابرین سے یہ عہد لیا کہ وہ بستی کے تمام لوگوں کے مویشیوں کی باری باندھ لیں اور اس میں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ سب مویشی اپنی اپنی باری پر آ کر پانی پئیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اکابرین اس معاہدہ پر قائم رہتے ہیں یا نہیں، حضرت صالحؑ نے، غریبوں کے جانوروں کے نمایندہ کی حیثیت سے خود اپنی اونٹنی کو پیش کیا اور ان سے کہا کہ اگر انھوں نے اسے اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ اپنے عہد پر قائم ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے اُسے روکا تو اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ وہ قانونِ عدل و مساوات سے سرکشی برتنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ان سرکش اکابرین نے اس اونٹنی کو نہ صرف پانی پینے سے روکا بلکہ اسے گھائل کر کے ختم ہی کر دیا۔ اس کے بعد

ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو دنیا میں ہر ظالم اور مستبد قوم کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن نے اس چھوٹے سے واقعہ سے انسانی نظام معیشت کے کس قدر اہم گوشے سے نقاب کشائی کی ہے اور اس پیچیدہ ترین گتھی کو سلجھانے کے لئے کس قدر بلند اصول پیش کیا ہے۔ زمان اور مکان کی تبدیلی سے احوال وظروف میں تبدیلی ہو جاتی ہے لیکن رُوح ہمیشہ وہی کارفرما رہتی ہے۔ حضرت صالحؑ کے زمانہ سے لے کر آج تک انسان نے اپنے معاشی نظام میں سینکڑوں تبدیلیاں کیں لیکن "پانی کا چشمہ اکابرین کے جانور اور غریب کی اونٹنی" اصولی طور پر ہمیشہ باقی رہی۔ اس کا حل جب بھی ملا، اسی اصول میں ملا جسے قرآن نے اس ضمن میں پیش کیا ہے اور جب بھی ملے گا اسی اصول میں ملے گا، یعنی "خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین"۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

معمارِ حرم

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے
رازدار و رازِ ما بیت الحرم
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم

حضرت ابراہیم علیہ السلام

گذشتہ صفحات میں ان انبیائے کرام (عَلَيْهِمُ السَّلَام) کا تذکرہ ہماری نگاہوں سے گزرا ہے جن کی دعوتِ رشد و ہدایت کا سلسلہ اپنی اپنی قوم تک محدود رہا۔ لیکن، جیسا کہ متعدد مقامات میں بیان کیا جا چکا ہے، اسلام تمام نوعِ انسانی کا دین ہے اس لئے اس کا حلقۂ تخاطب عالمگیر ہے۔ زیرِ نظر باب میں اس جلیل القدر ہستی کا تذکرۂ جمیلہ ہمارے قلب و نگاہ کے لئے وجۂ شادابی بنے گا جس کے مقدس ہاتھوں اسلام کی اس آفاقیت اور عالمگیریت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ذاتِ گرامی قدر، پیکرِ خُلّت و صداقت، حضرت ابراہیمؑ کی ہے جنہیں مشیّتِ ایزدی نے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا کہ سامی اقوام میں نبوّت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ آپ کی ذریت سے باہر نہ گئی۔ اس شجرِ مقدس کی ایک شاخِ طوبیٰ حضرت عیسیٰؑ تک منتج رہی تو دوسری شاخ سے وہ گلِ سرسبد تبسّم فشاں ہوا جس پر نور و نکہت کی تمام رعنائیاں اپنے اوجِ کمال تک پہنچ کر ختم ہو گئیں اور جس کی جلوہ فروشیاں اور عنبر فشانیاں زمان و مکان کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر قیامت تک کے لئے زینتِ محفلِ انسانیت قرار پا ئیں۔ اس نبئ آخر الزمان (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) کی ملت، ملتِ ابراہیمی اور اُمّت، اُمّتِ حَنِيفِيَّة کے نام سے موسوم ہوئی۔ کیونکہ دنیا میں "خاندانِ" توحید پرستی کے مؤسّسِ اوّلی اور مورثِ اعلیٰ حضرت خلیلِ اکبر (اِبْرٰهِيمؑ) ہی ہیں۔

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس سلسلۂ نبوّت و رسالت کی ایک برگزیدہ کڑی تھے جس

کے تذکرہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی گئی ہے۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ (۳۷/۸۳)

اور (یقیناً نوح کے) گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔

آپ کا زمانہ حضرت نوحؑ کے بعد اور حضرت اسحٰقؑ و یعقوبؑ سے پہلے ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۶/۸۵)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہِ راست دکھائی، وہی راہِ راست، جو ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھا چکے تھے اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسےٰ، ہارون کو بھی (یہی راہ دکھائی)۔ ہم اسی طرح حسنِ عمل کرنے والوں کو ان کے حسنِ عمل کا بدلہ دیتے ہیں۔

چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ (۱۲/۳۸)

میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی ہے۔

توریت کا بیان ہے کہ حضرت نوحؑ کی آٹھویں[1] پشت میں نحور پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیمؑ کے دادا تھے۔ ان سے یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھا۔

نحور

تارح (آذر)

حضرت ابراہیمؑ — حاران

حاران ← حضرت لوطؑ

حضرت ابراہیمؑ ←

- (حضرت سارہ کے بطن سے) حضرت اسحٰقؑ — انہوں نے کنعان یعنی فلسطین و شام میں حکومت قائم کی۔ ← حضرات انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام
- مدیان (حضرت قطورا کے بطن سے) — یہ حجاز کے قریب بحرِ احمر کے ساحل کے پاس متمکن ہوئے۔
- (حضرت ہاجرہ کے بطن سے) حضرت اسمٰعیلؑ (جو بادیہ فاران میں جلوہ افروز ہوئے)۔ ← حضور ختم المرسلین نبیؐ اکرمؐ
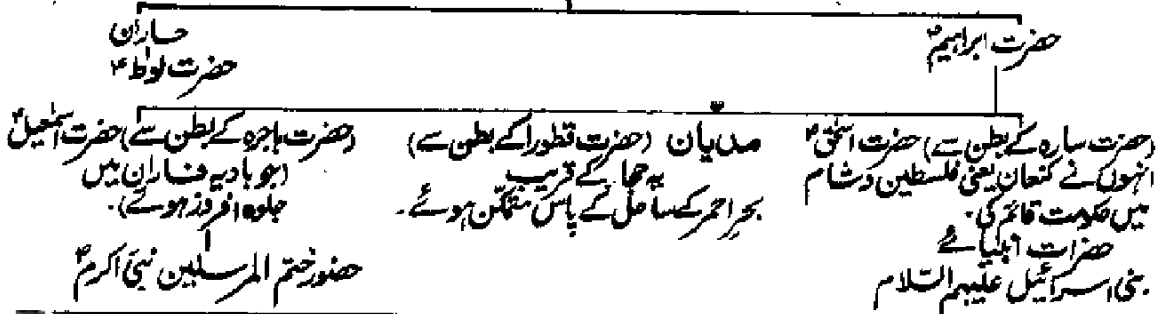
[1] توریت کے بیان کے مطابق یہ سلسلہ یوں قائم ہوا تھا۔ (حضرت) نوحؑ۔ سام۔ ارفکسد۔ سلح۔ عبر۔ فلج۔ رعو۔ سروج نحور۔ تارح۔ حضرت ابراہیمؑ۔

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا خاندان، کلدانیوں کے شہر اُورؔ[1] میں آباد تھا۔ کلدانیوں (بابل) کا تمدن تاریخ کے اوراق پر اُبھرے ہوئے حروف میں نظر آتا ہے۔ توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے جس میں شنعا (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل درج ہے۔ قیاس ہے کہ یہ بادشاہ وہی ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین بابل کے مینارہ پر کندہ ملے ہیں۔

زمانہ اور ماحول

اس قیاس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کا عہد (۲۲۰۰ ق.م) قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کی قوم بُت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود حضرت ابراہیمؑ کے والد ایک بہت بڑے پجاری (آدار) تھے۔ لہٰذا جن موروثی اثرات کو لئے ہوئے حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے اور جس ماحول میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی، علم النفس (PSYCHOLOGY) کے اصول کی رُو سے آپ کو انہی معتقدات کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ایک نبی اور عام انسانی بچے میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ عام انسانی بچہ اپنے موروثی اثرات و نقوش اور ماحول کی تعلیم و تربیت کی تخلیق ہوتا ہے لیکن جسے اللہ تعالیٰ مقامِ نبوت کے لئے مختص کرتا ہے وہ ان خارجی اثرات سے غیر متاثر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بتوں کی آغوش کا پرورش یافتہ بچہ دنیا میں سب سے بڑا بُت شکن ثابت ہوا اور یہ بت شکنی صرف مٹی اور پتھر کے محسوس و مرئی بتوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ایک ایسے زمانے میں، جب کہ انسانی نگاہ محسوسات کی چار دیواری سے باہر نکل جاتی تھی، تیشۂ ابراہیمیؑ نے اعماقِ قلب میں چھپے ہوئے غیر محسوس و غیر مرئی بتوں تک کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور یوں دنیا میں خالص اور سچی توحید کے عملی پیکر کی حیثیت سے ملّتِ موعدہ کے موسسِ اوّل قرار پائے۔ لیکن یہ دعوتِ توحید کچھ آسان کام نہ تھا اس میں تو ع

صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

اس دعوت کے معنی یہ تھے کہ ساری دنیا کی مخالفت مول لے لی جائے۔ لیکن اس مخالفت سے ان کے جو ہر

---

[1] خود اُورؔ کے معنی شہر یا بستی کے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ تورات کے اُورؔ سے مراد بابلؔ وغیرہ کوئی بڑا شہر ہو۔ کتاب پیدائش میں ہے:۔

اور تارحؔ نے اپنے بیٹے ابرامؔ اور اپنے پوتے لوطؔ یعنی حاراؔن کے بیٹے کو اور اپنی بہو ساری ابرام کی جورو کو لیا اور ان کے ساتھ کسدیوں کی اُورؔ سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہاں رہے۔ (پیدائش ۱۱/۳۱)

خودی کی اور بیداری ہوتی تھی۔ یہ تصادم درحقیقت اس امر کے پرکھنے کے مواقع تھے کہ ان کی صلاحیتیں کس حد تک بیدار ہو چکی ہیں اور ان کے عزم میں کس حد تک پختگی آ چکی ہے۔ اس کے متعلق سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ (۲/۱۲۴)

جب اللہ نے ابراہیم کے لئے اس کی مضمر صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع بہم پہنچائے تو معلوم ہوا کہ اس کی صلاحیتیں تکمیل پا چکی ہیں۔

امامتِ نوعِ انسانی

اس پر کہا گیا کہ جس کی صلاحیتیں اس حد تک تکمیل پا چکی ہوں اسے حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار بن جائے۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (۲/۱۲۴)

(جب ایسا ہوا، تو) خدا نے فرمایا (اے ابراہیم!) میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ معماروں کے پاس ایک چھوٹا سا اوزار ہوتا ہے یعنی پیتل کے ایک چھوٹے سے لٹو سے ساتھ لمبا دھاگا بندھا ہوتا ہے۔ اس سے وہ دیکھتا ہے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے اور چنائی ہموار ہو رہی ہے۔ اسے امام کہتے ہیں۔ ایک بلند سیرت کا انسان (نبی) دوسروں کے لئے امام کا کام دیتا ہے۔

دعوتِ توحید کی ابتدا

اس دعوتِ توحید کی ابتدا خود اپنے گھر سے ہوئی۔ ہوش سنبھالا، تو اپنے آپ کو ایک عظیم الشان بت کدہ میں پایا جس کا سب سے بڑا پجاری خود ان کا باپ تھا۔ انھوں نے باپ اور بت کدہ میں آنے والے دوسرے اصنام پرستوں کی اس حرکت کو حیرت و استعجاب سے دیکھا اور کہا کہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے جو اس کھلی ہوئی غلط روش پر چلے جا رہے ہو۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۶/۷۴)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا، کیا تم (پتھر کے) بتوں کو

معبود مانتے ہو؟ میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل سورۃ مریم میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ ....

.... فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ (۱۹/۴۵ — ۴۱)

اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم کا ذکر کر یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا۔ اس وقت کا ذکر جب اس نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے نہ دیکھتی ہے نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں۔ علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! غلط جذبات کی اطاعت نہ کر۔ یہ تو خدا سے سرکشی کے مظاہر ہیں۔ اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے تجھے سزا ملے اور تیرا حشر بھی سرکش انسانوں جیسا ہو جائے۔

بُت خانے کا سب سے بڑا پجاری اور خود اپنے بیٹے کی زبان سے اس قسم کی باتیں! پہلے تو سمجھایا بجھایا ہوگا لیکن جب دیکھا کہ بیٹا اس مسلکِ بُت پرستی کا کھلا ہوا دشمن ہے تو کہا۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ (۱۹/۴۶)

باپ نے (یہ باتیں سُن کر) کہا،" ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ، اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا (یا دھتکار کر عاق کر دوں گا)۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا۔

اگرچہ آج بھی مندروں کے پجاریوں، کلیساؤں کے راہبوں اور خانقاہوں کے پیشواؤں کی حیثیت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں، مندر کا پجاری اور مملکت کا بادشاہ یکساں حیثیت رکھتا تھا۔ بلکہ پجاری کا رتبہ بادشاہ سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ بادشاہ اپنی بادشاہت کے لئے پجاریوں کی "اشیرباد" (دُعا) کا محتاج ہوتا تھا۔ اس لئے ایک پجاری کے بیٹے کا اس مسلک سے انحراف، نہ صرف اسے "ملحد و بے دین"، ہی بنا دینے والا تھا بلکہ اس سے اتنا بڑا منصب و مقام بھی چھین لینے کا موجب بننے والا تھا۔ یہ

دھمکی اور اُس کا جواب

سب باتیں حضرت ابراہیمؑ کے سامنے تھیں اور انہی کے پیشِ نظر ان کے باپ کی یہ دھمکی بھی تھی۔ غور کیجئے کہ کتنی بڑی تھی یہ دھمکی اور کس قدر غصے سے لبریز! لیکن اس کا جواب کس قدر نرم و نازک انداز میں دیا گیا۔ فرمایا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ (۱۹/۴۷—۴۸)

ابراہیم نے جواب دیا، میں تو تیرے لئے بہرحال امن اور سلامتی ہی کا آرزو مند ہوں گا اور چاہوں گا کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے تیری حفاظت ہو جائے[1]۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں، اُمید ہے، اپنے پروردگار کو پکار کر میں محروم ثابت نہیں ہوں گا!

اگرچہ باپ نے اتنی شدید مخالفت کی تھی لیکن حضرت ابراہیمؑ نے خیال کیا کہ یہ خشونت و برہمی اس عقیدت کی بناء پر ہے جو انھیں اپنے خداؤں سے ہے۔ ممکن ہے جب میری دعوت پر غور کریں گے تو رفتہ رفتہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی اور یہ اپنی اس کھلی ہوئی گمراہی سے باز آ جائیں گے۔ یہ آرزو اسی خوشگوار توقع کی بناء پر تھی جو افسوس کہ غلط ثابت ہوئی۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ کو یقین ہو گیا کہ باپ اپنی گمراہی سے باز نہیں آئے گا، تو اس سے اتنا سا تعلق بھی باقی نہ رہا۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ (۹/۱۱۴)۔

(دعائے مغفرت کا ذکر (۲۶/۸۶)؛ (۶۰/۴) میں بھی آیا ہے)

اور ابراہیم نے جو اپنے باپ کے لئے حفاظت کی آرزو کی تھی، تو صرف اس لئے کہ اپنا وعدہ پورا کر دے جو وہ اس سے کر چکا تھا (یعنی جو اس نے اس سے کہا تھا)۔ لیکن جب اس پر واضح

---

[1] یعنی تو بھی اصنام پرستی کو چھوڑ کر خدا کی محکومیت اختیار کر لے۔

ہو گیا کہ (اس کا باپ) اللہ کے قانون کا دشمن ہے (اور کبھی حق کی راہ اختیار کرنے والا نہیں)، تو اس سے بیزار ہو گیا۔ بلاشبہ ابراہیم بڑا ہی دردمند، بڑا ہی بردبار (انسان) تھا!

قوم سے خطاب

باپ کے ساتھ کسی ذاتی معاملہ پر جھگڑا تو تھا ہی نہیں کہ گھر کی چار دیواری تک محدود رہتا۔ معاملہ آگے بڑھا تو حضرت ابراہیمؑ نے قوم کو بھی اسی طرح مخاطب کیا۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ (۲۱/۵۱)

جب اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم جم کر بیٹھ رہے ہو۔

یہ ایک ایسا واضح اور کھلا ہوا اعتراض تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا! انسان اور اپنے ہاتھوں کی تراشیدہ مورتیوں کے سامنے جھکے! یہ ایک ایسی واضح گمراہی ہے جس کے جواز میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جا سکتا اِلّا اس کے کہ

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ ۝ (۲۱/۵۳)

تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا وہ انہی کی پوجا کرتے تھے۔

اسلاف پرستی

لیکن اس مضحکہ انگیز دلیل کی حقیقت کیا ہے؟

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۲۱/۵۴)

ابراہیم نے کہا، یقین کرو تم خود بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں تھے۔

لیکن قوم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ نوجوان سچ مچ اپنے اسلاف کی روشِ کہن کے خلاف ہے۔ اس لئے انھوں نے کہا:۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ ۝ (۲۱/۵۵)

اس پر انھوں نے کہا، "تو ہم سے سچ مچ کہہ رہا ہے یا یونہی مزاح کر رہا ہے؟

آپ نے کہا کہ اس میں مزاح کی کون سی بات ہے! یہ ایک حقیقت ہے جس پر کامل متانت اور سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ؗ ۖ وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ (۲۱/۵۶)

ابراہیمؑ نے کہا مذاق نہیں۔ میں سچ مچ تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس خدا کا قانونِ ربوبیت کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جاری و ساری ہے اس کا قانون تمہارے معاشرہ میں بھی نافذ ہونا چاہیئے۔ میں اس حقیقت کی شہادت پیش کر رہا ہوں۔

بُت پرستی کی تائید میں جو دلیل قوم کی طرف سے پیش کی گئی تھی وہ تو ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس مسلک کے ابطال میں حضرت ابراہیمؑ نے جو کچھ فرمایا وہ قابلِ غور ہے۔ سورۃ شعراء میں ہے۔

وَ اتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۘ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ۝ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۙ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۝ (۶۹-۷۳/۲۶)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ابراہیمؑ کے حالات ان کے سامنے پیش کرو جب اس نے اپنے والد اور اپنی قوم سے (متحیر ہو کر) کہا کہ آخر یہ تم کن کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا "ہم مورتیوں کو پوجتے ہیں۔ چنانچہ ان کی پوجا میں جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس پر ابراہیمؑ نے کہا، کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو یا تمہیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ (کیونکہ اس کے بغیر تو کوئی چیز بھی اطاعت کے لائق نہیں ہو سکتی)۔

اس سوال کا جواب کیا تھا؟ اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۶/۷۴)

وہ بولے (نہیں، یہ بات تو نہیں ہے) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے پھر یہی فرمایا کہ اس بات کو چھوڑو کہ یہ مسلک تمہارے اسلاف سے متوارث تم تک پہنچا ہے۔ سوچو یہ کہ یہ مسلک ہے کیسا؟ اسلاف پرستی کے خلاف کیسی بصیرت افروز

دلیل ہے، یعنی نفسِ شے پر غور کرو اور سوچو کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں قرار پاسکتی کہ وہ چند نسلوں سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ فرمایا۔

قَالَ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ۙ۝ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمُ الۡاَقۡدَمُوۡنَ ۝ۖ (۷۶-۷۵/۲۶)

ابراہیم نے کہا (ظالمو!) تم نے غور بھی کیا کہ تم اور تمہارے اگلے باپ دادا، کن لوگوں کی عبودیت (اطاعت شعاری و فرماں پذیری) اختیار کرتے چلے آرہے ہیں؟

شرک کی بنیاد

اس مقام پر آپ نے غیر اللہ کی عبودیت کے متعلق یہ فرمایا کہ دیکھو! ان میں سے کسی میں یہ قوت نہیں کہ تمھیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی لغزش کی سب سے خطرناک گھاٹی، جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا خیال ہے۔ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکتا اس وقت ہے جب وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ شخص اسے کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مظاہرِ فطرت (آگ، پانی، بادل، بجلی، شیر، سانپ) کی پرستش یا ان دیوی دیوتاؤں کی تماثیل (مٹی اور پتھر کے بتوں) کی پوجا کی ابتدا بھی اسی جذبہ کے ماتحت ہوئی اور اس سے آگے بڑھ کر، انسانوں کی محکومیت و عبودیت کی بنیادیں بھی انہی تصورات پر استوار ہوئیں۔ ایک داعیٔ توحید، قلب و دماغ کے بُت خانوں کی انہی بنیادوں کو اکھیڑتا ہے جب وہ اس حقیقت باہرہ کو سامنے لاتا ہے کہ دنیا میں نفع و مضرت کی قوت خدا کے قانون کے علاوہ اور کسی میں نہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَ اِبۡرٰهِيۡمَ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ ؕ......

...... وَ مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ۝ (۱۸-۱۶/۲۹)

اور (اے پیغمبر! اسی طرح) ہم نے ابراہیم کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، (یاد کرو) جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و حکومت پذیری) اختیار کرو اور اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اگر تم جانو، تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور (اس طرح) ایک (سفید) جھوٹ گھڑتے ہو۔ خدا کو چھوڑ کر جن لوگوں کی تم عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرتے ہو، وہ یقیناً تمہارے لئے روزی کے مالک نہیں۔ رزق

خدا کے قانون کے مطابق طلب کرو۔ اُسی کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو اور اس کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ تمہارا ہر قدم اس کی طرف اُٹھ رہا ہے (یہی سچائی اور صداقت ہے۔ لیکن) اگر تم اسے جھٹلاتے ہو (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے اور اُمتیں بھی (سچائی کے علمبرداروں کو) جھٹلا چکی ہیں۔ رسولؐ (اور پیغامبر) کے ذمہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ واضح طور پر خدا کے ارشادات پہنچا دے (اور بس!)۔

جلبِ منفعت کے دائرہ میں رزق کو بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ (رزق کے خزانوں کی کنجیاں کس طرح خدائے واحد کے اپنے ہاتھوں میں ہیں، اس کی تفصیل میری کتاب 'نظامِ ربوبیت' میں ملے گی)۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ دعوت الی اللہ کے باب میں ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ....

...... وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ○ (۱۹ــ ۲۹/۲۱)

کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ خدا (پہلی بار اپنی) مخلوق کو (عدمِ محض سے) کس طرح وجود میں لاتا ہے؟ پھر انھیں مختلف مراحل سے بار بار گزارتا ہے۔ ایسا کرنا اس کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ (اے پیغمبر!) تم ان سے کہو کہ زمین میں گھومو پھرو اور دیکھو کہ خدا نے (اپنی) مخلوق کو کس طرح پیدا کیا ہے! پھر (خود ہی تمہاری سمجھ میں آجائے گا کہ) کس طرح حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ درحقیقت خدا تو ہر چیز پر قادر ہے۔ جو شخص چاہتا ہے وہ اسے اپنے قانونِ مکافات کے مطابق عذاب (دُنیوی و اُخروی) میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اُسے سامانِ ربوبیت عطا کر دیتا ہے۔ اور (یاد رکھو) تم اُسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

مبدا و معاد، ابتدا اور انتہا، موت اور حیات، سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو ذاتِ اقدس ان قوتوں کی مالک ہو اس کے سوا کون حافظ و ناصر ہو سکتا ہے؟

وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ز وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ؑ (۲۹/۲۲)

اور (یاد رکھو) تم نہ تو اپنی تمدنی دنیا میں اسے شکست دے سکتے ہو اور نہ ہی خارجی کائنات میں۔ اور خدا کے سوا نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ مددگار!

اس وقت تو فقط اتنا ہے کہ اسلاف سے جذبۂ عقیدت اور سوسائٹی میں ایک دوسرے سے تعلقات کی بناء پر ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ایک روش پر آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہو۔ جب حقائق بے نقاب ہونگے تو تم خود دیکھ لو گے کہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی کی روش کی ذمہ داری کون اپنے سر لیتا ہے اور وقت پڑنے پر اس قسم کے تعلقات کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ جن انسانوں کی خودی خود تراشیدہ بتوں کے سامنے جھک کر اس درجہ کمزور ہو چکی ہو ان کا حال ظاہر ہے۔

وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا .... وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۹/۲۵)

اور (ابراہیم) نے کہا "تم نے خدا کو چھوڑ کر جن (لوگوں کی) مورتیوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، وہ محض اس لئے ہے کہ اس سے تم میں ایک جامعیت کی صورت پیدا ہو گئی ہے، (اس اشتراک سے تم ایک قوم بن گئے ہو)، جس سے تمہیں کچھ دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ مگر جب انقلاب خداوندی آئے گا تو تم دیکھو گے کہ تم میں سے کس طرح ایک دوسرے کے تعلقات سے انکار کرتا ہے اور سب تعلقات چھوڑ کر دور ہٹ جاتا ہے۔ لیکن اس وقت تم سب جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہو گے اور تمہارا کوئی حامی و ناصر نہ ہوگا۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت نوحؑ کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہے۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ...... فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۸۳ — ۳۷/۸۷)

اور (دیکھو) درحقیقت نوح ہی کے گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔ (یاد کرو) جب وہ قلب سلیم لے کر اپنے پروردگار کے حضور متوجہ ہوا اور اس نے اپنے باپ اور اپنی تمام قوم سے کہا کہ تم کن لوگوں کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو؟ (سوچو تو سہی) کیا خدا کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ کے معبودوں (کی اطاعت) کا ارادہ رکھتے ہو؟ پھر تمام جہانوں کے پروردگار کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

اصنام پرستی افک ہے

غور فرمائیے، یہاں بھی اور ۲۹/۱۷ میں بھی اصنام پرستی کو "افک" کہا گیا ہے۔ کتنی عظیم حقیقت کو ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے! یہ عقیدہ

کہ اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ بُت، خدا یا خدا کے مظہر ہیں، ایک خود ساختہ جھوٹ کے سوا اور کیا ہے؟ اور اگر ایسی بے کس و بے بس، عاجز و ناتواں، محتاج و ضعیف ہستیاں اس قابل ہیں کہ انھیں خدا بنا لیا جائے تو کہیئے کہ وہ ذاتِ مطلق جو نہ صرف اپنے آپ کے لئے کسی کی محتاج نہیں بلکہ تمام کائنات اپنی پرورش کے لئے اس کی محتاج ہے، اسے کیا کہا جائے گا؟ خدا شناسی کے متعلق تمہارا قیاس کس قدر غلط ہے؟ تم نے سمجھا ہی نہیں کہ خدا کسے کہتے ہیں اور اس کی قوتیں کیا ہیں؟ اگر اس کے متعلق صحیح اندازہ تمہارے ذہن میں آجاتا تو تم کبھی اپنے شرفِ انسانیت کو اس طرح ذلیل و خوار نہ کرتے!

ستارہ پرستی کے خلاف اندازِ موعظت

اگر قوم کچھ بھی عقل و بصیرت سے کام لیتی تو جس حقیقت کشا انداز سے ان کی گمراہی اور غلط نگہی ان پر واضح کی گئی تھی، وہ اپنے مسلک سے یقیناً ہٹ جاتی۔ لیکن جن آنکھوں پر اسلاف پرستی کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہوں، ان کی سمجھ میں یہ باتیں کیسے آسکتی ہیں؛ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دیکھ کر کہ قوم ایسے اسلوبِ تذکیر و موعظت سے اثر قبول کرنے پر آمادہ نہیں، ایک اور انداز اختیار فرمایا اور محسوسات کے خوگر انسانوں کی غلط بینیوں کا پردہ خود محسوسات کی وادیوں میں چاک کر دیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کی قوم ستارہ پرست بھی تھی۔ انھیں بتانا یہ تھا کہ ستارے اپنی ہستی کی بقا کے لئے خود ایک الگ نظام کے پابند اور اپنی حرکات و سکنات میں یکسر مجبور ہیں۔ اس حقیقتِ مجردہ (ABSTRACT TRUTH) کی تبیین کے لئے نظری دلائل کے بجائے محسوس و مشہود (CONCRETE) طریقِ استدلال کی طرف رجوع کیا گیا۔ سورۂ انعام کے چھٹے رکوع کو دیکھئے اور غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم نے کس قدر دل نشین انداز سے اس حقیقت کا مرقع دیدۂ بینا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۶/۷۴)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا، کیا تم (پتھر کے) بتوں کو معبود مانتے ہو؟ میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر علم و بصیرت کے دروازے کھول کر انھیں

کس طرح اصنام پرستی کی جہالت کی اصل سے آگاہ کر رکھا تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ۝ (۶/۷۵)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو قانونِ کائنات کی عظیم الشان قوتوں کا مشاہدہ کرادیا تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔

یعنی جس طرح وحیٔ الٰہی نے علم و بصیرت کی روشنی میں ان پر دیوی دیوتاؤں کی تماثیل اور اجرام سماوی کے مجسموں کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا، اسی طرح انھوں نے قلبِ سلیم اور عقلِ صحیحہ کی روشنی میں نظامِ کائنات پر غور و خوض سے اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیا کہ کائنات کی تمام اشیاء مع اجرامِ فلکی، خدا کے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں اور خود کسی قوت اور اختیار کی مالک نہیں ہیں۔ اس علم و یقین کے بعد وہ قوم کے پاس گئے، اور، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ان کی غلط روش کے نتائج کو محسوس پیکروں میں ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ رات کی تاریکی چھا گئی۔ وہ لوگ اجرام سماوی کی پرستش کے لئے معبد میں اکٹھے ہوئے۔ اتنے میں ایک کوکبِ درخشندہ لیلائے شب کی پیشانی پر چمکا۔ لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا! یہ ہے (بقول تمہارے) میرا پروردگار! اور پھر خاموشی سے بیٹھ کر ان کے

اجرامِ فلکی کی نظر فریب تابناکیاں

تذلل و تعبد کے مظاہروں کو دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ ستارہ اپنے وقتِ معین پر تاریکی کے پردہ میں چھپ گیا، تو اب آپ نے انھیں مخاطب کیا اور کہا کہ یہ ستارہ جو شعلۂ مستعجل کی طرح دم بھر کے لئے چمکا اور پھر ختم ہو گیا کیا یہ اس قابل ہے کہ اسے خدا مانا جائے؟ تمہاری جہالت اسے گوارا کرے تو کرے، میری بصیرت اس کھلی ہوئی ضلالت کو کیسے قبول کر سکتی ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۝ (۶/۷۶)

پھر جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی، تو اس نے (آسمان پر) ایک کوکب (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا، کیا یہ میرا پروردگار ہے؟ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا، نہیں! میں انھیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔

اتنے میں ظلمتِ شب کا دروازہ کھلا اور چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ بار ہوا۔ قوم پھر سجدہ میں گر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا! وہ نہیں؛ بلکہ تم کہتے ہو کہ یہ میرا پروردگار ہے؟ تو اب اس کا حال بھی دیکھ لو! اور جب اس کی کشتیٔ سیمیں نیل کے دریا میں اپنی منزل قطع کر کے کسی خاموش دنیا میں روپوش ہو گئی تو فرمایا کہ اس میں کچھ شبہ نہیں اگر میرے اللہ نے مجھے ہدایت کی راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں بھی انہی میں سے ہوتا جو ان مجبور ہستیوں کو خدا مان رہے ہیں۔ میں انہی میں پیدا ہوا تھا، اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی تھی۔ تو یہ فقط اللہ کی ہدایت ہے کہ مجھ پر ان کی اس غلط روش کی حقیقتیں یوں بے نقاب ہو رہی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ (۶/۷۷)

پھر جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم نے کہا، اچھا! یہ میرا پروردگار ہے؟ جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ اگر میرے پروردگار نے مجھے حقیقت کی راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اسی گروہ میں سے ہوتا جو راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے۔

اب اس کے بعد صبح نمودار ہوئی اور مہرِ عالمتاب، نور و حرارت کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے پر چھا گیا۔ انھوں نے دن بھر اس کے عروج و زوال کا بھی تماشا دیکھا اور جب شام کو وہ بھی کہیں روپوش ہو گیا تو آپ نے اپنی قوم سے کہا کہ اب اس سے بڑا خدا تمہارے ہاں اور کوئی نہیں۔ یہی تھا نا سب سے بڑا؟ اس کا بھی حشر دیکھ لو! بھلا کہو کہ میں تمہاری اس مشرکانہ روش میں کس طرح شریک ہو جاؤں؟ میں اس سے کنارہ کش ہوں۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (۶/۷۸)

پھر جب صبح ہوئی اور سورج چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم نے کہا یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے؟ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا، اے میری قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اس سے میں بیزار ہوں۔

قوم نے کہا کہ اگر آپ ان خداؤں سے بیزار ہیں اور ان کی پرستش سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو وہ کون سا

معبودِ حقیقی خدا ہے جس کی طرف آپ رجوع کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں ارض وسمٰوٰت کی ان تمام فناپذیر ہستیوں سے مُنہ موڑ کر اس خدائے حیّ و قیوم کی طرف رُخ کرتا ہوں جس نے ارض وسمٰوٰت کو پیدا کیا ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۚ (۶/۷۹)

میں نے تو ہر طرف سے مُنہ موڑ کر صرف اُسی ہستی کی طرف اپنا رُخ کر لیا ہے جو (کسی کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ) آسمان و زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے حکم و قانون پر تمام آسمانی اور زمینی مخلوقات چل رہی ہیں) اور میں ان میں سے نہیں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں!

اس پر انھوں نے، جیسا کہ ظاہر ہے، دھمکی دی ہوگی کہ تم ہمارے معبودوں کی شان میں گستاخی کر رہے ہو! ان کے غصّے سے ڈرو! یہ تباہ کر کے رکھ دیں گے! ایک خدا پرست پر بھلا ان دھمکیوں اور توہّم پرستیوں کا کیا اثر! آپ نے فرمایا!

وَ كَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ ...... وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۚ (۸۱ — ۶/۸۲)

میں ان ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنھیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لئے اس نے کوئی سند اور دلیل تم پر نہیں اتاری؟ بتلاؤ! ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوئی اگر علم و بصیرت رکھتے ہو۔ جن لوگوں نے خدا کو مانا اور اپنے ماننے کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، تو انہی کے لئے امن ہے اور وہی ٹھیک راستے پر ہیں۔

ذرا ان حقائق پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے۔ علم و بصیرت کے کتنے عظیم اسرار و غوامض ہیں جو ایک سادہ سی بات کے اندر مضمر ہیں۔ فرمایا کہ ایک تم ہو کہ تمہارے پاس اپنے مسلک کے جواز میں کوئی دلیل نہیں اور ایک وہ ہیں جن کے پاس علم و ایقان کی محکم قوتیں ہیں۔ سوچو کہ ان دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق ہے جو امن و سلامتی کی راہ پر ہے۔ علم و بصیرت کی روشنی میں چلنے والا یا جہالت و توہّم پرستی

کی تاریکی میں اندھوں کی طرح ٹکریں مارنے والا ؟ کتنی بلیغ حقیقت ہے جو چند الفاظ میں سمو دی گئی ہے۔

یہ تھی وہ دلیلِ محکم جو حضرت ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلے میں خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ (۶/۸۳)

اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے درجے بلند کرنا چاہتے ہیں (اسے علم و دلیل پر مبنی بصیرت دے کر) بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے۔

یوں خدائے حکیم و علیم، علم و حکمت کی نعمتیں عطا کر کے ظلمت و جہالت کی پستیوں میں گرے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں اپنے بندوں کے مدارج بلند کرتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس واقعۂ جلیلہ کے متعلق قرآنِ کریم کا بیان ختم ہوا۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض لوگ جو قرآنِ کریم کے اس معجزانہ طریقِ بیان اور حضرت ابراہیمؑ کے اس مخصوص طریقِ استدلال کی حقیقت کو نہیں پہچانتے وہ اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ (معاذ اللہ) حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ، چاند اور سورج کو کچھ وقت کے لئے اپنا پروردگار سمجھ لیا تھا اور ان کے غروب ہونے کے بعد ان کی معبودیت سے بیزاری ظاہر کی تھی۔ یہ غلط فہمی اپنے بطلان کے لئے کسی خاص دلیل و برہان کی محتاج نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، نبی، منصبِ نبوّت و رسالت کے لئے مشیّت کے پروگرام کے ماتحت شروع ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ان امور میں جو حقیقت کے خلاف ہوتے ہیں، اپنے ماحول اور وراثت کے اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا کہ ایک نبی، حکما و عقلا کی طرح، ذاتی تجارب و مشاہدات کی ٹھوکروں کے بعد استقرائی طور پر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے، حقیقتِ نبوّت سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ نبوّت اکتسابی ملکہ نہیں جسے تجارب و مشاہدات سے حاصل کیا

جائے۔ وہ خدا کی موہبتِ عظمیٰ ہے جس کا نزول قلبِ رسالتمآبؐ پر ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ (معاذ اللہ) کواکب پرستی کے شرک کے بعد توحید کی طرف آئے تھے اتنی بڑی جسارت ہے جس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ خود قرآنِ کریم نے جس انداز و ترتیب سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے وہ اس پر شاہد ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) اعترافِ کواکب پرستی کا بیان نہیں بلکہ قوم کے سامنے حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا ایک مؤثر انداز ہے جس میں نظری دلائل کے بجائے عینی مشاہدہ کے طریقہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ واقعہ کی ابتدا بُت پرستی کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کے اعتراض سے ہوتی ہے (دیکھئے ۶/۷۴)۔ اس کے بعد وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۶/۷۵) سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ ملکوتِ ارض و سمٰوٰت (نظامِ ارضی و سماوی) کے متعلق مقامِ علم و یقین تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد اصل واقعہ فَلَمَّا سے شروع ہوتا ہے جو دونوں آیتوں کے باہمی تعلق کی ایک محکم کڑی ہے، یعنی پہلے نظامِ ارضی و سماوی کے رازہائے سربستہ حضرت ابراہیمؑ پر منکشف کئے گئے اور اس کے بعد (فَلَمَّا) یہ واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی آخری آیت (۶/۷۸) میں ارشاد ہے کہ جب سورج بھی ڈوب گیا تو قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ قوم سے تخاطب اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ یہ باتیں اپنی قوم کو سمجھا رہے ہیں، سورج چاند اور ستاروں کے حالات پر غور کر کے (معاذ اللہ) اپنے شرک سے تائب نہیں ہو رہے۔ اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ آیت ۸۰ میں ارشاد ہے وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ آپ کی قوم نے آپ سے جھگڑا شروع کر دیا۔ یہ ٹکڑا پکار پکار کر خود کہہ رہا ہے کہ سارا معاملہ قوم کے ساتھ پیش آیا تھا اور پھر آخری آیت (۶/۸۳) نے تو اس معاملہ کو بالکل شک و شبہ سے بلند کر کے رکھ دیا ہے جہاں فرمایا کہ وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ یہ وہ دلیلِ محکم (حجت) و برہانِ قاطع تھی جو ہم نے (خود اللہ تعالیٰ نے) قوم کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمائی تھی۔ یعنی یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور دلیل و حجت پیش کیا گیا تھا۔ اب اس کے بعد معلوم نہیں کونسی چیز مبہم رہ جاتی ہے جو ذہن کو حضرت ابراہیمؑ کی (معاذ اللہ) ستارہ پرستی کی طرف منتقل کرائے بجز اس کے کہ اسرائیلیات کے تتبع میں ہمارے بعض مفسرین نے ایسا لکھ دیا ہے۔

بُت شکنی کا واقعہ

لطیف نظری دلائل کے بجائے محسوس عینی مشاہدات سے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اب دوسرا واقعہ سامنے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اصنام پرستی کے خلاف جو حقیقت کشا دلائل پیش کئے تھے ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ جب قوم نے ان پر کان نہ دھرا تو اس باب میں بھی حضرت ابراہیمؑ نے دوسرا طریق استدلال اختیار کیا۔ یہ واقعہ قرآن کریم نے دو مقامات پر بیان کیا ہے۔ ایک سورۂ انبیآ۔ اور دوسرے صٰٓفّٰت۔ سورۂ انبیاء کے پانچویں رکوع کو دیکھئے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَۚ

(۲۱/۵۱)

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کے مقام کے مطابق سمجھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور ہم اس کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔

اس کے بعد وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ مٹی کی مورتیاں کون سے اختیار و اقتدار کی مالک ہیں جو تم انہیں اپنا معبود بنائے بیٹھے ہو؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ان مورتیوں کی عبادت کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلی آرہی ہے، یعنی اُن کے تقدس اور الوہیت اور قوم کے مسلک کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ اس روش کو اسلاف کی سند حاصل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ کیا تم اور کیا تمہارے آباء و اجداد، سب کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ٥ (۲۱/۵۴)

ابراہیم نے کہا یقین کرو، تم خود بھی اور تمہارے باپ دادا، سب صریح گمراہی میں پڑے ہو۔

قوم کی ذہنیت اس درجہ مفلوج ہو چکی تھی کہ وہ سراپا استعجاب تھے کہ یہ نوجوان بالآخر کہتا کیا ہے! یہ "تقدس اور اُلوہیت کے مجسمے عاجز و درماندہ ہیں!" تم اور تمہارے آباء و اجداد سب کھلی ہوئی گمراہی میں ہو!! انہوں نے کہا کہ کیا تم یہ سب کچھ سچ مچ (SERIOUSLY) کہہ رہے ہو یا محض بطور تفنن طبع؟

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ٥ (۲۱/۵۵)

اس پر انہوں نے کہا، تو ہم سے سچ مچ کہہ رہا ہے یا مزاح کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اگر یہ بات اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی کہ یہ بُت مجبور و درماندہ ہیں اور اُن میں کسی قسم کی کوئی قدرت نہیں تو

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ٥ (۲۱/۵۷)

بخدا! میں ضرور تمہارے ان بُتوں کے خلاف ایک تدبیر کروں گا، جب تم سب پیٹھ پھیر کر چل دو گے۔

پھر دیکھوں گا یہ بُت کس طرح اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں یا مجھ پر کوئی آفت ڈھا دیتے ہیں؟ لوگوں نے ان کی یہ بات ایک کان سے سُنی اور دوسرے کان سے نکال دی۔ ان کے دل میں ان بتوں کی عظمت و تصرف کی عقیدت اس قدر گہری تھی کہ یہ بات ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص ان کی طرف انگلی بھی اُٹھا سکتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کو تو ان عقل کے اندھوں کو دکھا دینا تھا کہ یہ پتھر کی مورتیاں کس درجہ بے بس ہیں۔ معبد خالی ہوا تو انہوں نے موقع پا کر ایک ایک بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور سب سے بڑے بُت کو اسی طرح رہنے دیا کہ (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا)۔ اس سے یہ تدبیر زیادہ نتیجہ خیز ہوگئی۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ٥ (۲۱/۵۸)

چنانچہ (اُس نے ایسا ہی کیا) اُس نے بُتوں کو توڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف ایک بُت جو ان میں بڑا سمجھا جاتا تھا، چھوڑ دیا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

مَعْبَد میں کُہرام مچ گیا

ذرا تصور میں لائیے اس نظارہ کو کہ جب ان بتوں کے پرستار معبد میں واپس آئے ہوں گے تو اُن کی حالت کیا ہوگی۔ غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہوا جس میں ہر طرف سے یہ آواز سنائی دی کہ

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۲۱/۵۹)

انھوں نے کہا "ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟ (جس کسی نے کی ہو) وہ بڑا ہی ظالم ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کہ دیکھو میں ان بُتوں سے کیا کرتا ہوں پجاریوں کی مخصوص جماعت کے سامنے کیا ہوگا اور عوام اس سے باخبر نہ ہوں گے۔ اس لئے عوام یقینی طور پر نہیں جانتے تھے کہ یہ کس کا کام ہے اور پجاری اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ مبادا اس سے عوام

بگڑ بیٹھیں کہ جب تمھیں یہ چیلنج دے دیا گیا تھا تو تم معبد کی حفاظت سے اس قدر غافل کیوں ہو گئے۔ لیکن عوام کو یقینی طور پر علم ہو یا نہ ہو، بت پرستی کے متعلق حضرت ابراہیمؑ کا مسلک (ATTITUDE) تو سب پر واضح تھا۔ اس لئے نگہ قیاس انہی کی طرف اٹھ سکتی تھی۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ؕ (۲۱/۶۰)

چند آدمیوں نے کہا " ہم نے ایک نوجوان کو اُن کے بارے میں کچھ کہتے سنا تھا۔ اسے ابراہیم کہہ کر پکارتے ہیں۔"

پجاریوں نے کہا کہ

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ (۲۱/۶۱)

انہوں نے کہا۔" اسے یہاں تمام آدمیوں کے سامنے بلا لاؤ تاکہ سب گواہ رہیں۔

جب حضرت ابراہیمؑ تشریف لائے تو اُن سے پوچھا گیا۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ؕ (۲۱/۶۲)

ان لوگوں نے ابراہیم سے کہا ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی؟

واقعہ اپنی انتہائی نزاکت تک پہنچ چکا تھا۔ اب وقت تھا کہ جس غرض کے لئے یہ تدبیر عمل میں لائی گئی تھی، اسے قوم کے سامنے لایا جائے۔ اگر پجاریوں کے اس سوال کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ دیتے کہ میں نے تو پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ میں ایسا کروں گا تو اصل مقصد پیچھے سرک جاتا۔ آپ نے ان پجاریوں سے یہ کہا کہ تمہارا تو یہ دعوے ہے کہ بُت تمھیں غیب کی خبریں سُنا دیا کرتے ہیں اور اسی دعوے کی بنا پر تم عوام کو دھوکے میں رکھ کر اُن پر تم اپنی خدائی کا سکہ جمائے رکھتے ہو۔ اگر یہ سچ ہے کہ یہ بُت تمہیں لوگوں کے دلوں کی باتیں بھی بتا دیا کرتے ہیں اور آنے والے واقعات تک سے بھی مطلع کر دیا کرتے ہیں، تو یہ سب سے بڑا بُت " خداؤں کا خدا " تمہارے سامنے موجود ہے۔ ذرا اس سے پوچھو کہ یہ کیا ہوا ہے؟

بات سمجھانے کا نیا انداز

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ؕ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا

يَنْطِقُوْنَ ۝ (۲۱/۶۳ — ۶۲)

ان لوگوں نے ابراہیم سے کہا ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟
ابراہیم نے کہا جس نے یہ کیا، تم اس کی بابت مجھ سے پوچھنے کی بجائے انہی بتوں سے پوچھو۔
اور ان میں سے بھی اس سے جو اُن میں سب سے بڑا ہے۔ اگر بت بول سکتے ہیں تو تمہیں
جواب دیدیں گے[1]

اس سوال و جواب پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیجئے کہ آگے چل کر اس کے متعلق ایک اہم حقیقت سامنے آئے گی۔
بات بالکل صاف ہے کہ یہ ایک الزامی حجت تھی۔ پجاریوں سے یہ مخفی نہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ ہی نے یہ
حرکت کی ہے اس لئے کہ آپ نے علی الاعلان ایسا کہا تھا۔ اس جواب سے بیک وقت دو کام ہو گئے۔
ایک طرف تو عوام پر ان بُتوں کی عجز و درماندگی آشکارا ہو گئی اور دوسرے پجاریوں کی اس ابلہ فریبی کا پردہ بھی
چاک ہو گیا کہ یہ بُت انہیں تمام باتوں سے آگاہ کر دیا کرتے ہیں۔ پجاریوں پر یہ زد ایسی پڑی کہ حواس گم ہو گئے
اور چپکے سے ایک طرف جا کر

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۲۱/۶۴)

تب وہ آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ بات تو یہ ٹھیک کہتا
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ہی ناحق پر ہیں۔

لیکن حضرت ابراہیمؑ ان کے جواب کے انتظار میں تھے۔ وہ سامنے آئے تو ندامت سے سر جھکائے ہوئے۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ

(۲۱/۶۵)

پھر وہ اس حال میں پڑ گئے کہ (شرم و خجالت سے اس کا سر جھکے ہوئے تھے وہ اس سے کہنے لگے
کہ تم ہمیں رسوا کرنے کے لئے اس قسم کے سوالات کر رہے ہو، ورنہ تمہیں خود معلوم ہے کہ
یہ بت بات نہیں کیا کرتے۔

ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور فرمائیے کہ لَقَدْ عَلِمْتَ ...... حضرت ابراہیمؑ سب سے بڑے پجاری کے

---

[1] ان الفاظ کا ایک اور بھی مفہوم ہے جسے استدراک کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

بیٹھے تھے اس لئے گھر کے بھیدی پجاریوں نے آپ سے کہا کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ یہ بت لولا نہیں کرتے. ان کی نسبت جو کچھ ہم نے مشہور کر رکھا ہے فقط دامِ فریب ہے. اب جو پجاری یوں خاسر و نادم ہوئے

اصل حقیقت

تو حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اور عوام کو مخاطب کر کے للکارا اور کہا کہ یہ واقعہ تمہارے سامنے ہے. کچھ بت تو یہ ٹوٹے پڑے ہیں. ان میں سے کسی میں یہ طاقت نہ ہوئی کہ اپنے آپ کو بچا سکتا اور یہ سب سے بڑا "خدا" بت بنا سامنے کھڑا ہے. یہ نہ ان چھوٹے خداؤں کی حفاظت کر سکا نہ مجھ پر ہی اپنا عتاب نازل کر سکا اور نہ اب ان پجاریوں کو ہی کچھ بتاتا ہے۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ۝ (۲۱/۶۶).

اس نے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود اختیار کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

یہ ہیں تمہارے خدا؟

اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۱/۶۷)

کس قدر قابلِ افسوس ہے تمہاری حالت اور اُن کی بھی جنہیں تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل کورے ہو گئے؟

حجت کا اتمام ہو گیا. وہی حقیقت جو اس سے پہلے لطیف اشاروں میں سمجھائی جاتی تھی اب محسوس شکل میں سامنے لائی گئی. لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ پجاریوں نے اپنی مٹتی ہوئی عظمت کو بچانے کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا! انہوں نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا اور خوب بھڑکایا اور چلا کر کہا کہ

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (۲۱/۶۸)

انہوں نے (آپس میں) کہا اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

وہی استبداد کے ابلیسانہ حربے جو حق و صداقت کی آواز کو دبانے کے لئے شروع سے آج تک استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں! وہ لوگوں کے جذبات کو اس طرح مشتعل کر رہے تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ کی (خدا کی طرف سے دی ہوئی راہ نمائی کے مطابق) یہ تدبیر تھی کہ ان کے غصے کی آگ بھڑکنے نہ پائے اور

ابراہیمؑ کے حق میں امن وسلامتی کا موجب بن جائے۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى
اِبْرٰهِيْمَ ۙ (۲۱/۶۹)

چنانچہ آخرالامر ہوا یہ کہ

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۚ (۲۱/۷۰)

وہ اس کے خلاف اپنی تدبیر کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا کیا کہ وہ اپنے ارادے میں ناکام رہ گئے (اور ہم ابراہیم کو وہاں سے نکال کر لے گئے ۳۷/۹۸)۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ابھی اس کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کو پکڑ کر زندہ جلا دیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ وہاں سے محفوظ طور پر نکل گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)۔

باندازِ دگر | یہ تھا سورۂ انبیاء کا بیان۔ سورۂ صٰفّٰت میں بھی یہی واقعہ مذکور ہے لیکن تھوڑی سی تمہیدی تفصیل کے ساتھ۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۘ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۚ
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۚ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ
اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۚ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳۷/۸۳-۸۷)

اور نوح ہی کے گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔ (یاد کرو) جب وہ قلبِ سلیم لے کر اپنے پروردگار کے حضور متوجہ ہوا، وہ اپنے باپ اور اپنی تمام قوم سے ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ "تم کن چیزوں کی عبودیت اختیار کر رہے ہو؟ (سوچو تو سہی) کیا خدا کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ کے معبودوں کی اطاعت کرتے ہو۔ پھر تمام جہانوں کے پروردگار کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ان آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کو بت پرستی سے روکنے کی کوشش کرتے رہتے

---

[1] (وہ ابراہیمؑ کے خلاف عداوت اور انتقام کی آگ اس طرح بھڑکا رہے تھے) اور ہم ایسا انتظام کر رہے تھے کہ اس آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں اور وہ ابراہیمؑ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں۔

تھے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وہ بُت پرستی کے خلاف ہی نہیں ستارہ پرستی کے خلاف بھی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ۝ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝ (۳۷/۹۰-۸۸)

وہ ان کے معبود ستاروں میں طرح طرح کے نقائص نکال کر انہیں سمجھاتا اور ان سے کہتا کہ میں تمہاری ان باتوں سے سخت نالاں ہوں اور ان معبودوں سے سخت بیزار۔ وہ اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکتے اور مُنہ پھیر کر چل دیتے۔

اس کے بعد وہی "بُت شکنی" کا واقعہ سامنے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک مرتبہ دیکھا کہ مَعبد خالی ہے۔ وہ اندر جا گھسے۔ دیکھا کہ بتوں کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں بطور چڑھاوا رکھی ہیں۔ ان سے طنزاً کہنے لگے کہ:۔

أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنطِقُونَ ۝ (۳۷/۹۲-۹۱)

تم انہیں کھاتے نہیں؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم کچھ بولتے بھی نہیں۔

اس کے بعد۔

تیشۂ ابراہیمی

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝ (۳۷/۹۳)

پھر اپنے دائیں ہاتھ سے (یعنی پوری قوت کے ساتھ) ان پر ایک ضرب رسید کی (اور انہیں توڑ ڈالا)۔

لوگوں کو جب معلوم ہوا تو بھاگے ہوئے معبد کی طرف آئے۔

فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ۝ (۳۷/۹۴)

پھر (جب لوگوں کو معلوم ہوا تو) وہ ابراہیم کی طرف دوڑے ہوئے گئے۔

باقی تذکرہ سورۂ انبیاء میں (پہلے) گزر چکا ہے۔ انکشافِ حقیقت کے بعد آپ نے فرمایا:۔

قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۝ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝

(۳۷/۹۶-۹۵)

ابراہیم نے کہا کیا تم ان بتوں کی پرستش کرتے ہو جنہیں (اپنے ہاتھوں سے) تراشتے ہو. حالانکہ خدا نے ہی تمہیں پیدا کیا ہے اور (تمہارے اُن تمام افعال کو بھی) جو کچھ تم کرتے ہو.

اس پر غم و غصہ کا طوفان اُمنڈا اور انہوں نے کہا.

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ٥ (۳۷/۹۷)

لوگوں نے کہا (بس بہت ہو چکی. اب) اس کے واسطے ایک آتش خانہ بناؤ اور اسے دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دو.

اس کے بعد کیا ہوا، اسے ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا. اس دوران میں ایک اور DEVELOPMENT ہو گئی. پہلے اسے دیکھ لیجئے.

بادشاہ سے بحث

دعوتِ ابراہیمیؑ کا تذکرہ آگے بڑھا. بات ایسی نہ تھی جو چھپی رہ جاتی. اُسے بادشاہِ وقت تک پہنچا یا گیا. اس زمانہ کے مطلق العنان بادشاہ ایکسر استبداد کے مجسمے. اُسے دعوتِ توحید میں، دیوتاؤں کی خدائی سے زیادہ خود اپنی خدائی کے چھن جانے کا خوف تھا. حضرت ابراہیمؑ کو بلایا اور خدائے واحد کے بارے میں بحث و جدل شروع کر دی. سورۂ بقرہ کے پینتیسویں[۳۵] رکوع میں ہے.

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ م (۲/۲۵۸)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس کے پروردگار کے بارے میں حجت کی تھی کہ خدا نے اُسے بادشاہت دے رکھی تھی؟ (یعنی تاج و تختِ شاہی نے اس کے اندر ایسا گھمنڈ پیدا کر دیا تھا کہ خدا کے بارے میں حجت کرنے لگا تھا).

بادشاہ نے پوچھا کہ تم غیر اللہ کی پرستش چھڑا کر جس خدا کی طرف دعوت دیتے ہو اس خدا کی خصوصیات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا.

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ لا (۲/۲۵۸)

ابراہیم نے کہا میرا پروردگار وہ ہے جس کے قانون کے مطابق موت اور زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اس کے جواب میں اُس سرکشی وطغیان کے پیکر نے اپنی شانِ نمرودیت سے کہا کہ اس کا کیا ہے؟

قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ (۲/۲۵۸)

میری مملکت میں موت اور زندگی کے فیصلے میرے حکم سے ہوتے ہیں۔

یہاں پھر وہی بات سامنے آئی جس کا تجربہ قوم کی طرف سے ہو چکا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دلیل بڑی لطیف وعمیق تھی۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ محسوسات کے بت کدہ میں گھرا ہوا بادشاہ حقیقت کو مجاز کا نقاب اوڑھا کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ آپ چاہتے تو اس دلیل کی رَو میں بیس دلیلیں پیش کر دیتے۔ لیکن وہاں پیشِ نظر "مناظرانہ فتح مندی" نہ تھی، مقصد احقاقِ حق تھا۔ چنانچہ آپ نے اس دلیل کو چھوڑ کر جس کے تعاقب سے نظری بحث میں اُلجھ کر اصل مقصد سے دُور نکل جانے کا خطرہ تھا، فوراً محسوس طریقِ استدلال اختیار کیا اور فرمایا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (۲/۲۵۸)

اچھا اگر ایسا ہی ہے (کہ تمہاری مملکت میں سب کچھ تمہارے حکم سے ہوتا ہے) تو اللہ سورج کو پورب کی طرف سے (زمین پر) طلوع کرتا ہے تم پچھم سے نکال کر دکھاؤ۔

جواب نہ بن پڑا

یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تم خدائی قوتوں کے مالک ہو تو لاؤ سورج کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کس قدر اختیارات حاصل ہیں۔ اس تحدّی کا جواب کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے۔

فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ (۲/۲۵۸)

وہ (بادشاہ) جس نے انکار کی راہ اختیار کر رکھی تھی اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔

لیکن اس کے باوجود اُسے اعترافِ حقیقت کی جرأت نصیب نہ ہوئی کیونکہ اس سے اپنی جھوٹی عزت وعظمت پر حرف آتا تھا اور "خدائی" کی جگہ "بندگی" اختیار کرنی پڑتی تھی۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جب اس قوم کے احبار و رہبان حضرت ابراہیمؑ کے مسکت دلائل اور

مسکت عینی شہادات کے سامنے لاجواب ہو گئے تو بجائے اس کے کہ اعترافِ حقیقت کر لیتے انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور تجویز کیا کہ آپ کو زندہ آگ میں ڈال دیا جائے کیونکہ ان کے نزدیک بتوں کی توہین اور مسلکِ بت پرستی سے بغاوت، جرمِ عظیم تھا اور ایسے جرائم کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ مجرم کو زندہ نذرِ آتش کر دیا جائے۔ سورۃ ضٰفّٰت میں ہے۔

تمرّد کی آگ

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ ؁ (۳۷/۹۷)

لوگوں نے کہا (بس بہت ہو چکی۔ اب) اس کے لئے ایک آتش خانہ بناؤ اور دہکتی ہوئی آگ میں اسے ڈال دو۔

انہوں نے یہ تدبیر کی لیکن اللہ تعالےٰ نے اسے خاک میں ملا دیا اور وہ اپنے مشئوم ارادوں میں خاسر و نامراد رہے۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ؁ (۳۷/۹۸)

چنانچہ انہوں نے اس کے ساتھ ایک منصوبے کا ارادہ کیا مگر ہم نے انہیں ہی نیچا دکھا کر چھوڑا (کہ ان کی تمام تدبیریں خاک میں ملا دیں)۔

دیکھئے، یہاں پھر فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا کہا ہے، یعنی انہوں نے ابراہیمؑ کے خلاف اس منصوبے کا ارادہ کیا تھا، سچ مچ انہیں آگ کی بھٹی میں نہیں ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی اپنی تدبیروں ہی میں لگے ہوئے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اس مقام سے ہجرت فرما کر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔

وَ قَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ؁ (۳۷/۹۹)

ابراہیم نے کہا میں اس مقام کو چھوڑ کر وہاں جا رہا ہوں جہاں اس نظامِ ربوبیتِ خداوندی کی تشکیل کے لئے حالات زیادہ سازگار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار وہاں میرے لئے بہت جلد کشادگی کی راہیں کھول دے گا۔

سورۂ عنکبوت میں ہے:۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؁ (۲۹/۲۴)

پس اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب ہی نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے کہ ابراہیم کو قتل کردو،
یا (زندہ) جلادو۔ اللہ نے اُسے آگ سے بچا لیا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے
جو ایمان لاتے ہوں (بڑی بڑی) نشانیاں (پنہاں) ہیں۔

اس واقعہ کو سورۃ انبیاء میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (۲۱/۶۸)

انہوں نے (آپس میں) کہا اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلادیں
اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

اس کے بعد ایک آیت چھوڑ کر کہا۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ (۷۱-۷۲/۲۱)

اور دیکھو ہم نے اُسے اور (اُس کے بھتیجے) لوط کو (دشمنوں سے) نجات دلا کر ایک ایسے ملک
میں پہنچا دیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنایا ہے (یعنی سرزمین کنعان) اور
(پھر) ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحٰق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے
نیک کردار بنایا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی سلامتی

ان مقامات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سرکش و متمرد قوم نے اپنے جوشِ انتقام میں یہ منصوبہ باندھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ کے انبار میں ڈال دیا جائے تاکہ ان کے معبود روز روز کی تحقیر و تذلیل سے محفوظ رہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالتے آپ حکمِ خداوندی کے مطابق، وہاں سے چپکے سے ہجرت کر گئے اور یوں وہ قوم اپنے ارادوں میں ناکامیاب رہی۔ جس طرح، جب اہلِ مکہ نے یہ سازش کی کہ نبئ اکرمؐ کو رات کی تاریکی اور خاموشی میں قتل کر دیا جائے، تو آپؐ نے بحکمِ خداوندی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور یوں قریش کے خفیہ منصوبے خاک میں مل گئے۔

ہجرت

توریت کے صفحات میں ہم حضرت ابراہیمؑ کو مع ان کے برادر زادہ (حضرت لوطؑ) اور آپ کی حرمِ محترمہ (حضرت سائرہ) کے مصر تک سفر کرتے دیکھتے ہیں جہاں کے بادشاہ نے

اپنی بیٹی (حضرت ہاجرہؓ) کو آپ کے عقد میں دیا۔ اس کے بعد آپ نے فلسطین (کنعان) میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ قرآنِ کریم میں اس ہجرت کے متعلق کئی ایک مقامات پر ذکر آیا ہے۔

سورۂ مریم میں ہے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝ (۴۸—۱۹/۵۰)

پھر جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور ان سب سے جنہیں وہ اللہ کے سوا معبود مانتے تھے، الگ ہو گیا تو ہم نے (اس کی نسل میں برکت دی اور) اسے اسحٰق اور (اسحٰق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی اور اپنی بخشش کی رحمت سے سرفراز کیا تھا۔ نیز ان سب کے لئے سچائی کی صدائیں بلند کر دیں (جو کبھی خاموش ہونے والی نہیں)۔

سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝.....

..... نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ (۷۱—۲۱/۷۲)

ہم نے اسے اور (اس کے بھتیجے) لوط کو دشمنوں سے نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچا دیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنا دیا (یعنی سرزمینِ کنعان) اور (پھر) ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحٰق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے عمدہ صلاحیتوں کا مالک بنا دیا تھا۔

سورۂ عنکبوت میں آگ سے محفوظ رکھنے کے بعد کہا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۲۶—۲۹/۲۷)۔

چنانچہ لوطؑ اس پر ایمان لایا اور ابراہیمؑ نے کہا، میں اپنے پروردگار (کی بتائی ہوئی سرزمین)

کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بلا شبہ وہ (ہر چیز پر) غالب اور (ہر کام میں) حکمت والا ہے۔
اور ہم نے اُسے اسحٰق اور یعقوب (جیسا بیٹا اور پوتا) عطا کیا اور اس کی اولاد میں (قیامت تک کے لئے) نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو (قائم) کر دیا اور ہم نے دنیا میں بھی اُس (کے نیک اعمال) کا اجر اسے دے دیا (کہ تمام عالمِ انسانی کا اُسے امام بنا دیا) اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آخرت میں بھی صالحین میں سے ہوگا۔

"اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ" کے ٹکڑے پر غور فرمایئے۔ سورۃ صٰفّٰت میں اسی روح کو دوسرے الفاظ کا پیکر عطا ہوا ہے جہاں فرمایا۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (۳۷/۹۹)

اس نے کہا کہ میں "اپنے رب کی طرف" جاتا ہوں۔ وہ مجھ پر کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کھول دے گا۔

ہجرت کا مفہوم و مقصود

اس ترکِ وطن کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ دعوتِ حق و صداقت کی راہ میں اس قدر زہرہ گداز اور جگر شگاف آزمائشوں سے (معاذاللہ) مُنہ موڑ کر چل دیئے بلکہ خدا کے حکم سے، خدا کی راہ میں مزید سعی و کاوش کی غرض سے ایک مساعد ماحول اور تخم گیر اور بار آور سر زمین کی طرف ہجرت فرمائی۔ حضرات انبیاء کرامؑ کے اسوۂ مقدسہ میں ہجرت ایک عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے جس کے اندر ملّتِ حنیفہ کے لئے ایک بصیرت افروز اور حیات آور پیغام مضمر ہے۔ نظامِ خداوندی کا داعی بہر حال ایک خاص مقام میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں کے رہنے والے اس کے پیغام کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی فضا کو اس نظام کے لئے سازگار بنائے۔ لیکن جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ فضا کی کثافتیں ایسی محکم ہو چکی ہیں کہ ان کا تنزیہ ناممکن ہے، تو بجائے اس کے کہ وہ اس نامساعد ماحول میں زندگی بسر کرنے پر اپنے آپ کو مجبور سمجھ لے، وہ اس ماحول کو چھوڑ کر کسی ایسی سر زمین کی طرف ہجرت کر جاتا ہے جہاں اس نظامِ الٰہیّہ کے قیام و بقا کے لئے زیادہ امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ ہے خاکِ وطن اور ایمانِ مومن کا باہمی تعلق۔ مردِ مومن پابہ گِل نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ کسی خاص سر زمین میں پیوست ہو کر رہ جائے۔ وہ آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ جہاں اُسے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے انسانوں کی غلامی پر مجبور کیا جائے، وہ خدا کے ارض و

سمٰوٰت کی اس فضائے بسیط میں بال کشا ہو اور جہاں اُسے خالص اللہ کی محکومیت کے لئے فضا سازگار نظر آئے سکونت پذیر ہو جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است　　　　این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است　　　　ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است

اگر آپ کسی ایسے کمرے میں بیٹھے ہوں جہاں کوئلہ کی گیس آہستہ آہستہ ساری فضا کو زہر آلود کئے جا رہی ہے تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ جلدی سے کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان کھول دیئے جائیں۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ وہ اس طرح سے بند ہیں کہ آپ کی کوشش سے کھل نہیں سکتے تو آپ اطمینان سے کمرے میں نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ پوری قوت سے دروازہ توڑ کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل جانے کی کوشش کرینگے تاکہ کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ یہ انسان کا طبیعی تقاضا ہے۔ اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ حتّٰی کہ پرندوں اور مویشیوں تک کی یہ حالت ہے کہ جب کسی ایک ماحول میں ان کی ضروریاتِ زندگی کے سامان مفقود یا اس کی فضا نامساعد ہو جاتی ہے تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ طبیعی تقاضوں کے ماتحت رونما ہوتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) انسان کی زندگی فقط حیوانی (طبیعی) زندگی نہیں۔ اس سے آگے، انسانی زندگی اور اس کے تقاضے بھی ہیں جن انسانوں کو اس انسانی زندگی کا احساس ہوتا ہے، ان کے نزدیک کسی ایسی فضا میں سانس لینا، جہاں غیر اللہ کی حکومت سے ان کی انسانیت کا دم گھٹ رہا ہو، ہلاکت آفریں ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا انسان اس فضا کو چھوڑ کر کسی مساعد فضا میں جانے کے لئے اُس شخص سے بھی زیادہ مضطرب و بے قرار ہوگا جو کوئلے کے گیس سے مسموم کمرے میں گھر چکا تھا۔ لیکن اس میں سوال فقط احساس کا ہے۔ جو شخص کوئلے کے گیس سے بے ہوش ہو چکا ہو وہ کمرہ چھوڑ دینے کے لئے مضطرب نہیں ہوگا۔ اس میں اس کا احساس و شعور ہی باقی نہیں رہا۔ اسی طرح جس کی "انسانیت" غیر خداوندی نظام کی محکومیت سے اس درجہ ماؤف ہو چکی ہو کہ اس میں احساس و شعور ہی باقی نہ رہے اس میں اس فضا کو چھوڑنے کا خیال تک بھی پیدا نہیں ہوگا۔ نہیں! بلکہ وہ تو اس پرندے کی طرح، جو قفس کی زندگی کا خوگر ہو چکا ہو، اصل زندگی پنجرے کی تیلیوں کے پیچھے ہی محسوس کرے گا۔ اسے اگر آپ باہر نکالنے کی کوشش بھی کریں گے تو وہ پھر اندر جانے پر مُصر ہوگا۔ جس کی ذہنیت یوں مسخ ہو چکی ہو وہ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ کا مفہوم کیا

سمجھے؟ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ اور اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم یہ ہے کہ مومن ہمیشہ غیر خدا ماحول سے خدائی ماحول کی طرف رُخ کرتا ہے اور اس میں وطن کی محبت کی خاردار جھاڑیاں بھی دامن گیر نہیں ہوتیں۔ اس کا حقیقی وطن وہی ہے جہاں قوانینِ خداوندی کی حکومت ہو اور جب ان قوانین کی حکومت ساری دُنیا پر پھیل جائے تو ساری دنیا اس کا وطن ہے اور یہی اس کا نصب العینِ حیات ہے۔

(تفصیل ان امور کی "معراجِ انسانیت" میں ہجرت کے عنوان میں ملے گی)۔

اَولادِ ابراہیمؑ

معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت ابراہیمؑ کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی اس لئے کہ، جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں، ہجرت سے متعلقہ آیات میں حضرت اسحاقؑ اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب کی بشارت دی گئی ہے۔ لیکن دوسرے مقام پر ایک اور "غلامِ حلیم (نہایت ثقہ اور وقیع بیٹے) کی بشارت ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ؀ (۳۷/۱۰۱)

پس (دیکھو) ہم نے اسے ایک حلیم لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیدی۔

اس سے حضرت اسمٰعیلؑ مراد ہیں۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ ۸۷ سال کے ہوئے تو حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ تولد ہوئے اور آپ کی ولادت سے تیرہ سال بعد جب (حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو سال کی ہوئی) حضرت سائرہ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت سائرہ (جیسا کہ عورت کی طبیعت کا تقاضا ہے) اولاد نہ ہونے کی وجہ

کبرسنی میں اولاد کی بشارت

سے مغموم رہتی تھیں اور چونکہ عمر زیادہ ہو چکی تھی اس لئے روز بروز مایوسی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس مایوسی میں اللہ تعالےٰ نے اپنے فرستادوں کی زبانی حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کا مژدہ مسرت بخش سنایا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآنِ کریم کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔ سورۂ ہودؑ میں ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ ....

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ

اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ (۶۹ — ۱۱/۷۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے تھے۔ انہوں نے کہا تم پر سلامتی ہو۔ اس نے بھی کہا تم پر بھی سلامتی ہو۔ پھر ابراہیم فوراً ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا (اور ان کے سامنے رکھ دیا کہ میرے مہمان ہیں)۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہیں، تو اُن سے بدگمان ہوا اور جی میں ڈرا (کہ یہ کیا بات ہے؟)۔ انہوں نے کہا "خوف نہ کر ہم تو (اللہ کی طرف سے) قومِ لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور اس کی بیوی بھی (خیمہ میں) کھڑی (سُن رہی) تھی۔ وہ ہنس پڑی (یعنی اندیشے کے دُور ہو جانے سے خوش ہوئی)۔ پس ہم نے اسے اپنے فرستادوں کے ذریعے اسحاق (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی اور اس کی کہ اسحاق کے بعد یعقوب کا ظہور ہوگا۔ وہ بولی، افسوس مجھ پر! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے اولاد ہو، حالانکہ میں بڑھیا ہو گئی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے! انہوں نے کہا کیا تو اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تجھ پر ہوں! اے اہلِ خانۂ ابراہیم (اس کے فضل و کرم سے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے)۔ بلاشبہ اُسی کی ذات ہے جس کی ستائشیں کی جاتی ہیں اور وہی ہے جس کے لئے ہر طرح کی بڑائیاں ہیں!

اسی واقعہ کو (۵۱ — ۱۵/۵۶) اور (۲۴ — ۵۱/۳۰) میں بھی دہرایا گیا ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم میں اس کی تصریح نہیں کی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں اور ایک کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے تھے اور دوسری بیوی کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ۔ یہ تفاصیل تورات میں ہیں۔

یہ پہلے آ چکا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ یہ نو وارد کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو ان سے خائف ہوئے۔ (۵۱/۲۵) میں کہا گیا ہے کہ وہ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ "(اجنبی لوگ) تھے۔ ایک تو حضرت ابراہیمؑ سے ان کا سابقہ تعارف نہیں تھا۔ پھر جب آپ نے اپنی خوئے مسافر نوازی کی رُو سے اُن کے کھانے کا انتظام کیا تو دیکھا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ اس سے آپ کے دل میں شُبہ پیدا ہوا کہ یہ

لوگ کسی نیک ارادے سے یہاں نہیں آئے، جو میرے یہاں سے کھانا بھی نہیں کھانا چاہتے (جیسے آج بھی ہمارے ہاں یہ دستور (نہیں تو کم از کم مقولہ) ضرور ہے کہ جس کے ہاں کا نمک کھا لیا جائے اس کا حلیف بننا پڑتا ہے)۔

بہرحال، ان حالات کے ماتحت حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کی خوشخبری پہنچی۔ مقاماتِ مندرجہ بالا میں انسانی طبیعت کی ایک لطیف سی جھلک قابلِ غور ہے۔ مرد کتنا ہی بوڑھا ہو چکا ہو اس کے لئے نئی اولاد کسی قسم کی جھجک کا باعث نہیں ہوتی۔ لیکن ایک سن رسیدہ عورت کے لئے اولاد کا تصوّر (خواہ اس کی آرزو کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو) خفیف سے حجاب کا باعث ضرور ہوتا ہے۔ انسانی طبیعت کی یہی وہ جھلک ہے جو حضرت سارہ کی ان حرکات سے بے نقاب ہو رہی ہے جو اس کبرسنی میں بیٹے کی اس خوشخبری سے اُن سے خود بخود سرزد ہوگئیں۔ دل میں احساسِ محجوبیت، لب پر وُلیلتی اور ہاتھ پیشانی پر، فطرتِ نسائیت کی کیسی صحیح تصویر ہے؟

حضرت ابراہیمؑ فلسطین[1] میں اقامت پذیر تھے جسے آپ کی ذُرّیت (بنی اسرائیل) کے لئے برکت والی زمین قرار دیا گیا تھا۔ لیکن خدا کے پروگرام کے مطابق دعوتِ ابراہیمیؑ کو کسی خاص خطۂ ارض میں محدود نہیں رہنا تھا، اسلام نوعِ انسانی کا دین ہے۔ اس لئے ہمہ گیری اور آفاقیت [UNIVERSALISM] خود اس کی فطرت میں داخل ہے۔ جیسا کہ ہم "ابلیس و آدم" میں عنوان "شجرِ ارتقا کا گلِ سرسبد" میں بیان کر چکے ہیں مشیّت کے پروگرام کے ماتحت ایک تدبیر (اسکیم) کی ابتدا ہوتی ہے۔ پھر وہ تدبیر اپنے تدریجی ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی ایک عرصۂ دراز میں (جس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے) اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔ ایسی ہی تدبیر کے مطابق شجرِ ابراہیمیؑ کی دوسری شاخ (اسمٰعیلیؑ) کے متعلق یہ طے پایا کہ

شاخِ اسمٰعیلی

وہ ایک ایسی سرزمین میں پیوست ہو جائے جہاں سے وہ بڑھتی، پھولتی، پھلتی ایک دن تمام اطراف واکنافِ عالم پر چھا جائے۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ

---

[1] حضرت ابراہیمؑ کے توطنِ فلسطین کے بعد ان کے برادرزادہ حضرت لوطؑ، سدوم اور عمورہ کے علاقہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے جو اس قطعۂ ارض میں نہایت شاداب اور زرخیز علاقہ تھا۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) اُس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں. چنانچہ اس مقصدِ عظیم کے لئے سرزمینِ حجاز کا انتخاب ہوا اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پہلوٹے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو فلسطین و شام کی سرسبز و شاداب وادیوں سے نکال کر عرب کے بے برگ و گیاہ صحرائے لق ودق میں آبسایا. اس لئے کہ مشیّت کے پروگرام کے مطابق اُن فرخندہ و شاداب وادیوں کو ایک دن[1] ویرانوں میں تبدیل ہو جانا تھا اور اس بے برگ و گیاہ ویرانے کو جنّت کی حسین ترین ابدی بہاروں کی بوسہ گاہ بننا تھا. کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت ابراہیمؑ سے امامتِ نوعِ انسانی کا وعدہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا " وَ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ ؟ " (۲/۱۲۴) یعنی یہ وعدہ کیا میری نسلوں میں بھی متوارث رہے گا؟ تو ارشاد ہوا کہ ہاں رہے گا لیکن لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۲/۱۲۴) جو میرے قوانین سے سرکشی کی راہ اختیار کریں گے اُن کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں. یہ ظٰلِمِیْنَ بنی اسرائیل کا آخری طبقہ تھا. جب وہ سرکشی و عدوان سے زندگی کی خوشگواریوں کے اہل نہ رہے تو نوعِ انسانی کی امامت کو اس شاخ سے الگ کر کے ذرّیتِ ابراہیمیؑ کی دوسری شاخ کی طرف منتقل کر دیا گیا. سورۃ صٰفّٰت میں ہے.

> وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ۝ (۳۷/۱۱۳). (نیز ۲۶/۵۷).
>
> اور ہم نے ابراہیم اور اسحاق پر (اپنی) برکتیں نازل فرمائیں اور اُن کی اولاد میں سے دو طرح کے لوگ ہوئے. ایک زندگی کی متوازن راہ پر چلنے والے اور دوسرے کھُلے طور پر اپنے آپ سے زیادتی کرنے والے.

سرزمینِ حجاز کی خوش بختی چنانچہ یہ تھی وہ عظیم المرتبت تدبیرِ الٰہی جس کے ماتحت حضرت اسمٰعیلؑ کو فلسطین سے بہت دُور سرزمینِ حجاز میں بسایا گیا تھا تاکہ جب پہلی شاخ اپنی تازگی و برومندی کھو بیٹھے تو یہ دوسری شاخِ اطہر قدوسیانِ حظیرۃ اعلیٰ کا گہوارہ بن سکے. سورۃ ابراہیم کے چھٹے رکوع میں اس ویرانے کی آبادی کا تذکرہ ان الفاظ میں

---

[1] بنی اسرائیل کی تباہی کے بعد.

آیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿﴾...... رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَ مَا نُعْلِنُ ؕ وَ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ﴿﴾ (۱۴/۳۸ — ۳۵)

جب ابراہیم نے کہا کہ اے نوعِ انسانی کے پرورش دینے والے! تو اس بستی کو (جسے میں تیرے نظام کے لئے مرکز بنا رہا ہوں) ایسا بنا دے کہ یہ سرکش قوتوں کی چیرہ دستیوں کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے امن کا مقام بن جائے اور ایسا کردے کہ میں اور میری اولاد ہر اس بات سے مجتنب رہیں جو ہمیں تیرے قوانین کی اطاعت سے بے گانہ بنا دے۔ اے میرے نشوونما دینے والے! ان غیر خدائی قوتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ میں اس کا اعلان کرتا ہوں کہ میرا یگانہ وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس کی اتباع میں کر رہا ہوں اور جو اس سے سرکشی برتے گا تو اس کی حفاظت اور پرورش کا انتظام تیرے قانون (طبیعی) کے مطابق ہوگا۔

اے میرے پرورش دینے والے! میں نے (اس عظیم مقصد کے لئے) اپنی کچھ اولاد کو تیرے واجب الاحترام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے۔ یہ مقام ایسی جگہ واقع ہے جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں۔ یہ سب اس لئے کیا ہے کہ وہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کریں۔ پس تو ایسا کردے کہ (ان تمام ناسا‏عدتِ حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز تو ان کے لئے زمین کی پیداوار سے رزق کا سامان بہم پہنچا دے (تاکہ یہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اس طرح کام کریں) کہ ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل بن جائیں۔ اے ہمارے پروردگار! جو کچھ ہمارے دلوں کے اندر ہے اور جو کچھ اظہار میں آجاتا ہے تجھ پر سب روشن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس میں سے کچھ بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں۔

یہ تھا وہ عظیم مقصد جس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو وطن سے دُور ایک صحرا میں آباد کیا تھا[1]۔

(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

(نوعِ انسانی کے مرکزِ محسوس کے لئے اس خطۂ ارض کا انتخاب کن مصالح کی بنا پر عمل میں لایا گیا، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ تورات میں بھی یہ واقعہ (تفاصیل کی تبدیلی کے ساتھ) مذکور ہے لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی علیحدگی کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کے کبھی شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ (اس قسم کے امور اس حقیقت کی داخلی شہادت ہیں کہ یہ کتابیں انسانی دست بُرد سے محفوظ نہیں رہ سکیں)۔ چنانچہ کتابِ پیدائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کا بار آور ہونا حضرت سارہ کے لئے خوش آیند نہ تھا۔ اس لئے وہ حضرت ہاجرہ کو تنگ کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ ایک مرتبہ اسی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔

تورات کی توجیہات

اور خداوند کے فرشتہ نے اسے ایک میدان میں پانی کے چشمے کے پاس پایا۔ یعنی اس چشمے کے پاس جو شور کی راہ پر ہے ۞ اور اس نے کہا اے ساری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی ساری کے سامنے سے بھاگی ہوں ۞ اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اس کے تابع رہ ۞ پھر خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے ۞ اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا۔ (پیدائش ۷ـــ ۱۱/۱۶)

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے بعد یہ حسد اور بھی تیز ہو گیا اور جب حضرت سارہ کے ہاں حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے تو یہ حسد رقابت کی آگ تک بڑھ گیا۔ اس لئے کہ اس زمانے کی رسم کے مطابق پہلوٹا بچہ باپ کی سرداری کا وارث اور مقدس خیال کیا جاتا تھا اور حضرت سارہ نہیں چاہتی تھیں کہ (جناب) ہاجرہ کا بیٹا اُن کے اپنے بیٹے سے ممتاز رہے۔

لہ وادی' غیر ذی ذرع' (بے برگ و گیاہ) تھی لیکن جس مقام پر حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کیا تھا وہ (بَلَدٌ) شہر تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو کسی ویرانے میں نہیں چھوڑ آئے تھے بلکہ انہیں سرزمینِ حجاز کی مرکزی بستی (مکہ) میں آباد کیا تھا۔ مکہ اس زمانہ میں اس شہرت و جاذبیت کا مالک نہ ہو جو بعد میں اس کے حصہ میں آئی لیکن بہر نوع وہ بَلَدٌ (شہر) اُس زمانہ میں بھی تھا۔

اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابرحام سے جنی تھی، ٹھٹھے مارتا ہے ۝ تب
اس نے ابرحام سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا
میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا ۝ اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابرہام کی نظر میں
نہایت بُری معلوم ہوئی۔ خدا نے ابرہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت
تیری نظر میں بُری نہ معلوم ہو۔ ہر ایک بات کے حق میں جو سارہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان
رکھ کیونکہ تیری نسل اسحاق سے کہلائے گی ۝ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کرونگا
اس لئے کہ وہ بھی تیری نسل ہے۔　　(پیدائش ۹ ــ ۲۱/۱۳)

چنانچہ اس پُر تورات کے بیان کے مطابق، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے حرمِ محترم حضرت ہاجرہ اور اپنے لختِ جگر حضرت اسمٰعیلؑ کو (جنہیں خدا کے حضور سے دعائیں مانگ مانگ کر لیا تھا) ایک لق و دق صحرا میں "دیس نکالا" دے دیا۔

تب ابراہام نے صبح سویرے اُٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے
پر دھر کر دی اور اس لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے رخصت کیا اور وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے میدان
میں بھٹکتی پھرتی تھی ۝　　(پیدائش ۱۴ ۲۱/۱)

اس کے بعد کتابِ پیدائش میں ایک نہایت درد انگیز افسانے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس بیابانِ فاران میں حضرت ہاجرہ کے پاس کسی طرح پانی ختم ہوگیا اور اس معصوم بچہ پر اس سے کیا گزری؟

اور جب مشک پانی چک گیا تب اُس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ۝ اور
آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دُور جا بیٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں
سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کے روئی ۝ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سُنی اور خدا کے فرشتے
نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے
کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سُنی ۝ اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس
کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ۝ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا
اور جا کر اس مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا ۝ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان
میں رہا کیا اور تیر انداز ہوگیا۔　　(پیدائش ۱۵ ــ ۲۱/۲۰)

حالانکہ اسی باب کے شروع میں مذکور ہے کہ یہ واقعہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے بعد کا ہے اور حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے وقت (تورات کے بیان کے بموجب) حضرت اسمٰعیلؑ چودہ سال کے تھے[1]۔ بہرحال تورات کے بیان کے مطابق یہ ہے وہ علت جس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہؑ[2] اور حضرت اسمٰعیلؑ کو گھر سے نکالا اور صحرا میں چھوڑ دیا۔ واقعہ ایک ہی ہے، لیکن قرآنِ کریم کی بیان کردہ علت اور تورات

---

[1] قرآنِ کریم سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے وادیِ غیر ذی ذرع (بے برگ و گیاہ وادی) میں سکونت پذیر ہونے کا واقعہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد کا ہے۔ چنانچہ سورۂ ابراہیمؑ کے چھٹے رکوع میں جہاں اس واقعہ کا ذکر ہے اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ۝ (۱۴/۳۹)۔

اور ابراہیمؑ نے کہا" ساری ستائش اللہ کے لئے ہے جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھے اسمٰعیل اور اسحاق (دو فرزند) عطا فرمائے۔ بلاشبہ میرا پروردگار (اپنے بندوں کی) دعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت اسحٰقؑ پیدا ہو چکے تھے۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی۔ (پیدائش ۱۶/۱۶)

اور جب ابراہیم کے لئے ہاجرہ سے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔ (پیدائش ۱۶/۱۶)

اور حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو برس کی تھی۔

اور جب اس کا بیٹا اسحٰق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔ (پیدائش ۲۱/۵)

لہٰذا حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر قریب چودہ سال کی تھی۔

[2] عیسائی مستشرقین، حضرت ہاجرہ کے استخفاف میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے محض اس لئے کہ اُن کے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کے سلسلۂ زریں سے جناب خاتم الانبیاءؐ کا ظہور ہوا۔ لیکن بعض اوقات حقیقت اپنا اعتراف اس طرح کرا لیتی ہے کہ معترف خود محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ یہودی خاص طور پر اس مذموم حرکت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ لیکن جو شخص انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے،" جو شخص اسمٰعیل کو خواب میں دیکھ لیگا۔ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کی رُو سے جذبہ محرکہ پر غور کیجئے۔ خدا کے کلام اور انسانوں کی تحریف کا نمایاں فرق سامنے آجائے گا۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے بیابانِ فاران میں اقامت پذیر ہو جانے کے بعد تعمیرِ کعبہ کا عظیم المرتبت واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر اسوۂ ابراہیمیؑ میں ایک درخشندہ کڑی اور بھی ہے جس کے صلہ میں آپ کو بارگاہِ خداوندی سے "مسلم" کا رفیع الشان لقب عطا ہوا ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو منصبِ امامت عنایت فرمانے کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا تھا:

وَ اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (۲/۱۲۴)

جب اللہ نے ابراہیم کے لئے اس کی مضمر صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع بہم پہنچائے تو معلوم ہوا کہ اس کی صلاحیتیں تکمیل پا چکی ہیں۔ اس پر کہا گیا کہ جس کی صلاحیتیں اس حد تک تکمیل پا چکی ہوں اسے حق ہے کہ وہ دوسروں کی صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار بن سکے۔

مختلف منازل

حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ مقدسہ اس اجمال کی نورانی تفصیل ہے۔ ان مواقع کی نوعیت پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے باپ سے اعلانِ بغاوت اور اس کے جواب میں باپ کی دھمکی کہ اگر ان حرکتوں سے باز نہ آیا تو سنگسار کرادوں گا۔ اگر یہ دھمکی نہ بھی دی جاتی تو بھی اپنے والد کے مسلک کی مخالفت میں جو مشکلات سفرِ زندگی میں منتظر تھیں، وہ نظروں کے سامنے تھیں۔ ایک صاحبِ قوت و سطوت قوم کے ایک بڑے پجاری کا بیٹا، باپ کی مسندِ برہمنیت کا وارث، ان تمام جاذبیتوں سے مُنہ موڑ کر دنیا بھر کی مصیبتوں کی زندگی کو مول لے لینا یہ کوئی چھوٹی بات نہ تھی!

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) اللہ اس کی دعا قبول کرے گا" (جلد ۱، صفحہ ۴۷۸) اور حضرت ہاجرہؑ کے متعلق ہے: "ہاجرہ اس بلند درجہ کی للّٰہیت کی مثال ہے جو (حضرت) ابراہیمؑ کے زمانہ میں رائج تھی۔ کیونکہ ہاجرہ خدا کے فرشتے سے گھبرائی نہیں۔ اس کی وفاشعاری قابلِ تحسین ہے۔ کیونکہ جب (حضرت) ابراہیمؑ نے اسے دور بھیج دیا اس پر بھی اس نے اپنے عہدِ نکاح کو قائم رکھا...... خدا نے اسے حُسنِ عمل کے زیور سے آراستہ کیا تھا.... (حضرت) سارہ کی وفات کے بعد خود (حضرت) اسحاق (حضرت) ہاجرہ کو اپنے والد کے گھر لانے کے لئے گئے۔ (صفحہ ۱۳۹)۔

اِس کے بعد اس جابر و سرکش قوم کی مخالفت اور مخالفت بھی اس انداز کی جو ان کے جذبات کو آگ کی طرح بھڑکا دے اور فقط قوم ہی نہیں بلکہ ایک مطلق العنان ظالم اور مستبد بادشاہ کا مقابلہ! کہہ لینے کو آسان ہے، کرنے کے لئے کسی خلیل اللہ ہی کا جگر چاہیئے۔

اس کے بعد وطن سے ہجرت، دنیاوی دل بستگی کے ہر سامان سے قطع علائق، دنیا داری کے معیار کے مطابق بے کسی اور درماندگی، غربت و افلاس کی زندگی۔

پھر "اللہ کے گھر" کی پاسبانی کے لئے حضرت اسمٰعیلؑ جیسے بیٹے کو ایک بے آب و گیاہ ویرانے میں آباد کر دینا اسی کے لئے ممکن ہے جس کا دل خود اللہ کا گھر بن چکا ہو۔

لیکن یہ سلسلہ ہنوز تشنۂ تکمیل تھا۔ کتابِ محبت میں ابھی ایک اہم باب کی کمی تھی۔ یہ نظمِ مرصع،

تسلیم و رضا کا مقام بلند

مقطع کے بند کی محتاج تھی۔ مسلم کا خطاب عطا ہونے کے لئے تسلیم و رضا کی ایک سنگلاخ وادی ہنوز باقی تھی۔

اب وقت آ گیا تھا کہ یہ منزل بھی طے ہو جائے اور عشق اپنی تکمیل کو پہنچ کر سراپا حُسن بن جائے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور اولاد کوئی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا کیا اور ایک فرزندِ سعید و حلیم کی بشارت دی۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۝ (۳۷/۱۰۱)

پھر ہم نے اسے ایک بُردبار لڑکے (کی پیدائش) کی خوشخبری دے دی۔

ان منتوں اور دعاؤں، ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کا بچہ اور وہ بھی بڑھاپے کی عمر کا، جس قدر بھی پیارا ہو کم ہے۔ بچہ بڑھا، پھولا، پھلا۔ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ (۳۷/۱۰۲)

پھر جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے (اور چلنے پھرنے کی قابلیت) کو پہنچ گیا (یعنی جوان ہو گیا)۔

بیٹے کی قربانی

تو آپ خواب کے ایک اشارے سے سمجھے کہ حکم ملا ہے کہ بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جائے۔ ہر چند یہ حکم نہیں تھا، محض خواب میں ایسا

دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اسے کچھ "اُدھر کا اشارہ" سمجھ لیا اور ایسی حیرت انگیز اور ہوش رُبا قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ اشارہ سمجھا اور لبیک اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ!! کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ بیٹے سے پوچھا۔

یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (۳۷/۱۰۲)

اے فرزند! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو! تمہارا کیا خیال ہے؟

میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، کہو تمہارا کیا خیال ہے؟" سوال آپ نے سُن لیا! اب بیٹے کا جواب بھی سُن لیجئے۔ عرض کیا۔

یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ

(۳۷/۱۰۲)

ابا جان! جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے اسے بلا تامل کر گزریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

سبحان اللہ! باپ تو ان ارادوں کا باپ اور بیٹا تو اس حوصلہ کا بیٹا۔ باپ نے اپنی محبت کے تمام جذبات اور بیٹے نے جان اور جوانی کو محبوبِ حقیقی کے ایک اشارہ پر قربان گاہِ عشق میں بلا تکلف نذر لانے کے لئے حاضر کر دیا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

مقامِ مُسلم

باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا۔ چھری ہاتھ میں لی۔ یہ تسلیم و رضا کی آخری منزل تھی فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۳۷/۱۰۳) " جب وہ دونوں جھک گئے (اَسْلَمَا) اور باپ نے بیٹے کو کنپٹی کے بل لٹا دیا۔" یہ وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر انسان مسلم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے ؎

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

چھری چلنے کو تھی کہ آواز آئی۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ ھٰذَا

نَّهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ٥ (۱۰۶-۱۰۵/۳۷)

اے ابراہیم! تو نے خواب (کے اشارے کو حقیقت پر محمول کر کے اسے) سچ مچ پورا کر کے دکھا دیا
ہم اپنے مخلص بندوں کو اسی طرح اپنی رحمت سے نوازا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ اظہارِ حقیقت
کا ایک نمایاں موقع تھا۔

یعنی جو لوگ حُسن کارانہ انداز سے متوازن زندگی بسر کرتے ہیں، ان سے اگر کبھی دفورِ جذبات میں اس قسم کے اقدامات ہو جائیں تو وحی کی روشنی سامنے آجانے سے وہ ان کے عواقب سے فوراً بچ جاتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ روک لینا، بہت بڑی تبدیلیٔ احوال تھی۔ اَلْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔

قرآنِ کریم میں اس واقعۂ عظیمہ کا ذکر صرف اسی ایک مقام پر ہے۔ آیاتِ مصرحہ صدر میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس قربانی کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اپنی محبت اور شیفتگی کے جوش میں خواب کو حقیقت سمجھ کر بیٹے کی جسمانی قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے۔ مشیّتِ ایزدی نے بھی آخری منزل تک انہیں اسی دھن میں چلنے دیا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ جسے نوعِ انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا جا رہا تھا وہ کن خصوصیات کا پیکر تھا اور اطاعتِ خداوندی میں کس حد تک جانے کے لئے تیار تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ ۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شُد فارغ از بندِ زن و اولاد شُد
می کند از ماسوا قطعِ نظر می نہد ساطور بر حلقِ پسر

لیکن جس وقت اس منزل کا آخری مرحلہ آ پہنچا اور انہوں نے چھُری ہاتھ میں لے لی تو اس وقت آپ کو بتایا

ذبحِ عظیم سے مقصد

گیا کہ خواب میں دیکھی گئی قربانی سے درحقیقت مقصود کیا تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ پہلوٹا بیٹا ہونے کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کی سرداری اور حکومت کے وارث تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بڑے مقصد کے لئے "اپنا لیا تھا" اور وہ مقصدِ عظیم تھا بیت اللہ کی تولیت۔ خانۂ خدا کی پاسبانی، جس کے لئے دنیا کی ہر آسائش کو قربان کر دینا تھا۔ یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی، جس کے لئے حضرت اسمٰعیلؑ کو بچا لیا گیا تھا۔

وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ٥ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ٥ سَلٰمٌ عَلٰى

اِبْرٰهِيْمَ ٥ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ٥ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ٥

(۱۰۷ — ۳۷/۱۱۱)

ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے اسمٰعیل کو ذبح ہونے سے بچالیا اور ہم نے آنے والی (آیندہ) نسلوں کے لئے اس واقعہ کی یاد کو باقی رکھا۔ ابراہیم پر (اُس خدا کی طرف سے ہمیشہ) سلامتی ہو۔ ہم نیکوکار لوگوں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں (کہ ان کا نام اور ذکرِ خیر ہمیشہ کے لئے دنیا کی پیشانی پر چمکتا رہتا ہے)۔ بلاشبہ وہ ہمارے (باخلاص) مؤمن بندوں میں سے تھا!

یہ تھی وہ خدمت و پاسبانی جو اُس وقت سے لے کر آخری زمانے تک حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں متوارث چلی آئی تا آنکہ خدا کے گھر کی کنجیاں خدا کے اُس بندے (عبدہٗ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقدس ہاتھوں تک پہنچ گئیں جس نے اس گھر کو شرفِ انسانیت کے قیام و بقا کا حقیقی ذریعہ بنانا تھا۔ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔

تسلیم و رضا کی ان دشوار گزار منازل کو طے کر لینے کے بعد صداقت اور خدا کاری کے ان پیکروں کے سپرد وہ خدمتِ جلیلہ کی گئی جو اسلام کی عالمگیریت کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ:

(۱) اسلام، مذہب نہیں، دین ہے یعنی نظامِ زندگی۔

(۲) ہر نظام اپنے لئے ایک مرکزِ محسوس چاہتا ہے۔

(۳) اسلام، تمام نوعِ انسان کے لئے عالمگیر نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اس نظام کے مرکز کو بھی تمام نوعِ انسانی کا مرکز ہونا چاہیئے۔

(۴) اُس وقت دنیا میں کوئی مرکز ایسا نہیں تھا جسے عالمگیر انسانیت کے نظام کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو۔

(۵) کعبہ اس نظام کا مرکز تھا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے عالمگیر حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں کعبہ یا حج کا ذکر آیا ہے، انہیں لِلنَّاس کہہ کر پکارا گیا ہے، یعنی کسی خاص قبیلہ، قوم، وطن، حکومت یا مذہب کا مرکز نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے وجہِ جامعیت کے نظام کا مرکز، تمام انسانوں کے اُمّتِ واحدہ بننے کے لئے مرکزِ ثقل۔ یہ حیثیت تھی اس گھر کی جس کی تعمیر کے لئے

حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا اور جس کی پاسبانی کا فریضہ حضرت اسمٰعیلؑ اور آپ کی نسل کے سپرد کیا گیا۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں بڑے بڑے بُت کدے، دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے لئے عظیم الشان منادر، اجرامِ سماویہ کی پرستش کے لئے وسیع و عریض ہیکل موجود تھے۔ لیکن تمام صفحۂ ارض پر خدائے واحد و قہّار کی عبودیت کے اظہار کے لئے کوئی مقام نہ تھا۔ یہ منصبِ جلیلہ حضرت ابراہیمؑ کی سعادت کے لئے مقدر تھا۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے؛

تعمیر کعبہ

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ (۳/۹۵)

بلاشبہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو خالص انسانیت کی خاطر بنایا گیا وہ مکّہ میں ہے، اپنے مقام پر محکم اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا حامل، تمام اقوامِ عالم کے لئے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راہ نمائی کا ذریعہ۔

یہ تھی وہ عدیم النّظیر خدمت جو حضرت ابراہیمؑ کو تفویض کی گئی تھی۔ یوں تو اس تمام کائنات میں کون سی چیز ہے جو اللہ کی نہیں (لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الْاَرْضِ) لیکن مٹی اور پتھر کی جس سادہ سی چار دیواری کو مالکِ ارض و سمٰوٰت نے اپنی نسبت کا شرف عطا فرمایا، وہ یہی بیتِ اقدس تھا جس کا سنگِ بنیاد جنابِ خلیل اللہؑ جیسے توحید پرست کے مقدّس ہاتھوں نے رکھا اور جس کی تعمیر کے لئے حضرت اسمٰعیلؑ جیسے پیکرِ ایثار و صداقت نے مٹی اور پتھر کو اپنے سر پر اٹھایا۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (۲/۱۲۵)

---

[۱] مکّہ قدیم الایّام سے (حتّٰی کہ حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے) ایک مقدّس مقام تصور کیا جاتا تھا اور دور دراز سے لوگ اس کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ مقامِ عظمت ضرور تھا لیکن خالصتاً خدائے واحد کی عبادت کے لئے تعمیر کعبہ حضرت خلیل اللہؑ کے مقدّس ہاتھوں انجام پائی۔ اگرچہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے اس مقام کی تعمیر کسی سابقہ بنیادوں پر ہی رکھی تھی۔

اس گھر کو ہم نے نوعِ انسانی کے لیے مرکز کی حیثیت دیدی تاکہ وہ (نوعِ انسانی) اس سے متمسک ہو کر تمام خطروں سے محفوظ ہو جائے۔

سو اے جماعتِ مومنین! تمہیں بھی چاہیئے کہ تم بھی ابراہیمؑ کے اس منصب و مقام کے حصول کی کوشش کرو اور اس کے لئے اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو تاکید کی تھی کہ وہ اس مقام کو انسانوں کے خود ساختہ نظریات و تصورات سے دُور رکھ کر اس جماعت کی تربیت گاہ بنا دیں جو تمام نوعِ انسانی کی حفاظت کی ذمہ دار اور ان کے معاملات کو سنوارنے کی ضامن ہے اور اس فریضہ کو قوانینِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے سرانجام دیتی ہے۔

حسین دُعائیں

یہ مقام جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس بے آب و گیاہ وادی میں تھا جہاں انسانی سکونت و اقامت کے لئے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ اسی لئے اس کے انتخاب کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر قدرتی طور پر یہ دُعا آگئی کہ

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (۲/۱۲۶)

اے وہ جو تمام کائنات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا ہے! تو ایسا کر دے کہ یہ مقام ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے امن اور پناہ کی جگہ بن جائے اور جو لوگ تیرے قوانین کی صداقت اور مستقبل کی زندگی پر یقین رکھتے ہوں، انہیں زندگی کی آسائشیں اور معاشی سہولتیں عطا فرمادے۔

اس پیکرِ اخلاص کی دُعا کو ایسا شرفِ قبولیت عطا ہوا کہ ریگستان کا وہی خشک ٹکڑا آج تک دنیا بھر کی شادابیوں کا مرکزی مقام ہے اور جب تک صفحۂ ارض پر سرسبزی و شگفتگی کا آخری نشان باقی ہے، وہ مقام ایسا ہی رہے گا کہ اس کی فضا میں جناب خلیل اللہؑ کی دعائیں گونج رہی ہیں اور اس کی خاک کے ذرات میں حضور نبی اکرمؐ کی پابوسی کی سعادتیں جھلک رہی ہیں۔ اگر یہ مقام دنیا بھر کی نزہتوں اور لطافتوں کی جلوہ گاہ نہیں ہو سکتا تو پھر اور کون سے مقام کے مقدر میں یہ شرف لکھا جا سکتا ہے!

ذرا تصور میں لایئے اس سہانے سمے کو کہ صبح کی نورانی گھڑی، تاروں کی چھاؤں میں بادۂ توحید سے سرمست و جوشِ فدویت میں جھومتے ہوئے، باپ اور بیٹا (علیہما السلام) اس مقدس فریضہ کی سرانجام دہی

میں دنیا و ما فیہا سے بے نیاز، انتہائی جذب و انہماک سے مصروفِ کار ہیں۔ بیٹا، مٹی اور پتھر لا رہا ہے اور معمارِ حرم دیوار چن رہا ہے۔

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ (۲/۱۲۷)

اور (پھر دیکھو، وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا اور اسمٰعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔

ہاتھ کام میں مصروف ہیں اور لب، پر یہ حسین دعائیں مچل رہی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۲/۱۲۷)

اے اللہ العالمین! تیرے یہ ناچیز بندے تیرے مقدس نام پر اس کی چار دیواری کھڑی کر رہے ہیں ان کی اس حقیر محنت کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۲/۱۲۸)

اے پروردگار! ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے سچے مسلم (تیرے قوانین کے پابند و تیرے احکام کے سامنے جھک جانے والے) بن جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی وہ لوگ پیدا ہوں جو سچے معنوں میں مسلم ہوں۔ تو ہمیں وہ طور طریق سکھا دے جن سے ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں اور تیری عنایات کا رُخ ہماری طرف رہے۔ اس لئے کہ تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جہاں کسی نے اس کی طرف رُخ کیا، وہ تمام سامانِ رحمت کو اپنے ساتھ لئے خود اس کی طرف بڑھ کر آ گیا۔

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۧ (۲/۱۲۹)

یہ سلسلہ اسی طرح سے قائم رہے تاآنکہ ان میں انہی سے اس دعوتِ انقلاب کو لے کر وہ رسول اُٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ انہیں اس کی تعلیم بھی دے اور

یہ بھی بتا دے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا اور وہ نظام متشکل کر دے جس سے ان کی صلاحیتوں کی برومندی ہوتی رہے، تیرے اس قانون کے ذریعے جو قوت اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے۔

ملّتِ حنیفہ کا مرکزِ محسوس یہ وہ حسین و مقدس دعائیں تھیں کہ اِدھر زبان سے نکلیں اور اُدھر شرفِ قبولیت سے ہم آغوش ہوگئیں۔ ان آرزوؤں اور تمناؤں میں اللہ کے اس مقدس گھر کی تعمیر عمل میں آئی۔ جب وہ مکمل ہوگیا تو ارشاد ہوا کہ اب لوگوں کو دعوت دو کہ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی انفرادی زندگی کو ایک اجتماعی قالب میں ڈھالنے کی غرض سے اس مرکزِ توحید کی طرف رواں دواں چلے آئیں (۲۲/۲۷)۔
(تفصیل ان اجمالات کی اپنے اپنے مقام پر ملے گی)۔

یہ ہیں ملّتِ حنیفہ کے مؤسسِ اولیٰ حضرت خلیلِ اکبر (علیہ السلام) جن کی خصوصیاتِ کبریٰ کو اللہ تعالےٰ نے قرآنِ کریم کے مختلف اوراق میں دہرایا ہے تاکہ آپ کا اسوۂ حسنہ توحید پرستوں کے قلب و نگاہ میں اچھی طرح نقش ہو جائے۔ کہیں ان خصوصیاتِ حسنہ کی گلکاریوں کو پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، کہیں اس کی پوشیدہ نکہتوں کو یوں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جیسے چندن کے ہر ریزہ میں پورا اگل کدہ سمو دیا جائے۔ یا ہیرے کے نگینے میں آفتاب کی پوری دنیائے نور جھلمل جھلمل کر رہی ہو۔ آپ کے جوہرِ تسلیم و رضا کے تفصیلی واقعات اوپر گزر چکے ہیں، ان تمام تفاصیل کو سمٹا کر ایک لفظ میں یوں ادا کیا گیا ہے کہ

مُسلِم!

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۱۳۱)

جب ابراہیم کے پروردگار نے اسے حکم دیا تھا کہ جھک جاؤ، تو وہ پکار اُٹھا تھا کہ میں اس خدا کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں جو تمام نوعِ انسانی کی نشوونما کا کفیل ہے۔

اس اَسْلَمْتُ کے اندر فرماں پذیری اور فدا کاری، اتباع و اطاعت، سرفروشی و جاں سپاری، خود فراموشی اور خدا مستی کے جذب و کیف کی ایک دُنیا جنباں و رقصاں نظر آرہی ہے۔ اُس آقائے حقیقی نے کہا کہ

جھک جا اور وہ جھک گئے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس خصوصیت کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اللہ کے حضور قلبِ سلیم لے کر آئے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (۳۷/۸۴ نیز ۲۶/۸۹)

(یاد کرو) جب ابراہیم اپنے پروردگار کی طرف جھکنے والے قلب سے متوجہ ہوا۔

قلبِ سلیم اور طبعِ حلیم اللہ کے سامنے قلبِ سلیم اور نوعِ انسانی کی مصیبتوں پر خون ہو کر بہ جانے والا دل۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ (۱۱/۷۵)

صاحبِ بصیرت و قوت رقیق القلب اور سلیم الطبع ہونے کے ساتھ ہی علم و بصیرت کی بھی ان بلندیوں پر جو امامتِ نوعِ انسانی کے شایانِ شان تھیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ (۲۱/۵۱)

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کے درجے کے مطابق سمجھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور ہم اس کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔

پھر اس عقل و فراست کے ساتھ ساتھ قوتِ بازو بھی ایسی عطا ہوئی تھی جو حکومتِ الٰہیّہ کے قیام کے لئے ازبس ضروری ہے۔

وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ ۝ (۳۸/۴۵)

اور (اے پیغمبر!) ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے (یعنی جسمانی طاقت کے مالک اور حقائق پر نظر رکھنے والے تھے)۔

ان خصوصیات پر نگاہ ڈالئے اور پھر حضرت ابراہیمؑ کی رفعتِ شان اور بلندیٔ مرتبت کا تصور کیجئے۔ شرفِ انسانیّت کا کون سا گوشہ ہے جو اس پیکرِ خلّت و صداقت اور مظہرِ رشد و سعادت کے حریم

ایک ذات میں پوری ملّت قلب میں جلوہ ریز نہ تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ منصبِ قیادت و امامت کے لئے سزاوار بھی وہی ہوتا ہے جس کی ذات

میں اُمّت کے تمام صالحہ افـــراد کے جوہر یک جا مرکوز ہوں۔ اس حقیقت بالغہ کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر سورۂ نحل کی اس آیتِ جلیلہ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ رُوح بصیرت کس طرح وجد میں آتی ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ (۱۶/۱۲۰)

بلاشبہ ابراہیم (اپنی شخصیت میں) ایک پوری اُمّت تھا، اللہ کے آگے جُھکا ہوا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ایسی جامع شخصیت کہ اس کے اندر پوری کی پوری اُمّت سمو رہی تھی اور اُمّت بھی قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز، ہر طرف سے مُنہ موڑ کر صرف ایک آقا کی غلام، اس کی حکومت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانے والی! ایسی اُمّتِ مسلمہ ایک ذات کے اندر چھپی بیٹھی تھی جیسے ایک عظیم الشان نخیلِ بلند ایک ننھے سے بیج کے اندر محوِ خواب ہو۔ امام درحقیقت پوری کی پوری اُمّت اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ ان کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر، ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا ترجمان اور ان کی جملہ خصوصیاتِ حسنہ کا حامل ہوتا ہے۔ امام تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے غبارِ ناقہ میں پورا کارواں چھپا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

بچشمِ کم مبیں تنہائیم را
کہ من صد کارواں گل در کنارم

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ (۱۶/۱۲۰)

اسلامی اصولِ معاشــرہ کی رُو سے، فرد کی تکمیلِ ذات کے لئے جماعت کا وجود لاینفک ہے لیکن جماعت بھی تو افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں جماعت، افراد کے تابندہ جوہروں کا مجموعی پیکر ہوتی ہے وہاں ایک فرد، جماعت کی خصوصیاتِ کبریٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ فرد اور جماعت کا یہ تعلق ایسا لاینفک اور گہرا ہے جس میں آپ ایک کو دوسرے سے کبھی الگ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جس شخص کو جماعت کی امامت و نیابت کے لئے منتخب کیا جائے اس میں تو جماعت کے تمام جوہر بدرجہ اتم منعکس ہوں گے۔

جنابِ خلیلؑ اللہ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف گوشوں پر گہری نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی ساری زندگی شرک کے خلاف ایک مستقل جہاد تھی۔ شرک کے معنی ہیں، خدا کے قانون کے ساتھ کسی اور قوت کا قانون شریک کر لینا۔ اُس کی اطاعت کے ساتھ دوسری قوتوں کی بھی اطاعت کرنا۔ اُس کے احکام کے علاوہ اوروں کے فیصلوں کے سامنے جُھکنا۔ حضرت ابراہیمؑ کی ساری زندگی شرک کے خلاف جدوجہد میں گزری۔ شرکِ جلی کے خلاف آپ کی بغاوت و سرکشی کے واقعات سابقہ اوراق میں گزر چکے ہیں۔ ان سے بھی آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ اس زمانے میں، جبکہ ساری دُنیا محسوسات کے بُت کدوں میں گھری ہوئی تھی، اس موحدِ اعظم نے کس قدر خالص توحید کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی۔ فرمایا کہ ان بُتوں کے مقابلہ میں جن کی تم پرستش کرتے ہو، دیکھو کہ جس خدا کے قانون کی میں اطاعت کرتا ہوں وہ کیسا ہے؟

توحید کا مقامِ بلند

اَلَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَهُوَ یَهۡدِیۡنِ ۙ وَ الَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ۙ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ۪ۙ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ۙ وَ الَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ؕ (۲۶/۸۲-۷۸)

ابراہیم نے کہا کہ میرا اللہ وہ ہے جس نے مجھے اپنے قانونِ تخلیق کی رُو سے پیدا کیا ہے اور وہی اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق میری راہ نمائی فرماتا ہے۔ میرے جسم کی پرورش کے لئے سامانِ خورد و نوش بھی اس کے قانون کے مطابق پیدا ہوتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا بھی اُس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ موت اور حیات بھی اس کے قانون سے وابستہ ہے اور اُس کے قانون سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ نتائجِ اعمال کے وقت مجھے تخریبی عناصر کے اثرات سے محفوظ رکھے گا۔

غور کیجئے کہ اُس زمانے میں جبکہ انسانی ذہن زندگی کے ایک ایک شعبے کے لئے الگ الگ معبود تراشتا اور ان کے حضور سجدہ ریز ہوتا تھا۔ اس موحد کی نگاہ کس طرح ان تمام امور کے لئے ایک خدا کے قانون تک پہنچ رہی ہے۔ یہی توحید ہے، یعنی ساری کائنات میں ایک خدا کے قانون کا نافذ العمل ہونا۔

ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے چاند، سورج، ستاروں کے مشاہدات کے بعد علانیہ کہہ دیا کہ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ (۶/۷۷) میں کسی ایسی قوت کو اپنا اللہ ماننے کے لئے

تیار نہیں جو تغیّر پذیر ہو۔ اس اعلان پر بہ نگاہِ تعمق غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے اندر جس طرح آج سے چار ہزار سال پیشتر کے "عہدِ تاریک" کے ایک عام انسان کے لئے توحید کا پورا انصاب موجود تھا، اسی

اُفل کا مفہوم

طرح عصرِ حاضر کے بڑے سے بڑے فلاسفر کے لئے بھی اس دانشِ نورانی میں غور و تفکّر کی ایک دنیا مستور ہے۔ آج یہ چیز فلسفہ کے مسلّمات میں سے ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیّر پذیر ہے۔ حتّٰی کہ خود زمانہ (TIME) تسلسلِ حوادث کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سب 'اُفل' ہیں تغیّر و تبدّل کے اثرات سے بلند فقط خدائے حیّ و قیّوم کی ایک ذات ہے جو زندہ اور قائم ہے اور اپنے قیام میں کسی خارجی قوّت کی محتاج نہیں۔ ہر 'اُفل' سے مُنہ موڑ کر خدائے حیّ و قیّوم کی طرف مراجعت، یہ ہے توحیدِ خالص اور یہی ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر ایک مردِ مؤمن دنیا بھر کی شعلہ سامانیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است — معنیٔ اسلام ترکِ آفل است

چوں زبندِ آفل ابراہیمؑ رست — درمیانِ شعلہ ہا نیکو نشست

ملّتِ ابراہیمیؑ کی اتّباع

یہی ہے وہ مسلکِ ابراہیمیؑ جس کے اتّباع کا حکم جنابِ نبیٔ اکرمؐ اور حضورؐ کی وساطت سے ملّتِ حنیفہ کو ملا۔ سورۂ نحل کی آیاتِ ذیل پر غور فرمایئے۔

وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ

(۱۶/۱۲۲)

اور ہم نے (ابراہیم کو) دنیا میں بھی خوشگواریاں دیں اور آخرت میں بھی۔ بلاشبہ اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہو گی۔

اس کے بعد فرمایا:-

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۶/۱۲۳)

اور پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ (اسی) ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو۔ ہر طرف سے کٹا ہوا (صرف دینِ حق ہی پر کاربند رہنے والا) اور جو مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اس مسلک سے انحراف حماقت ہے (۲/۱۳۰) اور یہی وہ مسلک ہے جس کی وصیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے فرمائی تھی (۲/۱۳۲)۔ انسانی تحریفات نے حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم میں بہت سا ردّ و بدل کر دیا اور یوں رفتہ رفتہ توحید کی یہ شمع نورانی، ذہنِ انسان کے تصورات کے رنگین فانوس میں گھر کر رہ گئی۔ یہود و نصاریٰ نے اس دینِ خداوندی کی عالمگیریت کو نسلوں اور فرقوں میں محدود کر کے اس بحرِ بیکراں کو جوئے کم آب میں بدل دیا، تا آنکہ جوارِ کعبہ میں اُس رسول کَآفَّةً لِّلنَّاسِ (۳۴/۲۸) کی بعثت ہوئی جس کے لئے

تعلیمِ ابراہیمی قرآن کے اندر

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے وقت دعائیں مانگی تھیں۔ وہ آنے والا آیا اور تعلیمِ ابراہیمی کو تمام انسانی تحریف و الحاق سے پاک اور صاف کر کے اُس کی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآنِ کریم نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ .... وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ○ (۳/۶۵-۶۸)۔

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو (کہ ان کا طریقہ یہودیت کا طریقہ تھا یا نصرانیت کا طریقہ تھا) حالانکہ تورات اور انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بندیاں قائم کی گئی ہیں) نازل نہیں ہوئی ہیں مگر اس کے بہت بعد (پس ظاہر ہے کہ جس گروہ بندی کا اُس وقت وجود ہی نہ تھا وہ کیونکر اس کا پیرو ہو سکتا ہے؟) کیا (اتنی سی موٹی بات بھی) تم نہیں سمجھ سکتے؟ دیکھو، تم وہ لوگ ہو کہ تم نے ان باتوں میں تو نزاع کی، جن کے لئے (کچھ نہ کچھ) تمہارے پاس علم موجود تھا، لیکن تم اس بارے میں کیوں نزاع کرتے ہو، جس کے

---

[۱] حتیٰ کہ ابراہیمؑ کے ساتھ سب سے بڑی نسبت رکھنے کے مدّعیان، یہود و نصاریٰ کے ہاں، حضرت ابراہیمؑ کی کتاب کا ذکر تک نہیں۔ ان کے صحف کا تذکرہ بھی قرآنِ کریم ہی میں ہے جس نے ان کتابوں کی صحیح تعلیم کو اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (۸۷/۱۸-۱۹) (نیز ۵۳/۳۶-۳۷)

یقیناً یہ پہلے صحیفوں میں (بھی) تھا، صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں۔

لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ؟ اور اللہ (سب کچھ) جانتا ہے مگر تم کچھ نہیں جانتے ۔ (یہ سب جہل و تعصب کی باتیں ہیں) ابراہیم نہ تو یہودی تھا نہ نصرانی (اور نہ کسی دوسری مذہبی جتھا بندی کا پیرو) بلکہ (اپنے عہد کی تمام گمراہیوں سے) ہٹا ہوا خدا کا فرماں بردار بندہ ! اور یقیناً اس کی راہ شرک کرنے والوں کی راہ نہ تھی. فی الحقیقت ابراہیم کے نزدیک تر لوگ تو وہ تھے جو اس کے قدم بقدم چلے. نیز اللہ کا یہ نبی ہے اور وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لائے ہیں! اور یاد رکھو اللہ انہی کا مددگار ہے جو (سچا) ایمان رکھنے والے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ...... فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

(نیز ۲/۱۴۰) (۲/۱۳۷ — ۱۳۵)

اور (دیکھو، یہود و نصاریٰ، دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہدایت صرف انہی کے حصے میں آئی ہے) یہودیوں نے کہا، یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے. نصاریٰ نے کہا، نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے لیکن تم کہو، نہیں، خدا کی راہ تو وہی "حنیفی" راہ ہے جو ابراہیم کی راہ تھی اور یقیناً وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا. (اے پیروانِ دعوتِ قرآنی!) تم کہو ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل ہوا ہے، نیز ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیم کو، اسمٰعیل کو، اسحاق کو، یعقوب کو اور اولادِ یعقوب کو دی گئی تھیں اور (صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ) اُن تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دُنیا کے دیگر نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی تھیں۔ ہم ان میں منصبِ رسالت کے اعتبار سے کوئی تفریق نہیں کرتے. ہم خدا کے فرمانبردار ہیں ! پھر اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو اسی صورت میں یہ ہدایت یافتہ کہلا سکتے ہیں. لیکن اگر اس سے روگردانی کریں، تو پھر سمجھ لو کہ ان کی راہ (طلبِ حق کی جگہ) مخالفت اور ہٹ دھرمی کی راہ ہے. پس (ان سے قطع نظر کر لو اور اپنے کام میں سرگرم رہو) وہ وقت دور نہیں جب اللہ کی مدد تمہیں ان مخالفتوں سے بے پروا کر دے گی. وہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے!

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اُمّتِ مُسلمہ کے لئے ملّتِ ابراہیمی کے اتباع کی تلقین فرمائی ہے[1]
اس لئے کہ اسلام کی بنیاد توحیدِ خالص پر ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۳/۹۵)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہو اللہ نے سچائی ظاہر کردی پس (اگر تمہارے دلوں میں کچھ بھی سچائی کا پاس ہے تو چاہیئے کہ) ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو (جس کی طرف میں دعوت دے رہا

---

[1] مغرب کے متعصب مستشرقین کی ہمیشہ یہ ناکام کوشش رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ ظاہر کیا جائے کہ نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) اِدھر اُدھر سے خیالات کو مستعار لیا اور ان کے مجموعہ کا نام اسلام رکھ دیا۔ اس کے لئے وہ اسلام کے کسی عقیدہ کا ماخذ تورات کو قرار دیتے ہیں اور کسی کی سراغ رسانی کے لئے اس زمانے کے عربوں کے عام عقائد و خیالات کی چھان بین کرتے ہیں اور اس "ریسرچ" سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں۔ اس قسم کی ایک ناکام کوشش پادری ٹسڈل (REV: CLAIR TISDALL) کی کتاب ینابیع الاسلام THE SOURCES OF ISLAM، جس کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ سر ولیم میور نے کیا تھا اور جس کے نزدیک کتاب کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ "تمام مشرق میں اس کی اشاعت نہایت گرم جوشی سے کی جائے۔" یہ لوگ اگر بجائے اس کے کہ اسلام کے متعلق خود ہی ذہن میں ایک تصوّر قائم کرکے پھر اس کی تردید کے سامان فراہم کرنے کی فکر میں مارے مارے پھرتے، خود اسلام سے پوچھ لیتے کہ اس کا دعویٰ کیا ہے تو اس قدر پریشان کن زحمت سے بآسانی بچ جاتے۔ اسلام تو اس کا مدّعی ہی نہیں کہ وہ کوئی نیا دین ہے۔ اس کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ وہ تمام صداقتیں جو شروع سے حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک آتی رہی ہیں اور جنہیں انسانوں نے مسخ کردیا، یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس تعلیمِ خداوندی کو ایک مرکزی حیثیت سے حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اس دین کا نام بھی ملّتِ ابراہیمی رکھ دیا۔ اس کے بعد یہ بتانا کہ اسلام کی فلاں تعلیم کا سراغ فلاں فرقے کے یہاں ملتا ہے، اسلام کے دعوے کی تائید ہے نہ کہ تردید۔ سابقہ تعلیم کے اوراقِ پریشاں (اپنی مسخ شدہ حالت میں) مختلف مذاہب میں ملیں گے۔ لیکن قرآن میں وہ تمام قوانینِ خداوندی اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہیں۔ لہٰذا قرآن اب تمام نوعِ انسانی کے لئے دینِ خداوندی کا واحد اور مکمل ضابطہ ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔

ہوں (اور) جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف اللہ ہی کا ہو رہنا ہے اور یقیناً ابراہیم شرک کرنیوالوں میں سے نہ تھا۔

اسلام کیا ہے؟ یہ مسلک کیا ہے؟ اپنے ہر فیصلے کے لئے قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ اس سے بہتر مسلک اور کون سا ہو سکتا ہے؟ شرح اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، اسلام کا نقطۂ ماسکہ یہی مسلک ہے :-

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ○ (۴/۱۲۵)۔

اور (بتلاؤ) اس آدمی سے بہتر دین رکھنے والا کون ہو سکتا ہے جس نے قوانینِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دیا اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی اور اس طرح اُس نے ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی جو صرف خدا ہی کے لئے ہو رہا تھا۔ اور (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست مخلص بنا لیا تھا (جس سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے)۔

یہی وہ راہِ ہدایت و سعادت ہے جس کی اقتدا کا حکم قرآنِ کریم نے دیا ہے (دیکھئے ۹۴ - ۸۴/۶)۔ جو دین ان حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتا رہا، اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ ایک ہی شمع ہے جس کی مختلف کرنیں ہیں، ایک ہی لڑی ہے جس کے مختلف موتی ہیں، ایک ہی چشمہ ہے جس کی مختلف ندیاں ہیں، ایک ہی ابرِ رحمت ہے جس کے مختلف قطرات ہیں۔ ان میں تخالف و تبائن، انسانی قطع و برید نے پیدا کر دیا۔ ان اختلافات کو مٹانے اور ملّتِ ابراہیمیؑ کو اس کی اصلی شکل میں اجاگر کرنے کے لئے حضور خاتم النبیین تشریف لائے (۱۶۱ — ۱۶۲/۶) یعنی وہی توحیدِ ابراہیمیؑ اپنے حقیقی

نام بھی وہی مُسلم رنگ میں، وہی "شرابِ طہور" مرورِ زمانہ سے تندی اور تیزی میں اور بھی بڑھی ہوئی، حتّٰی کہ لیبل بھی وہی پُرانا کہ "جعلی اور اصلی" مال کے پہچاننے میں کسی کو دقّت نہ ہو یعنی "مسلم" (۲۲/۷۸)۔ اب دنیا میں اسلام (دینِ حقیقی) قرآنِ کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ (بلکہ حضرت نوحؑ) سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک، تمام انبیائے کرامؑ کی تعلیم یا تو حوادثِ ارضی و سماوی سے ضائع ہو چکی ہے اور یا انسانی تحریفات سے مسخ۔ ان تمام

حضرات کی حقیقی اور اصلی تعلیم اب قرآن کے اندر محفوظ و مصئون ہے۔ اس لئے یہی اسلام ہے، یہی اللہ کا متعین فرمودہ دین ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں اس حقیقتِ باہرہ کو نہایت دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کر لیں! حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے طوعًا و کرہًا مگر سب اسی کے حکم کا فرماں بردار ہے اور ہر ایک کا قدم اس کی طرف اُٹھ رہا ہے۔

اسلام کے متعلق ایک اصولی نکتہ

یہاں ایک اصولی حقیقت کو بیان فرمایا کہ جب کائنات کی ہر شے ایک متعینہ نظام کے تابع چل رہی ہے تو کیا انسان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بھی اللہ کے نظام (دین اللہ) کے تابع چلے؟ وہ دین اللہ کیا ہے؟

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۸۴)۔

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو (ہماری راہ تو یہ ہے کہ) ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز جو کچھ موسٰے کو اور عیسٰی کو اور خدا کے دیگر تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہے اُس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرماں بردار ہیں۔

صرف قرآن کے اندر

تمام انبیائے سابقہ کی خالص تعلیم جو اب مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا (قرآنِ کریم) کے دفتین میں محفوظ ہے، یہ ہے اسلام۔ اس کے علاوہ کسی اور

مسلک کا اتباع خدا کے ہاں قبول نہیں۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۳/۸۵)۔

اور (دیکھو) جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہو گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرالامر اس کی جگہ ان لوگوں میں ہو گی جو تباہ و نامراد ہوں گے!

اب اس کے بعد وہ عظیم اصول ہمارے سامنے آتا ہے جس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ نے ملّتِ حنیفہ کی تاسیس فرمائی۔ حضرت نوحؑ کے تذکرۂ جلیلہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جن انسانی

قومیّت اور اسلام

حدود و قیود کی بنا پر دنیا میں انسانوں کی تقسیم عمل میں لائی جا رہی ہے، یہ سب طاغوتی تقسیمات ہیں۔ اللہ کا متعیّن فرمودہ دین (اسلام) نسل، رنگ، زبان، وطن کی تمام حدود کو مٹا کر صرف ایک معیارِ تقسیم باقی رکھتا ہے اور وہ معیار ہے اللہ اور غیر اللہ کا۔ دُنیا کے تمام انسان جو قوانینِ الٰہیہ کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیں (مومنین)، وہ ایک قوم اور جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی محکومیت میں زندگی بسر کریں، وہ دوسری قوم۔ یہ ہے وہ اصل الاصول جس کی رُو سے ملّتِ اسلامیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس اساسی تقسیم کی رُو سے اپنے اور بیگانے کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ ہر وہ بیگانہ، جو حکومتِ الٰہیہ کے شامیانے کے نیچے آ جائے، یگانہ ہو جاتا ہے اور ہر وہ یگانہ جو اپنے آپ کو اس کے سائے سے باہر رکھے گا، بیگانہ بن جاتا ہے۔ حضرت نوحؑ سے جب کہا گیا کہ تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں اس لئے کہ وہ غیر اللہ کی غلامی اختیار کئے ہے تو یہ اسی تقسیمِ الٰہیہ کی بنیاد پر تھا۔ اس محکم بنیاد نے حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ مقدسہ سے ایک بلند و بالا عمارت کی صورت اختیار کر لی جس کی تکمیل حضور خاتم النبیّینؐ کے مقدّس ہاتھوں سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ درخشندہ اصول اپنے اعزّہ اور قوم کے سامنے پیش کیا کہ

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۱۴/۳۶)

تو جو میرے پیچھے چلا وہ میرا ہوا۔ جس نے میرے طریقے سے نافرمانی کی (اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں) اور تو "غفور الرحیم" ہے۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وہ محکم بنیاد ہے جس پر ملّتِ اسلامیہ کی پوری عمارت قائم ہے۔ اس

اصول کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے باپ اور اس کے بعد اپنی پوری کی پوری قوم سے اعلانِ بیزاری کر دیا اور ان سے یکسر قطع تعلق کر لیا۔

وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ ۫ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ﴿۱۹/۴۸﴾۔

میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔

پھر وطن کو چھوڑا تو اس انقلاب آفریں اصول کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ اگر کبھی دین اور وطن میں آویزش ہو جائے تو ایک مردِ مومن کا دامن وطن کی گرد سے کبھی آلودہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنا دامن جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوگا اور سب

وطنیت اور اسلام

کچھ چھوڑ کر کسی ایسی فضا میں چلا جائے گا، جو قیامِ حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار ہو اور اسے اپنا مرکز قرار دے کر اس حکومت کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر اس کی ایک نئی قوم ہوگی، نئے رشتے ہوں گے، نئے تعلقات ہوں گے اور ان سب میں وجہِ جامعیت اللہ کی محکومیت کا رشتۂ محکم ہوگا۔ کفر و اسلام کی اس تفریق کے باب میں حضرت ابراہیمؑ نے ایک ایسا کھلا اور واضح مسلک اختیار فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے پیروانِ ملّتِ ابراہیمیؑ کے لئے اُسوہ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دے دیا۔ پہلے سورۂ ممتحنہ کی ان تمہیدی آیات پر غور کیجئے۔ فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ .... لَنۡ تَنۡفَعَکُمۡ اَرۡحَامُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ ۚۛ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ۚۛ یَفۡصِلُ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۶۰/۱-۳﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کا برتاؤ کرنے لگو، حالانکہ (تم جانتے ہو کہ) جو کچھ حق تمہارے پاس آچکا ہے وہ اس کے ساتھ کفر کا برتاؤ کرتے ہیں۔ انہوں نے (محض اس جرم کی پاداش میں) کہ تم اپنے پروردگار، خدا پر ایمان لے آئے ہو، رسولؐ کو اور خود تمہیں بھی شہر بدر کر دیا۔ (سو) اگر تم (واقعی) میرے راستہ میں جہاد کرنے اور میری مرضی طلب کرنے کے لئے (اپنے گھر بار کو چھوڑ کر) نکلے ہو تو کیا پھر چپکے چپکے

ان سے دوستی بھی کرتے ہو؟ (بڑی حیرت ناک بات ہے) جو کچھ تم علانیہ کرتے ہو یا جو کچھ تم خفیہ کرتے ہو، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ (یاد رکھو) جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا وہ سیدھے راستہ سے کھویا گیا۔ (ان کی حالت یہ ہے کہ بظاہر تمہارے دوست بن جاتے ہیں لیکن) اگر انہیں تم پر دسترس حاصل ہو جائے تو وہ (کھلم کھلا) تمہارے دشمن بن جائیں گے اور برائی کے ساتھ تم پر دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں گے۔ اور وہ تو اس کے متمنّی ہیں کہ کاش تم (بھی ان کی طرح) کفر کا شیوہ اختیار کر لو۔ (تو ان کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ اور یاد رکھو) انقلابِ خداوندی کے وقت تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد ہرگز تمہارے کام نہ آئے گی۔ (اُس وقت) خدا تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا اور جو کچھ تم کر رہے ہو، خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

اُسوۂ حسنہ

اس اصول کی تبیین کے بعد فرمایا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ...... حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ .... (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے رفقاء میں ایک بہتر نمونہ موجود ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے (صاف صاف) کہہ دیا تھا کہ ہم تم سے اور تمہارے اُن (معبودوں) سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو (قطعًا) بیزار ہیں۔ ہم (تمہارے ساتھ تعلّقات رکھنے سے یکسر) انکار کرتے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور دشمنی ہمیشہ کے لئے واضح ہو چکی ہے، تا آنکہ تم بھی (ہماری طرح) خدائے یگانہ و یکتا پر ایمان لے آؤ۔

ذرا غور فرمائیے! کس قدر نکھرے ہوئے انداز میں مومن اور غیر مومن کے تعلقات میں امتیاز کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک مومن کا مسلکِ زندگی یہ ہے کہ ع

ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں؟

حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ تا آنکہ وہ خدائے واحد پر ایمان لا کر ہماری ملّت میں شامل نہ ہو جائیں۔ یہ ہیں ملّتِ حنیفہ کے قائدِ اوّلین کے وہ نقوشِ قدم جنہیں آنے والوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اسوۂ حسنہ ہے کس کے لئے؟ صرف اُس کے لئے جو اللہ اور اُس کے قانونِ مکافات پر

ایمان رکھتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ؏ (۶۰/۶)

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی زندگی میں تمہارے لئے یعنی ان کے لئے جو اللہ (کے سامنے حاضر ہونے) اور قانونِ مکافات کی صداقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ایک حسین نمونہ ہے اور جو (اس نمونہ سے) روگردانی کرے تو اللہ (کا نظام) ایسے لوگوں سے بے نیاز اور در خورِ ستائش ہے۔

یعنی جو اس اصول سے مُنہ موڑے اور قومیتوں کی تشکیل نسل یا وطن کی رُو سے کرے تو نظامِ خداوندی کا اس سے کیا بگڑتا ہے؟ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔

اسوۂ ابراہیمیؑ نے ہمارے سامنے جو اصول پیش کیا ہے، اس کی دل آویز وضاحت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

ملّتِ ما را اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

قومِ تو از رنگ و خوں بالاتر است — قیمتِ یک اسودش صد احمر است

اسی اصول کو ایک دل نشین مثال کی رُو سے یوں سمجھئے کہ ؎

نکتۂ اے ہمدمِ فرزانہ بیں — شہد را در خانہ ہائے لانۂ[1] بیں

قطرۂ از لالۂ حمرا ستے — قطرۂ از نرگسِ شہلا ستے

ایں نمی گوید کہ من از عبہرم[2] — آں نمی گوید من از نیلوفرم

اس مثال کے پیشِ نظر ؎

ملّتِ ما شانِ[3] ابراہیمی است

شہدِ ما ایمانِ ابراہیمی است

لہٰذا ؎

نیست از روم و عرب پیوندِ ما — نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

---

[1] لانہ، شہد کا چھتہ۔ [2] عبہر، نرگس۔ [3] شان، شہد کا چھتہ۔

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم　　زیں جہت بایکدگر پیوستہ ایم
رشتۂ مایک تولائیش بس است　　چشمِ مارا کیفِ صہبائش بس است

بازنجویشتن نگر! یہ ہے وہ اسلوبِ حیات جو اسوۂ ابراہیمیؑ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے. لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا یہ بھی سوچئے کہ آج خود ملّتِ ابراہیمی کے مدّعیان کی حالت کیا ہے؟

چہ گویمت ز مسلمان نامسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند　　(اقبالؒ)

اسوۂ ابراہیمیؑ نے سب سے پہلے ہمارے سامنے توحید کی ایسی عملی تعلیم پیش کی ہے جس سے لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ کا صحیح مفہوم وجۂ تابانیٔ قلب و نگاہ بن جاتا ہے. یہ ہمیں اسوۂ ابراہیمی ہی نے بتایا ہے کہ ے

نقطۂ ادوارِ عالم لَآ اِلٰہ　　انتہائے کارِ عالم لَآ اِلٰہ
ایں دو حرفِ لَآ اِلٰہ گفتار نیست　　لَآ اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ اوقہّاری است　　لَآ اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است
(اقبالؒ)

یہی وہ ضربِ لَآ اِلٰہ تھی جس سے اس علمبردارِ توحید نے مرئی اور غیر مرئی ہر قسم کے بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا! لیکن اُس بُت شکن کے نام لیواؤں کی آج کیا حالت ہے؟

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ــــ مسلمان! اپنے قلب و دماغ کو بت کدہ بناتے ہوئے ــ مسلمان!!!
پسرِ خلیل اور نمک پروردۂ نمارید ــ مسلمان!!!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اور اس پر خود فریبی کا یہ عالم کہ ے

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد
بہ نمرودانِ ایں دور آشنا باش زفیضِ شاں براہیمی تواں کرد

فرقہ بندیوں کا شرک دوسری چیز ہمیں اسوۂ ابراہیمی نے یہ بتائی کہ ملتِ حنیفہ دنیا میں صرف "مسلم" کے نام سے پہچانی جائے گی۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نام نہیں ہوگا۔ فرقہ بندی اور گروہ سازی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ (۳۰/۳۲ – ۳۱)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے (قرآن کا اتباع کرو اور) اسی سے ڈرو اور صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ بن جاؤ۔ (یعنی) ان لوگوں میں سے نہ بن جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ اندازی کی اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ پھر ہر گروہ اپنے اعتقادات پر خوش ہے جنہیں وہ لئے بیٹھا ہے۔

لیکن آج ساری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈیئے۔ شیعہ، سُنّی، حنفی، شافعی، مقلد، غیر مقلد سب ملیں گے۔ لیکن جو فقط **مُسْلِم** کے نام سے اپنا تعارف کراتے شاید ہی کہیں ملے اور اگر کوئی کہے بھی کہ میں مسلمان ہوں تو فوراً سوال ہوتا ہے **کون مُسلمان**؟ گویا فقط مسلمان تعارف کے لئے کافی نہیں۔ یہود و نصاریٰ نے بھی حضرت ابراہیمؑ کو انہی گروہ بازیوں میں جکڑنا چاہا تھا لیکن قرآن نے یہ کہہ کر ان تمام بند و سلاسل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے کہ

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (۳/۶۵)

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو (کہ ان کا طریقہ یہودیت کا طریقہ تھا یا نصرانیت کا طریقہ تھا) حالانکہ تورات اور انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بندیاں قائم کی گئی ہیں) نازل نہیں ہوئی ہیں مگر اس کے بہت بعد (پس ظاہر ہے کہ جس وقت اس گروہ بندی

کا وجود ہی نہ تھا، وہ کیونکر اس کا پیرو ہو سکتا ہے ؟ کیا (اتنی موٹی سی بات بھی) تم نہیں سمجھ سکتے ؟

یعنی جن نسبتوں سے تم حضرت ابراہیمؑ کو خالص "مسلم" کے بجائے یہود و نصاریٰ کے نام سے متعارف کرانا چاہتے ہو وہ نسبتیں تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد پیدا ہوئیں۔ اس لئے انہیں ان نسبتوں سے کس طرح موسوم کر سکتے ہو! ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ شیعہ، سُنّی، حنفی اور مالکی (وغیرہ) کی نسبتیں نبیٔ اکرمؐ کے بعد کی پیدا شدہ نہیں ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ فقط مسلم تھے۔ اسی طرح نبیٔ اکرمؐ نہ شیعہ تھے نہ سُنّی، فقط مسلم تھے۔ پھر یہ تعارفی حد بندیاں کیسی ہیں!

لیکن یہ پوچھنا تو آج جُرمِ عظیم ہے۔ اس لئے کہ ان نسبتوں کی محبت مسلمانوں کی رگ و پے میں کچھ اس طرح حلول کر گئی ہے کہ اسے خالی 'مسلم' کہلانے میں لذت ہی نہیں ملتی۔ ہم اس کے سوا اور کیا کہیں کہ ؎

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

نسل اور وطن کے بُت کدے

تیسری چیز اسوۂ ابراہیمیؑ نے ملّتِ اسلامیہ کی تشکیل کا اصولِ اساسی پیش کیا کہ ہر قطرہ جو سمندر میں آ ملا، سمندر ہو گیا۔ اس کی انفرادی شخصیت اجتماعی زندگی میں مدغم ہو گئی۔ لیکن ذرا روئے زمین کے مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ نسل اور وطن کے بند و سلاسل میں کس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ؏

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی

اور پھر اس جغرافیائی حدود کی تقسیم پر ہی اکتفا نہیں، سید، پٹھان، قریش، مرزا کی نسلی تفریق! اور یہ سب ملّتِ ابراہیمیؑ کی نسبت کے دعویدار! اس سے بڑا جھوٹ بھی کہیں سُنا گیا ہے؟ قرآنِ کریم نے جب "مِلَّتِ اِبْرٰهِيْمَ" فرمایا تھا تو اس کے مخاطب فقط قریش نہ تھے جن سے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت، نسبی تھی، بلکہ اس میں دنیا کے تمام مسلمان شامل تھے۔ لہٰذا یہ رشتۂ ابویت اسلامی

تھا۔ تمام مسلمان توحید کے فرزند اور ایک اللہ کے غلام، سب نسبتیں اس ایک نسبت کے اندر مدغم، تمام رشتے اس ایک رشتے میں جذب۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو اوروں نے کیا تھا۔ اب اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے جو پہلے کہا جا چکا ہے کہ ؎

چہ گویمت ز مسلماں نامسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند

ذُرّیّتِ ابراہیمیؑ یہ ہے اسوۂ حسنہ حضرت ابراہیمؑ کا جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ انسانیت کے مقامِ بلند پر فائز المرام فرما کر اُن پر گوناگوں نعمتوں کا اتمام کیا (۱۲/۶)۔ ان نعمائے خداوندی کی ارزانی صرف آپ کی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ آپ کی ذرّیت میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہا (۱۹/۵۸)۔

مُلکِ عظیم بھی آلِ ابراہیمؑ کو نبوّت کے ساتھ مُلکِ عظیم بھی عطا فرمایا۔

فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا ۝ (۴/۵۴)

ہم نے خاندانِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی تھی اور ساتھ ہی عظیم الشان سلطنت بھی عطا فرمائی تھی۔

اس لئے کہ

ایں دو قوّت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

انہیں اقوامِ عالم پر فضیلت عطا فرمائی (۲/۳۳) اور ان کی قیادت و امامت اُن کے سپرد کی۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (۲۱/۷۳)

ہم نے انہیں نوعِ انسانی کی امامت عطا فرمائی اس لئے کہ وہ ہمارے حکم کے مطابق راہ دکھاتے تھے۔

دنیا میں بھی سرفرازی اور عاقبت میں بھی سرفرازی۔

وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (۲۹/۲۷)

اور اُس (کی خوش کرداری) کا اجر دنیا میں بھی دے دیا (کہ نوعِ انسانی کا اسے امام بنا دیا) اور بلاشبہ آخرت میں تو وہ نیک کردار لوگوں میں سے ہے ہی (وہاں بھی اس کا اجر ضائع نہ ہوگا)۔

خدا کی غلامی سورۂ انبیاء کی آیات (۷۲ ــ ۲۱/۷۳) پر پھر غور کیجئے۔ ساری دنیا کے امام اور پیشوا لیکن اللہ کے غلام (وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ)[۲۱/۷۳]۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امامت اور قیادت حاصل ہی خدا کی عبودیت سے ہوتی ہے۔ ایک اللہ کے محکوم اور ساری دنیا کے حاکم اور یہ حکومت کس لئے؟ تاکہ دنیا کو اللہ کی محکومیت سکھائی جائے۔ اسی کی وجہ سے آلِ ابراہیمؑ کو اقوامِ عالم پر برتری اور فوقیت حاصل تھی اور انہیں عظیم الشان حکومت (ملکِ عظیم) عطا ہوئی تھی لیکن اس نبوت اور حکومت میں (معاذ اللہ) برہمنیت اور ملوکیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس کا سلسلہ اگر ذریتِ

موروثیت نہیں ابراہیمؑ (آپ کی نسل) میں قائم رہا تو موروثی حق کی بنا پر نہیں بلکہ جوہرِ ذاتی کی بنا پر تھا۔ اس لئے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت (نسل) کے متعلق دریافت کیا تو آپ سے واضح طور کہہ دیا گیا کہ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲/۱۲۴) "میرے عہد میں ظالمین کا کوئی حصہ نہیں"۔ یعنی یہ عہد مشروط ہے ایمان اور اعمالِ صالح سے۔ وراثت کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ ملّتِ ابراہیمیؑ کے اتباع کے مدعی اس حقیقتِ کبریٰ کو سامنے رکھیں اور پھر سوچیں کہ اُن کی روشِ زندگی کیا ہے۔ آج "دنیائے کفر" کی یہ حالت ہے کہ قریباً ہر قوم نے وراثتی ملوکیت اور برہمنیت کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن قیامت ہے کہ وراثتی ملوکیت اور برہمنیت اگر کہیں ہے تو مسلمانوں میں۔ سنجیدگی سے غور کرنے والوں کے نزدیک کیا اس سے زیادہ الم انگیز حقیقت کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کے حادثۂ فاجعہ کو مسلمان اپنے ہر سانس میں مستوجب ہزار لعنت قرار دیتا ہے اور ملوکیت کی لعنت کو اس طرح اپنے سینہ سے لگائے لگائے پھرتا ہے کہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے ہر ملک اور ہر قوم میں ملوکیت جاری ہے اور آج جب کہ (قریب قریب) ساری دنیا اس لعنت کو دُور کر چکی اور کر رہی

ہے مسلمانوں میں یہ لعنت بدستور قائم ہے۔ جو قوم زندگی کے حقائق کا اسی طرح مذاق اڑائے اُس کا انجام ذلت و خواری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَ یَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ۝ (۲/۱۵) "جو لوگ قوانینِ الٰہیہ سے تمسخر کرتے ہیں اللہ کا قانون ان کی زندگی کا تمسخر اڑاتا ہے۔

باقی رہی برہمنیت (یعنی روحانی ملوکیت) سو اس کے لئے بھی دیکھ لیجئے کہ آج خانقاہیں اور اُن کی موروثی خلافتیں کس قوم کے دماغ پر برف کی سلیں بن کر اُن کے قوائے عملیہ کو مفلوج کئے ہوئے ہیں اور مُلّاازم کی اکاس بیل کس کے شجرِ طیّب کو خزاں کا نشیمن بنائے ہوئے ہے!

احیائے قوم کا سنگین مرحلہ

دنیا میں خدائی انقلاب کی طرف دعوت دینے والوں اور لوگوں کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین سے مُنہ موڑ کر فقط ایک اللہ کے قوانین کی اطاعت سکھانے والوں کی مشکلات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کا کام" مُردوں کو ازسرِ نَو زندگی بخشنے" سے کم دشوار اور سنگین نہیں ہوتا۔ وہ ان کی اصلاح اور صحت بخشی کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اُدھر سے جمود اور بے حسی یا سرکشی اور مخالفت کے سوا کوئی ردِّ عمل نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ کیفیت جس کے اظہار کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں بار بار یہ سوال اُٹھتا تھا کہ اے موت و حیات کے مالک! اس قسم کے مُردوں میں زندگی کس طریق سے پیدا ہوگی؟

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط (۲/۲۶۰)

جب ابراہیم نے کہا اے پروردگار! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرے گا۔

جواب ملا۔

قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ط (۲/۲۶۰)

ارشاد ہوا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں (کہ اس پیغام سے مُردوں کو زندگی مل سکتی ہے؟)

قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ (۲/۲۶۰)
عرض کیا کہ ایمان کیوں نہیں؟ لیکن اس سوال سے مقصود اطمینانِ قلب ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ موت اور حیات (زندوں اور مُردوں) سے وہی مراد ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کس بات کا اطمینان چاہتے تھے۔
پہلے سوال کے متعلق واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر، ان لوگوں کو جو پیغام خداوندی پر کان نہ دھر کر، خلافِ شرفِ انسانیت راستوں پر گامزن رہتے ہیں، اندھے اور بہرے اور مُردے کہا گیا ہے (دیکھئے ۸۰ — ۲۷/۸۱ ؛ ۵۲ — ۳۰/۵۳)۔ خود نبی اکرمؐ کی دعوت کے متعلق کہا گیا ہے کہ "تم خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ۚ (۸/۲۴) "جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرے"۔ ظاہر ہے کہ یہاں "زندگی" سے مراد طبعی حیات نہیں، انسانیت کی زندگی ہے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ قرآن کا پیغام اُسے فائدہ دے سکتا ہے مَنۡ کَانَ حَیًّا (۳۶/۷۰) "جس میں زندگی کی رمق باقی ہو"۔ ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جن مُردوں کو زندگی عطا ہونے کی بابت سوال کیا تھا، اُن سے مراد ان کی وہ قوم تھی جو حیاتِ انسانیت سے عاری ہو چکی تھی۔
دوسرے سوال کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ آپ نے پوچھا یہ تھا کہ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ (۲/۲۶۰) "تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے"۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں! پوچھا یہ گیا ہے کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان مُردوں کو زندگی عطا ہو جائے، یعنی آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس کا تو یقین ہے کہ اس پیغام میں اس کی صلاحیت ہے کہ یہ مُردوں کو زندہ کر دے۔ لیکن مجھے اس کا اطمینان نہیں کہ اس مقصد کے لئے میں جو طریقہ اختیار کر رہا ہوں وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اس لئے مجھے یہ بتا دے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح طریقہ کیا ہے۔ (کَیۡفَ سے یہی مراد ہے)۔
حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تھا کہ یہ لوگ جو دعوتِ حق و صداقت سے اس قدر متوحش ہوتے ہیں کہ اس کے قریب تک نہیں آتے یہ اس سے کس طرح مانوس ہوں گے؟ اس کا جواب ایک مثال کے

ذریعہ سمجھایا گیا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۚ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲/۲۶۰)

ارشادِ الٰہی ہوا، اچھا، یوں کرو کہ جنگل میں سے چار پرندے پکڑ لو اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح تم سے ہل جائیں)۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو (اپنے سے دُور) ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو۔ پھر انہیں بلاؤ وہ (آواز سنتے ہی) تمہاری طرف اُڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

یعنی جب پرندوں تک کی یہ حالت ہے (جو انسان کے سایہ تک سے بدک جاتے ہیں) کہ اگر انہیں کچھ دنوں تک اپنے ساتھ مانوس کر لیا جائے تو اس کے بعد خواہ انہیں کیسا ہی آزاد کیوں نہ چھوڑ دیا جائے ایک آواز دینے پر وہ لبیک! لبیک!! کہتے ہوئے دوڑ آتے ہیں، تو کیا یہ ناممکن ہے کہ انسان (بشرطیکہ ان میں صلاحیت باقی ہو) مسلسل تربیت سے دعوتِ حق و صداقت سے مانوس نہ ہو جائیں اور ان میں یہ تبدیلی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی ایک آواز پر جمع ہو جائیں۔ لیکن اس کے لئے اتنے ہی استقلال و استقامت (PATIENCE) کی ضرورت ہے جتنی ایک وحشی پرند کو ہلانے اور سدھانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کون سی قوم تھی جس کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے ان تاثرات کا اظہار فرمایا تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ ان کی کلدانی زندگی کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں "مُردوں کی زندگی" کا یقین دلایا گیا اور طریقہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا جس قوم کے متعلق ان تاثرات کا اظہار ہوا ہے وہ بالآخر رام ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے گرد ضرور جمع ہوئی ہو گی۔ یہی وہ قوم تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ نے نظامِ خداوندی کو قائم فرمایا تھا۔

بعض لوگ اس واقعہ کو اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کرتے ہیں، یعنی ان کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ حشر کے روز مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اس کے جواب

میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "چار پرندوں کو لے کر اپنے ساتھ ہلالو (پھر انہیں ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) ان کا ایک ایک حصہ چار پہاڑوں پر رکھ دو۔ پھر انہیں بلاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے تیری طرف آجائیں گے۔" ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مرنے کے بعد بھی زندگی عطا کرتا ہے تو اس کے لئے مردہ پرندوں کو زندہ کر دینا کیوں مستبعد ہو؟ لیکن قرآنِ کریم سے اس تفسیر کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ اوّل تو یہ کہ اس کے لئے مندرجہ صدر ترجمہ میں قوسین کی عبارت کا اپنی طرف سے اضافہ کرنا ہوگا، یعنی پرندوں کو ذبح کر کے قیمہ قیمہ کرنے کا واقعہ قرآن کریم میں نہیں۔ اسے اپنی طرف سے بڑھانا ہوگا۔ ثانیاً یہ کہ ایک مردِ مومن کے لئے اللہ اور آخرت پر ایمان، نقطۂ آغاز ہے۔ اس کی زندگی کی تمام عمارت اسی بنیاد پر اُٹھتی ہے۔ اس لئے وہ حیات بعد الموت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تقاضا نہیں کر سکتا۔ ثالثاً یہ کہ دو ہی آیات پیشتر بادشاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مباحثہ کا ذکر ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ نے ذاتِ خداوندی کے متعلق سب سے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَ يُمِيتُ (۲/۲۵۸) "میرا رب وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس لئے آپ کا اللہ تعالیٰ سے یہ کہنا کہ میں طمانیتِ قلب کے لئے یہ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں، قرینہ سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا اور رابعاً اگر اللہ تعالیٰ نے یہی دکھلانا تھا کہ ہم یوں مُردوں کو زندہ کریں گے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ ایک پرندہ کو ذبح کر کے ڈال دیا جاتا اور جب اس میں زندگی کے آثار ختم ہو جاتے تو وہ اُڑنے لگ جاتا۔ اس کے لئے چار پرندوں کا قیمہ کر کے انہیں الگ الگ پہاڑوں پر رکھنا طولانی سا عمل نظر آتا ہے۔ بنا بریں اس واقعہ کا جو مفہوم ہم نے شروع میں لکھا ہے، وہی قرآنی مفہوم معلوم ہوتا ہے فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ (انہیں ہلا کر اپنے ساتھ مانوس کر لو) کا ٹکڑا اس مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔

بہر حال، ان میں سے کوئی مفہوم بھی لیجئے، ایک حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے، یعنی یہ چیز تو کبھی حیطۂ

حضرت ابراہیمؑ کو کسی قسم کا شک نہیں تھا

تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی کہ (معاذ اللہ، معاذ اللہ) حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اللہ تعالیٰ کے مُردوں کے زندہ کرنے کے سلسلہ میں شک کا کوئی شائبہ تک بھی تھا۔ انسانوں کی کفر[1]

[1] اس کے لئے ایک مرتبہ پھر اس واقعہ کو شروع سے پڑھ جائیے اور جو کچھ ابتدا میں لکھا گیا ہے اسے نگاہوں کے

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ضلالت کی روحانی موت کے بعد ہدایت و سعادت کی حیاتِ نو یا حشرِ اجساد، دونوں باتوں پر آپ کا یقین ایک غیر متزلزل ایمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس استحکام و یقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کارگہِ ارض و سمٰوٰت میں اپنی قدرت و ملکوت کے نظارے دکھلاتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (۶/۷۵)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھادیئے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہوجائے۔

یوں بھی، اگر ایک رسول کے دل میں بھی اپنے مشن کی آخری کامیابی (یا دوسرے مفہوم کی رُو سے حیاتِ اُخروی) کے متعلق شُبہ گزرنے لگے تو پھر ہم دنیا میں ایمان کہاں تلاش کریں؛ حضرات انبیائے کرامؑ کا ایمان، اس شک و ارتیاب کی طوفانی دنیا میں، روشنی کے بلند مینار کی طرح مستحکم ہوتا ہے جو، ہر ڈگمگانے والی کشتی کے مسافروں کے لئے دلیلِ راہ اور وجہِ استقامت قرار پاتا ہے۔ دیگر مذاہب کی مبینہ "آسمانی کتابوں" کے محرّف ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ بھی ہے کہ ان میں حضرات انبیائے کرامؑ کے متعلق ایسے ایسے افسانے موجود ہیں جو ہرگز ان کی علوِ شان کے مناسب نہیں۔ قرآنِ کریم نے ان حضرات سے متعلق اس قسم کی تمام لغویات و خرافات کو الگ کرکے ان کی برگزیدہ سیرتوں کو نہایت مقدس انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کی رفعتِ مرتبت کی صحیح صحیح صورت قلب و نگاہ میں منقوش ہوجاتی ہے لیکن کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ شومیٔ قسمت سے ہمارے اسلامی لٹریچر میں متعدد راہوں سے ایسی ایسی چیزیں اندر گھس آئی ہیں جنہیں ان حضرات کی طرف منسوب کرتے ہوئے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اسی واقعۂ زیرِ نظر کو لیجئے۔ بخاری شریف کی روایت ہے:۔

عن ابی هريرة اِن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) سامنے لے آئیے۔ پھر واضح ہوجائے گا کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم کی شقاوت کو دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ یا اللہ! ایسی مُردہ قوم کے زندہ ہوجانے کی کونسی شکل ہوگی؟

نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ
تُحْيِ الْمَوْتٰى۔ (بخاری کتاب التفسیر صفحہ ۶۸ جلد ۳)

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم شک کرنے میں ابراہیم سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے!

اس روایت سے ظاہر ہے کہ خدا کے ایک جلیل القدر نبی (حضرت ابراہیمؑ) نے (معاذ اللہ) اس باب میں شک کیا اور دوسرے عظیم المرتبت نبی (حضور ختمی مرتبتؐ) نے کہا کہ ہم ان سے بھی زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں! اس روایت کی تشریح میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) وسوسۂ شیطانی سے ایسا کہا تھا:

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هٰذَا لِمَا يَعْرِضُ فِي الصَّدْرِ وَيُوَسْوِسُ بِهِ الشَّيْطٰنُ۔

آپ غور فرمائیے کہ یہ روایت کسی طرح بھی حضور نبیٔ اکرمؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟

اسی قسم کی اور روایات

اور صرف اس ایک روایت پر ہی کیا موقوف ہے، حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کئی ایک اور روایات بھی موجود ہیں جو ہرگز ہرگز خدا کے ایک رسول کے شایانِ شان نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے حضرت اسمٰعیلؑ کو صحرائے فاران (مکہ) میں بسا دینے کا واقعہ درج کیا جا چکا ہے جس سے یہ واضح ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالےٰ کی مشیت کے پروگرام کے ماتحت حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے وطن (فلسطین) سے دور حجاز کے علاقے میں آن بسایا تھا کہ یہ بنجر سرزمین جو بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج سے مامون اور اس لئے حضریت کی زہر آلود تہذیب و تمدن سے محفوظ رہنے والی تھی، بنی اسرائیل کی تباہی اور ویرانی کے بعد امانتِ ابراہیمی کی حامل ہو سکے۔ ... ... یہ بھی واضح ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیلؑ سنِ رشد کو پہنچ چکے تھے۔ (ان کی عمر کم از کم ۱۳-۱۴ سال کی تھی جو ایک بیابان کی کھلی ہوا میں پرورش یافتہ بچے کے لئے طفولیت کا زمانہ نہیں، جوانی کی عمر ہوتی ہے) لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ تورات اس واقعہ کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سب کچھ حضرت سارہؑ کے کہنے پر کیا جو رشک و

حسد کی بنا پر چاہتی تھیں کہ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے "شیر خوار" بچے کو "دیس نکالا" دے دیا جائے۔ اس توجیہہ سے اس عظیم واقعہ کی جو حقیقت رہ جاتی ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا جو کیرکٹر (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) سامنے آتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ خود ہمارے ہاں کی کتب روایات میں کیا کچھ موجود ہے۔ بخاری شریف، کتاب الانبیاء میں موجود ہے۔

قال ابن عباس اوّل ما اتخذ النساء المنطق من قبل ام اسمٰعیل اتخذت منطقا لتعفی اثرها علی سارۃ ثم جاء بها ابرٰهیم وبابنها اسمٰعیل وهی ترضعه حتّی وضعهما عند البیت عند دوحة فوق زمزم فی اعلی المسجد ولیس بمکة یومئذ احد ولیس بها ماءٌ فوضعهما هنالك ووضع عندهما جرابًا فیه تمر وسقاءً فیه ماءٌ ثم قفی ابرٰهیم منطلقا فتبعته ام اسمٰعیل فقالت یا ابرٰهیم این تذهب وتترکنا بهٰذا الوادی الذی لیس فیه انس ولاشیء فقالت له ذٰلك مرارا وجعل لا یلتفت الیها فقالت له آللّٰه الذی امرك بهٰذا قال نعم قالت اذًا لا یضیعنا۔

(کتاب الانبیاء، صحیح بخاری، جلد دوم، صفحہ ۱۴۲)

ابن عباس کہتے ہیں کہ اوّل اوّل جس عورت نے گھاگرہ پہنا وہ والدۂ اسمٰعیل ہیں انہوں نے گھاگرہ اس لئے پہنا کہ ان کے نشانِ پا کا سارہ کو پتہ نہ لگے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو لے نکلے اور وہ اس کو دودھ پلاتی تھیں حتّٰی کہ ان دونوں (ماں بیٹے) کو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک بڑے درخت کے پاس زمزم (کی جگہ) کے بالائی طرف کے اوپر کی جانب چھوڑ گئے۔ اور اس وقت مقامِ مکہ میں کوئی شخص نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔ پس وہ وہاں ان دونوں کو چھوڑ گئے اور ان کو ایک ایک تھیلی کھجوروں اور ایک مشک پانی کی دے گئے۔ پھر ابراہیم پیچھے کو چل پڑے اور والدۂ اسمٰعیل ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیمؑ! آپ ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جاتے ہیں جس میں نہ کوئی غمخوار انسان ہے اور نہ کوئی چیز۔ اس نے بار بار ان کو یہ کہا، لیکن وہ کچھ التفات نہ کرتے تھے آخرکار

انہوں نے کہا کہ کیا وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ہاں۔ اس پر انہوں نے کہا تو اللہ ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت ہاجرہ حضرت سارہ کے سلوک سے تنگ آکر ایک مرتبہ گھر سے نکل گئی تھیں۔ مندرجہ بالا روایت میں نقشِ پا مٹانے کے لئے گھاگرہ پہننے سے غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد بخاری کی روایت میں مزید تفصیل درج ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کس طرح پیاس سے بے چین ہوئے اور آپ کی والدہ پانی کی تلاش میں کس طرح پریشان و سرگرداں وادی کے اندر اور پہاڑیوں کے اوپر چڑھتی اُترتی رہیں (یعنی قریب قریب وہی واقعہ جو تورات میں مندرج ہے) حضرت ابراہیمؑ نے ایسا کیوں کیا تھا اُس کی وجہ بخاری کی محولہ صدر روایت کی تشریح (فتح الباری) میں یوں لکھی ہے۔

وكان السبب فى ذلك ان سارة كانت وهبت هاجرة لابراهيم فحملت منه باسمٰعيل فلما ولدته غارت منها فحلفت لتقطعن منها ثلاثة اعضاء فاتخذت هاجر منطقة فشدت بها وسطها و هربت وجرت فيها لتخفى اثرها على سارة ويقال ان ابراهيم شفعا فيها وقال لسارة حللى يمينك بان تثقبى اذنيها وتخفقيها ويقال ان سارة اشتدت بها الغيرة فخرج ابراهيم باسمٰعيل وأمّه الى مكة لذلك۔

اور اس کا سبب یہ تھا کہ سارہ نے ہاجرہ ابراہیم کو بخشش دی تھی اور اس کو اس سے اسمٰعیل کا حمل ہو گیا پھر جب وہ بیٹا جنی تو (سارہ کو) اس کا بہت رشک و حسد آیا اور اس نے قسم کھائی کہ میں ضرور اس کے تین اعضا کاٹ ڈالوں گی (ناک اور دو کان) پس ہاجرہ نے ایک گھاگرہ لیا اور کس کر اس کو اپنی کمر میں باندھ لیا اور بھاگ نکلی اور اس کا دامن گھسیٹتی گئی تاکہ اس کے آثارِ پا کا سارہ کو پتہ نہ لگے اور کہتے ہیں کہ ابراہیم نے اس بارے میں (سارہ سے) سفارش کی اور سارہ کو کہا کہ تو اپنی قسم کو اس طرح پورا کر کہ اس کے ناک کان چیر دے۔ کہا جاتا ہے کہ سارہ کو اس کے ساتھ نہایت ہی سخت رشک ہوا پس اسی وجہ سے ابراہیمؑ

اور اس کی ماں کو مکّہ کی طرف لے نکلے۔
بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ فلما ادرك زوجه........ الخ یعنی جب حضرت اسمٰعیلؑ نے شادی کر لی اور ان کی والدہ فوت ہو گئیں تو ابراہیم علیہ السّلام اپنے بیٹے کے ہاں گئے لیکن حضرت اسمٰعیلؑ انہیں گھر پر نہ ملے تو آپ ان کی بیوی سے کچھ بات چیت کر کے واپس تشریف لے گئے اس کی شرح میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ:۔

وکذا فی حدیث عطاء ابن السائب نحوه فقالت انزل رحمك الله فاطعم واشرب قال انی لا استطیع النزول قالت فانی اراك اشعث افلا اغسل راسك وادهنه قال بلی ان شئت فجائته بالمقام وهو یومئذ ابیض مثل لهاة وکان فی بیت اسمٰعیل ملقی فوضع قدمه الیمنی وقدم الیها شق راسه وهو علی دابته فغسلت شق راسه الایمن فلما فرغ حولت له المقام حتی وضع قدمه الیسری وقدم الیها براسه فغسلت شق راسه الایسر فالاثر الذی فی المقام من ذلك ظاهر فیه موضع العقب والاصبع...... عن ابن عباس ان سارة داخلها غیرة فقال لها ابراهیم لا انزل حتی ارجع الیك ونحوه فی روایة عطاء ابن السائب۔

اور عطاء بن سائب کی حدیث میں ایسا ذکر ہے کہ اس (اسمٰعیل علیہ السّلام کی بیوی) نے (ابراہیم علیہ السّلام سے) کہا اللہ آپ پر رحمت کرے اتریئے، کچھ کھا پی لیجئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اُتر نہیں سکتا۔ اُس نے جواب دیا کہ آپ کے بال بہت اُلجھے ہوئے ہیں کیا میں آپ کا سر دھو کر تیل نہ لگا دوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اچھا تیری مرضی۔ پس وہ ایک پتھر لے آئی اور اُس دن وہ بالکل سفید تھا اور اسمٰعیل علیہ السّلام کے گھر میں پڑا ہوا تھا۔ پس آپ نے اپنا دایاں قدم اس پر رکھا اور اپنے سر کا ایک جانب اس کی طرف جھکا دیا اور آپ سواری پر ہی رہے۔ اس نے آپ کے سر کا دایاں طرف دھو دیا۔ پھر جب وہ فارغ ہو گئے تو وہ پتھر اٹھا کر دوسری طرف لے گئی اور آپ نے اپنا بایاں قدم اُس پر رکھا اور اپنا سر اُس کی طرف جھکا دیا۔ پس اُس نے بایاں جانب ان کے سر کا دھو دیا اور اس پتھر میں ایڑی اور اُنگلیوں کا جو نشان

موجود ہے وہ اسی وجہ سے ہے...... ابن عباس سے روایت ہے کہ سارا پر رشک وحسد نے
بہت غلبہ کیا تو ابراہیم نے کہا میں سواری سے نہیں اُتروں گا جب تک تیرے پاس واپس آجاؤں
عطا ابن سائب کی روایت میں بھی ایسا ہی آیا ہے۔

فتح الباری میں (سعید بن جبیر کی روایت سے) یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی حضرت سارہ سے حلفیہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جب تک ان (حضرت سارہؓ) کے پاس واپس لوٹ نہیں آئینگے سواری سے نہیں اُتریں گے۔ اسی لئے سواری پر بیٹھے بیٹھے سر دُھلانا پڑا۔ یہ چیزیں کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔

حضرت ابراہیمؑ پر بُہتانِ کذب

لیکن ابھی ایک بات اور باقی ہے جسے بصد تأمل و توقف درج کیا جاتا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرات انبیائے کرامؑ کی طرف اس قسم کی چیزوں کی نسبت کس طرح گوارا کی جائے؟ تورات میں ہے:۔

> اور اس ملک میں کال پڑا اور ابرام (ابراہیم) مصر میں گیا کہ وہاں ٹھہرے۔ کیونکہ ملک میں بڑا کال پڑا تھا ۰ اور جب مصر کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی جورو ساری کو کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے ۰ اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی جورو ہے۔ سو مجھ کو مار ڈالیں گے اور تجھے جیتی رکھیں گے۔ تو کہیو کہ میں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیرے وسیلے سے سلامت رہے۔
>
> سو جب ابرام (ابراہیم علیہ السلام) مصر میں پہنچا۔ مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے ۰ اور فرعون کے امیروں نے بھی اسے دیکھا اور فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے ۰ اور اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈی اور گدھیاں اور اونٹ ملے ۰ پر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان کو ابرام کی جورو ساری کے سبب بڑی مار ماری ۰ تب فرعون نے ابراہیم کو بلا کر اسے کہا کہ تُو نے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتایا کہ میری جورو ہے؟ تُو نے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جورو بنانے کو لیا۔ دیکھ یہ تیری جورو حاضر ہے اس کو لے اور چلا جا اور فرعون نے

اس کے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب انھوں نے اسے اور اس کی جورو کو اور جو کچھ اس کا تھا روانہ کیا
(پیدائش ۱۰۔۲۰/۱۲)

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی طرف (خاکم بدہن، توبہ توبہ) دروغ گوئی منسوب کی گئی ہے۔ تورات کے متبعین اسے جس طرح جی چاہے گوارا کریں، لیکن قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے والے اسے سُننا بھی گوارا نہیں کرسکتے۔ ذرا غور فرمائیے۔ دین کی بنیاد رسول کی صداقت کے ایمان پر ہے۔ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ آپ نہ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے دریافت کرسکتے ہیں کہ یہ واقعی تیرا کلام ہے، نہ جبریلِ امین سے اس امر کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ یہ پیغام واقعی خدا کا فرستادہ ہے۔ اس دعوے کی صداقت کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ آپ کا یہ ایمان ہو کہ مدّعی کبھی جھوٹ نہیں بولتا، ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص براہِ راست اس پیغام کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا اور یوں اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ درحقیقت رسول کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے۔ بلکہ وہ رسول کے اس دعوے کی تصدیق علیٰ وجہ البصیرت کرتا ہے۔ لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ دین کی بنیاد رسول کی سچائی کے ایمان پر ہے اس لئے رسول کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ سچائی کا مجسمہ اور صداقت کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کذب کا شائبہ تک اس کے پاس پھٹک نہیں سکتا۔ اس کا قول، فعل، ارادہ، تدبیر، ہر عمل اور ہر حرکت سچائی کی نظیر اور صداقت کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتی ہے۔ اگر کبھی یہ تصور کرلیا جائے کہ رسول بھی (معاذ اللہ) جھوٹ بول سکتا ہے تو دین کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے اس لئے کہ اس کے ایک جھوٹ سے اس کے پیغام کی صداقت میں شُبہ کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے اور جہاں پیغامِ خداوندی کی صداقت میں شک پیدا ہوجائے وہاں دین کا استحکام ناممکن ہے۔ تورات کی مندرجہ صدر روایت میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف (معاذ اللہ) ایک جھوٹ منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن بخاری کی ایک حدیث میں آپ کی طرف (معاذ اللہ، معاذ اللہ) تین جھوٹ منسوب کیے گئے ہیں۔ روایت یوں شروع ہوتی ہے:۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال لم يكذب ابرٰهيم عليه السلام
الا ثلاث كذبات ثنتين منهن فی ذات الله عزوجل قوله انی

سقیم و قولہ بل فعلہ کبیرھم ھذا و قال بینا ھو ذات یوم و سارۃ اذ أتی علی جبار من الجبابرۃ فقیل لہ ان ھھنا رجلا معہ امرأۃ من احسن الناس فأرسل الیہ فسأ لہ عنہا فقال من ھذہ قال أختی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ نے فرمایا) حضرت ابراہیم نے صرف تین جھوٹ بولے تھے جن میں سے دو تو حق تعالیٰ عزّ وجل کی ذات کے بارہ میں تھے۔ (۱) ان کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں (۲) ان کا یہ کہنا کہ نہیں بلکہ یہ اُن کے بڑے بُت نے کیا ہوگا اور آپ نے فرمایا کہ ایک بار حضرت ابراہیم ایک جابر بادشاہ کے (ملک کی طرف گزر رہے تھے اور حضرت سارہ ہمراہ تھیں اس بادشاہ سے لوگوں نے کہا کہ اس شخص کے ساتھ ایک حسین ترین عورت ہے۔ اس نے آپ کو بلایا اور حضرت سارہ کے متعلق پوچھا آپ نے فرمایا کہ وہ میری بہن ہے...... الخ

ان میں سے پہلے دو واقعات (یعنی ستاروں کے متعلق بات چیت اور بُت شکنی کے واقعہ کے بعد قوم سے مکالمہ، قرآنِ کریم نے بیان کئے ہیں (اور ان کا تفصیلی ذکر سابقہ صفحات میں گزر چکا ہے)۔ کیا ان میں کسی قسم کے جھوٹ کا کوئی شائبہ بھی ہے؟ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ تیسرا واقعہ تورات سے مستعار لے لیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اس طرح تین جھوٹ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں اور رسول اللہ کو (معاذ اللہ) ان کذبات کی تصدیق کرنے والا بتایا گیا ہے۔ کیا آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی تصور کر سکتے ہیں کہ یہ حدیث سچ مچ رسول اللہ کی ہو سکتی ہے؟ لیکن ذرا ان حضرات سے پوچھئے جو ان روایات کو دین سمجھتے ہیں۔ وہ ان کی صحت میں شبہ کرنے والے کو "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔[۱]

---

[۱] راقم الحروف نے ایک مرتبہ اپنے ایک مضمون میں اس قسم کی روایات کے متعلق لکھا کہ بجائے اس کے کہ ہم اس بات پر مُصر ہوں کہ یہ سب حدیثیں رسول اللہ کی ہیں چاہیئے یہ کہ ہم اپنے مجموعۂ روایات کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھ لیں اور جو چیزیں معاندین نے قرآنِ حکیم کے خلاف ان مجموعوں میں داخل کر دی ہیں انہیں الگ کر دیں۔ اس پر (جیسا کہ ظاہر ہے) مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔ فتاوے شائع کئے گئے کہ یہ شخص "بے دین و ملحد ہے"... کہ "احادیثِ مقدسہ کو صحیح نہیں مانتا۔ ایک 'محدث' صاحب نے جوشِ رواۃ پرستی میں یہاں تک لکھ دیا کہ "معترض کو حضرت ابراہیمؑ کے تین

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس اسلامی لٹریچر میں معاندین اسلام نے چپکے ہی چپکے اتنا کچھ ملا دیا ہے کہ اسلام جیسا دینِ خالص اس قسم کی افسوسناک شکل اختیار کر گیا ہے اور اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز یہ حقیقت ہے کہ ہزار برس سے یہ سب کچھ ہماری کتابوں میں متواتر چلا آرہا ہے اور کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اسلام کے دامن کو ان بدنما دھبوں سے پاک کر دے۔ اس لئے کہ ان چیزوں کے ساتھ اسلاف پرستی کی عقیدت اس قدر گہرے طور پر وابستہ ہو چکی ہے کہ ان کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا جرمِ عظیم قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے۔ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔ وہ جھوٹ اور سچ اور حق و باطل میں تفریق کرنے والی ہے۔ ان کتبِ روایات کو قرآنی کسوٹی پر کس کر دیکھ لو۔ جو قرآن کے خلاف جائے اسے غلط سمجھو۔ لیکن ایسا کہنے والے کو "منکرِ حدیث" کہہ کر نکو بنا دیا جاتا ہے۔ اسی حدیثِ زیرِ نظر کو لیجئے۔ کیا قرآنی معیار کے مطابق اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی صحیح تصور کیا جا سکتا ہے؟ لیکن چونکہ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے اور اسنادِ روایات کے متعلق جو معیار ان حضرات نے مقرر کر رکھے ہیں ان کے مطابق صحیح قرار پا گئی ہے' اس لئے اسے کبھی غلط نہیں کہا جا سکتا خواہ یہ قرآن سے علانیہ بغاوت کیوں نہ کر رہی ہو۔ اس کی مدافعت میں ایک اور حدیث بیان کر دی جاتی ہے کہ مَا فیھا کذبۃ الا ما حل بھا عن دین اللہ (یعنی

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) جھوٹوں پر تعجب آرہا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں حالانکہ قرآن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پانچ جھوٹ ثابت ہیں۔" (استغفر اللہ ربی!) ان پانچ جھوٹوں کی تفصیل محدث صاحب کے نزدیک یہ تھی:۔ (۱) بت شکنی کا واقعہ۔ (۲) انی سقیم کا واقعہ اور (۳۔۴۔۵) تین مرتبہ ستارہ' چاند اور سورج کو خدا کہنے کا واقعہ ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

ان حضرات کے نزدیک دین یہ ہے کہ امام بخاری یا ان کے راویوں پر کوئی اعتراض نہ پڑ جائے، خواہ ان کی مدافعت میں خدا اور اس کا رسول بھی (خاکم بدہن) لپیٹ میں کیوں نہ آ جائیں۔ ان حضرات کا مذہب یہ ہے کہ جامعینِ احادیث اور رواۃ حضرات منزّہ عن الخطا اور معصوم ثابت کر دیئے جائیں خواہ ایسا کرنے میں (معاذ اللہ) خدا جھوٹ کا بیان کرنے والا' نبی اکرمؐ جھوٹ کی شہادت دینے والے اور حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بولنے والے کیوں نہ قرار پا جائیں۔ اور جو شخص حضرت انبیائے کرامؑ کے احترام اور ان کی عظمتِ سیرت کے پیشِ نظر ان کے مسلک سے اختلاف کی جرأت کرے تو اسے کافر و زندیق قرار دیدیا جائے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا" ابراہیمؑ کے ان تینوں جھوٹوں میں سے ہر ایک اللہ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کے لئے بولا گیا ہے") دیکھا آپ نے! ایک غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کس قدر اور غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ پہلے ایک غلط بات نبیٔ اکرمؐ کی طرف منسوب کر دی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے بعد جب دیکھا کہ اس سے اپنے آپ پر زد پڑتی ہے تو ایک اور روایت حضورؐ کی طرف منسوب کر دی گئی کہ دین کی بھلائی کے لئے اس قسم کا جھوٹ بول دینا کوئی بُری بات نہیں۔ لیکن خود بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے،

> میدانِ حشر میں سب مخلوقِ آدم، نوح علیہما السلام اور دوسرے انبیاء سے شفاعت کے لئے کہہ چکی تو حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ خلیل اللہ ہیں، آپ ہماری سفارش بارگاہِ الٰہی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ مجھ کو شرم آتی ہے۔ اس لئے کہ میں نے تین جھوٹ باتیں کہی تھیں۔　　(بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)

اگر یہ جھوٹ دین کی بھلائی کے لئے بولے گئے تھے اور یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی تو پھر اس پر ایسی ندامت کیوں جس سے قیامت میں نگاہیں جھکی رہیں!! اور یہ کذب کس کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے؟ ان حضرت ابراہیمؑ کی طرف جن کے متعلق خود خدا کی گواہی موجود ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ٥ (۱۹/۴۱)۔ کہ وہ مجسّم سچائی تھا اور اللہ کا نبی۔" صدّیق" بہت زیادہ سچ بولنے والا، بالکل سچا۔ قرآن یہ کہتا ہے اور بخاری کی احادیث آپ (حضرت ابراہیمؑ) کو ایسا جھوٹا بتا رہی ہیں کہ جس کی وجہ سے آپ قیامت کے دن خدا کے حضور جانے کی جرأت نہ کر سکیں (پناہ بخدا۔ پناہ بخدا) اور اس پر بخاری شریف کی یہ حدیثیں بالکل "سچی" اور ان سے انکار کرنے والا ملحد و بے دین! ؏

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

لیکن زمانہ اب رفتہ رفتہ خود قرآن کریم کی طرف آ رہا ہے۔ جس طرح قرآن کریم نے سابقہ کتبِ سماوی کے ان حصوں کو صاف کر دیا جن میں حضرات انبیائے کرامؑ اور ان کی آسمانی تعلیم کے متعلق ذہنِ انسانی نے تصرفات کر رکھے تھے اسی طرح وہ تمام باتیں بھی جو عجمی تصورات اور معاندینِ اسلام کی تزویر و تلبیس کی بناء پر اسلامی لٹریچر میں حلول کر چکی ہیں، قرآن کریم کی روشنی میں صاف صاف نظر آ جائیں گی اور یوں حق و باطل میں کھلی کھلی تفریق ہو جائے گی کہ قرآن کریم نے اپنے آپ کو حق و باطل میں تمیز کرنے والا (اَلْفُرْقَان) بتایا ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس کی زندہ کتاب ہمارے پاس اس کی اصلی شکل میں محفوظ و مصؤن چلی آ رہی ہے اور

قیامت تک کے لئے اسی طرح چلی جائے گی۔ اس پیغامِ خداوندی میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ باطل کو نکھار کر الگ کردے۔ اربابِ فکر ونظر کے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ کو قرآنِ کریم کی طرف ملتفت کرائیں۔ جب حق آجاتا ہے تو باطل از خود فنا ہوجاتا ہے جیسے چراغ آجانے سے اندھیرا کافور ہوجاتا ہے۔ " اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷/۸۱) اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ روشنی سے فنا ہوجاتے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اندھیرا اپنا وجود رکھتا ہی نہیں۔ روشنی کی عدم موجودگی کا نام تاریکی ہے۔ اس لئے جب روشنی آجائے تو تاریکی باقی ہی کہاں رہ سکتی ہے۔ تمسک بکتاب اللہ کے بعد تلبیسِ حق و باطل کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ ؎

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

بہر حال، یہ تھا تذکرۂ جلیلہ جناب خلیلِ اکبر حضرت ابراھیمؑ کا جو ملّتِ حنیفہ کے مورثِ اعلیٰ اور مسلکِ توحید کے عظیم الشان مبلّغ تھے۔

حضرت
اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب
علیہم السلام

حضرت ابراہیمؑ کے فرزند اکبر حضرت اسمٰعیلؑ، فرزند اصغر حضرت اسحٰقؑ اور ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ (علیہم السلام) کا ضمنی تذکرہ خود حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ساتھ آچکا ہے۔ ان حضرات کا اس سے زیادہ تفصیلی ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ قرآنِ کریم ان سب کو اللہ کے برگزیدہ نبی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ ٥...... وَ اذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ۗ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۞ (۳۸/۴۸ — ۴۵)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ہمارے (نیک بندوں) ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا ذکر کرو۔ جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے (یعنی قوت اور توانائی کے مالک اور حقائق پر نظر رکھنے والے تھا۔ وہ ہر معاملہ میں مستقبل کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور اسی بنا پر ہم نے انہیں ایک مخصوص جماعت کے افراد بنا دیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ہمارے حضور میں برگزیدہ اور سب سے اچھے لوگوں میں سے تھے۔ اور (ساتھ ہی) اسمٰعیل، الیسع اور ذاالکفل کو یاد کرو۔ ان میں سے بھی ہر ایک بہت اچھے لوگوں میں سے تھا۔

ان پر جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا اس پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری ہے (اس لئے کہ یہ سب اللہ کے رسول تھے)۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى
وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ
وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۲/۱۳۶ نیز ۳/۸۳)

(اے پیروانِ دعوتِ قرآنی!) تم کہو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر نازل ہوا ہے اور ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیمؑ کو اسمٰعیلؑ کو اسحٰقؑ کو، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کو دی گئی تھیں۔ نیز ان کتابوں پر جو موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کو دی گئی تھیں (اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ) ان تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو اُن کے پروردگار سے ملی ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ حضرات یہود و نصارٰی کی گروہ بندیوں کے بانی نہ تھے بلکہ صرف مسلم تھے اور اسلام ہی کی تعلیم دیتے تھے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ
كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَ مَنْ
اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (۲/۱۴۰)

یا پھر تمہارا (یعنی یہود و نصارٰی کا) دعوٰی یہ ہے کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ بھی، یہودی اور نصرانی تھے؟ (اگر تم جہل و نادانی کی ایسی بات کہہ سکتے ہو تو افسوس تمہاری عقلوں پر) اے پیغمبر! ان سے کہو، تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ ہے؟ پھر بتلاؤ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جس کے پاس اللہ کی ایک شہادت موجود ہو اور وہ اسے چھپائے (اور محض اپنی بات کی پچ کے لئے سچائی کا اعلان نہ کرے؟) یاد رکھو جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہی حکم اپنی اولاد کو دیا اور اس کا اعادہ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا۔

وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ۗ...... قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ
وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ

نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ٥ (۱۳۲—۱۳۳/۲)

پھر اسی طریقہ کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور (اس کے پوتے) یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا "اے میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لئے اس دینِ حقیقی کی راہ پسند فرمالی ہے تو دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو (یعنی فرمانبردار ہو)۔ پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے پوچھا تھا "میرے بعد تم کس کی محکومیت اختیار کرو گے؟" اور انہوں نے جواب دیا تھا "اسی خدائے واحد کی جس کی تو نے محکومیت اختیار کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اسمٰعیل اور اسحٰق نے کی ہے اور ہم اس کے حکموں کے فرماں بردار ہیں!"

حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق فرمایا کہ

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ (۱۹/۵۴)۔

اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں یعنی قرآن میں) اسمٰعیل کا ذکر کر۔ بلاشبہ وہ اپنے قول کا سچا تھا اور (اللہ کا) فرستادہ نبی تھا۔

اسمٰعیلؑ اسمٰعیل عبرانی لفظ "شماع" (سماع۔ سننا) اور ایل (اللہ) سے مرکب ہے۔ چونکہ آپ کی پیدائش حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اس لئے آپ کا نام "خدا کا سُننا" (اسمٰعیلؑ) رکھا گیا۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔

چونکہ یہود اور نصاریٰ دونوں کو چڑ ہے کہ جس شارعِ اقدس کے کِل سر سبد حضور ختمی مرتبت حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہیں اُسے (غاکم بدہن) کسی خیر و برکت کا حامل نہ قرار دیا جاسکے اس لئے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کو حضرت اسحٰقؑ کے مقابلہ میں بہت گھٹا کر پیش کریں۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کی یہ کوشش بھی شامل ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بجائے حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح اللہ قرار دیا جائے۔ ایک مسلمان کے ذہن میں اس قسم کی تحقیر و تنکیر (بلکہ ایسے تقابل) کا تصور بھی نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ دونوں حضرات اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵) (ہم اللہ کے رسولوں میں کسی میں تفریق نہیں کرتے)۔ لیکن واقعات سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات کی ضد نے یہاں تک جرأت پیدا کر دی کہ انہوں نے توریت میں تحریف کر کے ذَبِیحُ اللہ کے لئے حضرت اسحٰقؑ کا نام تک بھی لکھ دیا لیکن نام بدلتے وقت یہ یاد نہ رہا کہ اس کے تضمنات میں بھی اسی نسبت سے تبدیلی کرنی چاہیئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جس باب میں یہ واقعہ درج ہے اس میں ایک ایسی چیز باقی رہ گئی جس سے ان کی تحریف بالکل بے نقاب ہو گئی۔ کتاب پیدائش کے بائیسویں باب میں یہ واقعہ درج ہے اور اس کی دوسری آیت میں یہ فقرہ ابھی تک موجود ہے :-

”ذَبِیحُ اللہ“ کون ہے؟

تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے، ہاں اپنے اکلوتے بیٹے کو جسے تو پیار کرتا ہے، اسحٰق کو لے۔ (۲۲/۲)

یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جس بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے وہ اکلوتا تھا اور خود تورات کا بیان ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش حضرت اسمٰعیلؑ کے (THE ONLY SON) پیدا ہونے کے تیرہ چودہ برس بعد ہوئی۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب حضرت ابراہیمؑ کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا تھا، یعنی یہ واقعہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے پہلے کا ہے اور اس وقت صرف حضرت اسمٰعیلؑ موجود تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ کتاب پیدائش کے بائیسویں باب کی دوسری آیت میں حضرت اسحاق کا نام بعد کا اضافہ ہے اور اس تحریف کا نتیجہ جو اس کتاب میں کھلے بندوں کی گئی ہے۔

قرآنِ کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں خدا کی راہ میں قربان کر رہا ہوں۔ کہو، تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بیٹے نے عرض کیا کہ ابا جان! جو کچھ آپ کو اشارہ ملا ہے، بلا تامل اس کی تعمیل کیجئے۔ آپ انشاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیٹا خود ذبح ہونے کے لئے تیار تھا اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کی قربانی بطیبِ خاطر کر رہا تھا۔ لیکن تورات میں ہے :-

> تب اسحاق نے اپنے باپ ابراہام سے کہا کہ اے میرے باپ! اس نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے! میں حاضر ہوں۔ اُس نے کہا دیکھ آگ اور لکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لئے برہ کہاں ہے؟ ابراہام نے کہا کہ اے میرے بیٹے! خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لئے برہ کی تدبیر کرے گا۔ سو وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے ۔ اور وہ اس مقام پر جس کی بابت خدا نے اس سے کہا تھا پہنچے۔ تب ابراہام نے وہاں ایک قربان گاہ بنائی اور لکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اسحاق کو

باندھا اور اسے قربان گاہ میں لکڑیوں کے اوپر دھر دیا۔ (پیدائش ۷ ـ ۲۲/۹)

یعنی ذبح ہونے والے بیٹے کو علم تک نہ تھا کہ قربانی کس کی دی جائے گی چہ جائے کہ وہ اپنی خوشی سے ذبح ہونے کے لئے آیا ہو اور اس کے پوچھنے پر آپ نے بھی نہیں بتایا کہ کون ذبح ہوگا۔ اس کے بعد تورات میں مذکور ہے کہ:

> پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر مت بڑھا اور اسے کچھ مت کر کہ اب میں نے جانا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لئے کہ تو اپنے بیٹے، ہاں اپنے اکلوتے کو مجھ سے دریغ نہ کیا۔ تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔ اور ابراہام نے اس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا۔ چنانچہ یہ آجتک کہا جاتا ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے۔
>
> (پیدائش ۱۲ـ ۲۲/۱۴)

دیکھئے یہاں پر اکلوتا بیٹا کہا گیا ہے۔

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کے بڑے بیٹے عیسو (جو بعد میں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے) کی شادی حضرت اسمٰعیلؑ کی صاحبزادی سے ہوئی اور وہ (ادوم) انہیں کے پاس آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی وسعت اور خوشحالی عطا فرما رکھی تھی۔ ان کے قافلے شام اور مصر تک تجارت کرتے تھے۔ فلسطین میں حضرت اسحاقؑ کی اولاد بھی بہت بڑھی اور پھولی۔ تاریخ کے اوراق میں ان دو شاخوں (اسمٰعیلی اور اسرائیلی) کے باہمی مخالفانہ الجھاؤ اور تصادم و تجارب کے واقعات بھی درج ہیں۔

حضرت یعقوبؑ

حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹے (عیسو اور یعقوب) توام پیدا ہوئے تھے (پیدائش ۲۶ـ ۲۵/۲۵)۔ ان میں سے عیسو بڑا تھا اور اس زمانہ کے قانون کی رُو سے باپ کی سرداری کا وارث بڑا بیٹا ہوتا تھا۔ تورات میں (حسبِ معمول) ایک عجیب قصہ مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے (معاذ اللہ) ایک چال چل کر اپنے بڑے بھائی سے حقِ وراثت اور اپنے والد (حضرت اسحٰقؑ) سے دعائے برکت حاصل کر لی۔ اس میں لکھا ہے کہ

اور ہوا یوں کہ جب اسحٰق بوڑھا ہوا اور اس کی آنکھیں ایسی دھندلا گئیں کہ وہ دیکھ نہ سکتا تھا تو اس نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بیٹے! وہ بولا دیکھ میں حاضر ہوں ۵ تب اس نے کہا کہ اب دیکھ میں بوڑھا ہوا اور میں اپنے مرنے کا دن نہیں جانتا ۵ سو اب میں تجھ سے منت کرتا ہوں کہ اپنا ہتھیار اور اپنا ترکش اور اپنی کمان لے اور جنگل کو جا اور میرے لئے شکار کر ۵ اور میرے لئے لذیذ کھانا جیسا کہ میں چاہتا ہوں تیار کر اور میرے آگے لا کہ میں کھاؤں تاکہ میں جی سے اپنے مرنے کے آگے تجھے برکت بخشوں ۵ اور جب اسحٰق اپنے بیٹے عیسو سے باتیں کرتا تھا تب ربقہ نے سنا اور عیسو جنگل کو گیا تھا کہ شکار مارے اور لے آئے۔

تب ربقہ نے اپنے بیٹے یعقوب سے ہمکلام ہو کے کہا کہ دیکھ میں نے تیرے باپ کی سُنی کہ تیرے بھائی عیسو سے ہمکلام ہو کے کہا ۵ میرے لئے شکار لا اور میرے واسطے لذیذ خوراک تیار کر تاکہ میں کھاؤں اور مرنے سے پیشتر خداوند کے آگے تجھے برکت بخشوں ۵ سو اب اے میرے بیٹے! اس حکم کے موافق جو میں تجھے دیتی ہوں میری بات کو مان ۵ اب گلے میں جا کے وہاں سے بکری کے دو اچھے اچھے بچے میرے پاس لا اور میں تیرے باپ کے لئے ان سے لذیذ کھانا جیسا کہ وہ چاہتا ہے پکواؤں گی ۵ اور تو اسے اپنے باپ کے آگے لائیو تاکہ وہ کھائے اور اپنے مرنے سے پیشتر تجھے برکت بخشے ۵ تب یعقوب نے اپنی ماں ربقہ سے کہا۔ دیکھ میرے بھائی عیسو کے بدن پر بال ہیں اور میرا بدن صاف ہے ۵ شاید میرا باپ مجھے چھوئے اور میں اس پر دغاباز ٹھہروں اور برکت نہیں بلکہ لعنت اپنے اوپر لاؤں ۵ اس کی ماں نے اسے کہا کہ تیری لعنت مجھ پر ہوا ے میرے بیٹے۔ تو صرف میری بات مان اور جا کے میرے لئے انہیں لا ۵ تب وہ گیا اور انہیں اپنی ماں پاس لے آیا اور اس کی ماں نے لذیذ کھانا جیسا کہ اس کا باپ چاہتا تھا پکوایا ۵ اور ربقہ نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کی نفیس پوشاکیں جو گھر میں اس پاس تھیں لیں اور اپنے چھوٹے بیٹے یعقوب کو پہنائیں ۵ اور بکری کے بچوں کی کھال اس کے ہاتھوں اور اس گردن پر جہاں بال نہ تھے لپیٹی ۵ اور وہ لذیذ کھانا اور روٹی جو اُس نے تیار کی تھی اپنے بیٹے یعقوب کے ہاتھ دی۔

۵ تب اس نے اپنے باپ پاس آ کے کہا کہ اے میرے باپ۔ وہ بولا دیکھ میں یہاں ہوں۔ تو کون ہے میرے بیٹے ۵ یعقوب اپنے باپ سے بولا کہ میں عیسو ہوں تیرا پلوٹھا (پہلونٹھا)۔ جیسا تو

نے مجھ سے کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ اُٹھ بیٹھئے اور میرے شکار میں سے کچھ کھائیے تاکہ تو جی سے مجھے برکت بخشے ○ تب اسحاق نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ کیونکر ہوا کہ تو نے ایسا جلد پایا ہے اسے میرے بیٹے؟ وہ بولا اس لئے کہ خداوند تیرا خدا میرے آگے لایا ○ تب اسحاق نے یعقوب کو کہا اے میرے بیٹے! نزدیک آ کہ میں تجھے چھوؤں کہ تو میرا وہی بیٹا عیسو ہے کہ نہیں اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے پاس گیا اور اُس نے اسے چھو کے کہا کہ آواز تو یعقوب کی ہے پر ہاتھ عیسو کے ہیں ○ اور اس نے اسے نہ پہچانا اس لئے کہ اس کے ہاتھوں پر اس کے بھائی عیسو کے ہاتھوں کی طرح بال تھے سو اُس نے اسے برکت دی ○ اور کہا کہ تو میرا وہی بیٹا عیسو ہے؟ وہ بولا کہ میں وہی ہوں ○ تب اُس نے کہا کہ تو کھانا میرے پاس لا کہ میں اپنے بیٹے کے شکار سے کچھ کھاؤں تاکہ جی سے تجھے برکت دوں۔ سو وہ اس پاس لایا اور اس نے کھایا۔ اور وہ اس کے لئے مئے لایا اور اُس نے پی۔ پھر اس کے باپ اسحٰق نے اُسے کہا کہ اے بیٹے! اب نزدیک آ اور مجھے چوم ○ وہ نزدیک گیا اور اسے چوما۔ تب اس نے اس کے لباس کی باس پائی اور اسے برکت دی اور کہا کہ دیکھ! میرے بیٹے کی ریح اس کھیت کی ریح کی مانند ہے جس میں خداوند نے برکت بخشی ہے ○ خدا آسمان کی اوس اور زمین کی چکنائی اور اناج اور مئے کی زیادتی تجھے بخشے ○ قومیں تیری خدمت کریں گروہیں تیرے آگے جھکیں۔ تو اپنے بھائیوں کا سردار ہو اور تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے جھکیں۔ ہر ایک جو تجھ پر لعنت کرے ملعون ہو مگر وہ جو تیرے لئے برکت چاہے مبارک ہو۔

○ اور یوں ہوا کہ جوں اسحاق یعقوب کو برکت دے چکا اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے حضور سے باہر چلا وہیں (اتنے ہی میں) اس کا بھائی عیسو اپنے شکار سے پھرا ○ اس نے بھی لذیذ کھانا پکایا تھا اور اُسے اپنے باپ پاس لایا اور اپنے باپ سے کہا کہ میرے باپ اُٹھئے اور اپنے بیٹے کا شکار کھائیے تاکہ آپ جی سے مجھے برکت دیں ○ اس کے باپ اسحاق نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ وہ بولا کہ میں عیسو تیرا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہوں ○ تب اسحاق بشدت کانپا اور بولا وہ کون تھا اور کہاں ہے جو شکار کر کے میرے پاس لایا اور میں نے سب میں سے تھوڑا تھوڑا تیرے آنے کے آگے کھایا اور اسے برکت دی۔ ہاں وہ مبارک ہوگا ○ عیسو اپنے باپ کی باتیں سنتے ہوئے شدت سے چلا اٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! مجھے ہاں مجھے بھی۔

برکت دیجئے۔ وہ بولا تیرا بھائی دغا سے آیا اور تیری برکت لے گیا۔ تب اُس نے کہا کہ کیا اس کا نام یعقوب ٹھیک نہیں؟ کہ اُس نے دوبارہ مجھے اڑنگا مارا۔ اس نے میرے پلوٹھے ہونے کا حق لے لیا اور دیکھو اب اُس نے میری برکت لے لی۔ پھر اس نے کہا کیا تو نے میرے لئے کوئی برکت نہیں رکھ چھوڑی؟ (پیدائش ۱۔ ۲۷/۳۶)

کیا یہ باتیں کسی برگزیدہ انسان کے شایانِ شان ہو سکتی ہیں؟ اللہ کی سچی کتاب اور محرف کتبِ سابقہ کا فرق قدم قدم پر نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن مذہبی تعصب عجیب جذبہ ہے کہ انسان کی چشمِ بصیرت پر ہمیشہ پٹی باندھے رکھتا ہے۔

خلاصۂ مبحث | چونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی سلسلہ کی متصل کڑیاں ہیں اس لئے تسلسلِ بیان کے پیشِ نظر یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس داستانِ زرّیں کا خلاصہ حضرت لوطؑ کے عنوان کے اخیر پر درج کیا جائے۔

استدراک | سابقہ صفحات پر حضرت ابراہیمؑ کی بُت شکنی کا واقعہ درج ہے۔ سورۃ انبیاء کی جن آیات (۲۱/۶۳ ـــ ۶۲) میں وہ واقعہ مذکور ہے، ان کا ایک مفہوم تو وہی ہے جسے وہاں درج کیا گیا ہے لیکن ان کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے پجاریوں سے صاف صاف کہدیا تھا کہ میں تمہارے بتوں کے خلاف کچھ کرنے والا ہوں۔ لہٰذا جب انہوں نے معبد کے ٹوٹے ہوئے بُتوں کو دیکھا تو انہیں اس کے باور کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ (حضرت) ابراہیمؑ ہی کا کام ہے۔ لیکن وہ چونکہ معاملہ کو آگے بڑھانا اور مجرم کو سخت ترین سزا دینا چاہتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ وہ متعیّن طور پر معلوم کر لیتے کہ بتوں کو خود (حضرت) ابراہیم نے توڑا ہے یا ان کی جماعت کے کسی اور فرد نے۔ اگر انہیں ان کی جماعت کے کسی اور فرد نے توڑا ہو تو اس کے خلاف بُت شکنی کا جُرم عائد ہوگا اور حضرت ابراہیمؑ کے خلاف اسے اس جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرنے اور اشتعال دلانے کا جُرم۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا کہ

ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ (۲۱/۶۲)

اے ابراہیم! ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کیا تُو نے خود کی ہے؟ (یا تمہارے متبعین میں سے کسی نے ایسا

کیا ہے)۔ اس صورت میں قوسین کے اندر کے الفاظ کو محذوف ماننا ہوگا۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ یہ کام جماعتِ مومنین کے کسی عام فرد نے نہیں کیا بَلْ فَعَلَهٗ ۚ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا بلکہ ان کے سب سے بڑے (قائد) نے جو یہ (هٰذَا) تمہارے سامنے کھڑا ہے، خود ایسا کیا ہے۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ نے سچی بات بیان کر کے پورے جرم کو اپنے اوپر لے لیا اور اپنی جماعت کو اس جرم کے شبہ میں بھی مبتلا نہ ہونے دیا۔

اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے ذہن کا رُخ صحیح سمت کی طرف موڑنے کے لئے کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم اس امر کی تحقیق اِدھر اُدھر سے کیوں کر رہے ہو اور مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو کہ ان بُتوں کے ساتھ یہ کاروائی کس نے کی ہے تم ان بُتوں کو کائنات کے اسرار و رموز تک سے باخبر مانتے ہو تمہارا ایمان یہ ہے کہ یہ انسانوں کے دل کے اندر چھپی ہوئی باتوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم مجھ سے پوچھنے کی بجائے کہ یہ کچھ میں نے کیا ہے یا میری جماعت کے کسی فرد نے تم انہی بُتوں سے کیوں نہیں پوچھتے کہ تم سے یہ کچھ کس نے کیا ہے؟

فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ (۲۱/۶۳)

ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں تو تمہیں جواب دیں گے اور اصلی مجرم کا پتہ نشان بتا دیں گے۔ (باقی واقعہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)۔

وقطعنا دابر الذین کذبوا بایٰتنا (پ۸، ع۱۷)

قوم لوط

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟
مرد بے کار و زن تہی آغوش!

حضرت لوط علیہ السلام

۲۲۰۰ سنہ ق م

حضرت ابراہیمؑ کے تذکرۂ جمیلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کلدانیوں کے ظلمت کدہ میں آپ کے برادرزادہ (حضرت لوطؑ) آپ پر ایمان لائے۔ (فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ) (۲۹/۲۶) "ابراہیمؑ پر لوط ایمان لایا۔" اور پھر آپ کے ساتھ فلسطین کی طرف ہجرت بھی کی۔

وَنَجَّیْنٰہُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا لِلْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۱/۷۱)

ہم نے اسے اور (اس کے بھتیجے) لوط کو (دشمنوں سے) نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچا دیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنایا ہے (یعنی سرزمینِ کنعان)۔

ظاہر ہے کہ اس وقت تک حضرت لوطؑ شرفِ نبوت سے بہرہ یاب نہیں فرمائے گئے تھے۔ جب حضرت ابراہیمؑ اس ارضِ مبارک میں متمکن ہو گئے اور مشیّتِ ایزدی نے چاہا کہ اس مشعلِ رشد و ہدایت کی کرنیں دُور دُور تک ضیاپاش ہوں تو حضرت لوطؑ کو سدوم کی طرف جانے کے لئے ارشاد ہوا۔ یمن سے بحرِ احمر (RED SEA) کے کنارے کنارے ایک قدیم تجارتی قافلوں کی سڑک حجاز و مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی (قرآنِ کریم نے اس شاہراہ کو اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۱۵/۷۹)

کہا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، قیاس یہ ہے کہ یہ علاقہ بحر میت (DEAD SEA) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا۔ حضرت لوطؑ کو اسی علاقہ میں بسنے والی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ (وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ (۳۷/۱۳۳) اور بلاشبہ لوط (ہمارے) پیغمبروں میں سے تھا)۔ انہوں نے آ کر اصولی طور پر اسی پیغامِ خداوندی کی طرف دعوت دی جس کی طرف اس سے بیشتر حضرات انبیاء کرامؑ دعوت دیتے چلے آ رہے تھے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۞ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۞

(۱۶۰ — ۲۶/۱۶۳)

(اور دیکھو) قومِ لوط نے (بھی) رسولوں (کی تعلیمات) کو جھٹلایا۔ (یاد کرو) جب ان کے بھائی بند لوط نے ان سے کہا کہ کیا تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت نہیں کرتے؟ بلاشبہ میں تمہارے لئے خدا کا امانت دار پیغمبر ہوں۔ تو (تمہیں چاہیئے کہ) خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو اور (مرکزِ نظامِ خداوندی کی حیثیت سے) میری اطاعت کرو (کہ میری یا مرکز کی اطاعت، میری اطاعت نہیں بلکہ دراصل خدا کی اطاعت ہے)۔

دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت لوطؑ اس قوم میں پہلے رسول نہ تھے بلکہ یہ قوم آپ سے بیشتر اور رسولوں کی بھی تکذیب کر چکی تھی اسی لئے كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت لوطؑ کو اس قوم کا بھائی (اَخُوْهُمْ) کہا گیا ہے۔ اسی صورت میں حضرت نوحؑ، ہود اور صالح (عَلَيْهِمُ السَّلَامُ) کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ انہی قبائل میں تھے جن کی طرف وہ مبعوث کئے گئے تھے، اس لئے قبیلہ کی نسبت سے ان کے بھائی تھے۔ لیکن حضرت لوطؑ تو باہر سے تشریف لے گئے تھے، اس لئے قومِ سدوم سے کسی قبائلی نسبت کی بنا پر رشتۂ اخوت نہ تھا، بلکہ اُن میں رہنے سہنے کی وجہ سے ایسا کہا گیا ہے۔

اللہ کی طرف دعوت دی اور ساتھ ہی وہ عظیم الشان اعلان بھی فرما دیا جو داعیانِ اِلی الحق کا امتیازی وصف چلا آ رہا ہے، یعنی

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ (۲۶/۱۶۴)

اور (دیکھو) میں اپنی اس (دعوت و تبلیغ کی) خدمت پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف پروردگارِ عالم ہی کے ذمّہ ہے۔

یوں تو حضرات انبیائے کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے وہ قوم بالعموم کفر و شرک، فسق و فجور، معصیت کوشی اور بدکرداری، سرکشی و تمرّد اور سلب و نہب کی لعنتوں میں گرفتار ہوتی تھی اور ان حضرات کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ہلاکت انگیز نتائج سے آگاہ کریں۔ لیکن قومِ سدوم جس شرم انگیز فحاشی میں مبتلا تھی وہ دنیا جہان سے نرالی تھی۔ یہ

شرمناک فحاشی

بدبخت، اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس فعلِ شنیع کی ابتدا بھی اسی قوم سے ہوئی۔ لفظ لواطت (تلوّط) خود اس پر شاہد ہے کہ اس کی نسبت قومِ لوط سے ہے۔ انگریزی میں (SODOMY) سدوم (SODOM) کی نسبت سے ہے۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝

(۸۰ – ۷/۸۱)

اور لوطؑ کا واقعہ یاد کرو، جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا، "کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرنا پسند کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔ یقیناً تم ایک ایسی قوم ہو گئے ہو جو (اپنی نفس پرستیوں میں) بالکل حدود فراموش ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ۙ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۝ (۱۶۵ – ۲۶/۱۶۶)

(اور دیکھو، لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا) کیا تم (اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے) دنیا

میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہارے پروردگار نے (اس مقصد کے لئے) جو تمہارے لئے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں، انہیں چھوڑ دیتے ہو؟ (یہی نہیں) تم قوانینِ فطرت کے حدود سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔

سورۂ اعراف میں مُسْرِفُوْنَ اور سورۂ شعراء میں عٰدُوْنَ کی جامعیت پر غور فرمائیے! حدودِ فطرت سے تجاوز کی طرف کس بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ نمل میں فرمایا۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ اَىٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ (۲۷/۵۵—۵۴)

اور لوطؑ کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا، "کیا تم ایسی بے حیائی کا کام جانتے بوجھتے کرنا پسند کرتے ہو؟ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔ یقیناً تم ایک ایسی قوم ہوگئے ہو جو جہالت کے کام کرتی ہے۔

وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ یعنی دیدہ و دانستہ، جانتے بوجھتے اس حیا سوز فعلِ قبیح کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس سے بڑی جہالت کچھ اور بھی ہوسکتی ہے؟ (اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ[۱]) سورۂ عنکبوت میں ہے کہ وہ لوگ اس درجہ بے غیرت اور آبرو باختہ ہوچکے تھے کہ کھلی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کیا کرتے تھے اور اس سے ذرا شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتّٰی کہ ان حیا سوز فحاشیوں کے خلاف اُن کے دل میں کوئی کھٹک تک بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان ایسی کھلی ہوئی معصیت کوشی کی زندگی پر اُتر آئے تو پھر شرم اور حیا کبھی باقی نہیں رہتی! آج بھی دنیا کی ان اقوام پر نگاہ ڈالئے جو جذبات پرستی اور فحش کاری کے سیلاب میں بہے جارہی ہیں۔ ان میں غیرت اور حیا کہیں نام کو نہیں ہوتی۔ اس بے غیرتی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یوں تو انگلستان (بلکہ

رہزنی بھی

---

[۱] تُبْصِرُوْنَ اور تَجْهَلُوْنَ کے تقابل پر غور فرمائیے۔ یعنی وہ لوگ فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بدترین جہالت میں مبتلا تھے۔ لہٰذا وہ علم جو سیرتِ انسانی کی صحیح تشکیل یعنی افکار و اعمال کی تطہیر نہیں کرسکتا، علم نہیں جہالت ہے، روشنی نہیں تاریکی ہے، آج سے چار ہزار سال پیشتر بھی اور آج بھی۔

یورپ کے دیگر ممالک میں بھی) لواطت ایک عرصہ سے چلی آ رہی تھی۔ لیکن سالِ گذشتہ ۱۹۶۷ء میں) اسے انگلستان میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے! سچ کہا تھا قرآن نے کہ جب انسان پستی کی طرف گرتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ہم جنس سے جنسی اختلاط (لواطت) حیوانات کے تصور میں بھی نہیں آسکتی!

قومِ لوط، رہزنی بھی کرتی تھی۔

وَ لُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (۲۸- ۲۹/۲۹)

اور لوط کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا" کیا تم ایسی بے حیائی کا کام پسند کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا؟ اتم تو عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے) مردوں پر مائل ہوتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانیہ، برائیوں کے مرتکب ہوتے ہو؟ (تم پر حیف ہے)۔

تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اس طرح (عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف مائل ہونے سے) اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائشِ نسلِ انسانی کے لئے وضع کیا ہے۔

تذکیرِ موعظت کا جواب یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے۔ جب آپ نے انہیں ان کی بدکرداریوں سے منع کیا تو ان کی طرف سے جو جواب ملا وہ انکی فطرتِ خبیثہ کا صحیح آئینہ دار ہے۔

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○ (۷/۸۲؛ ۲۷/۵۶)۔

لوط کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو یہ کہ آپس میں کہنے لگے" ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک صاف بنا چاہتے ہیں"۔

فطرتِ ابلیسی کی کیسی صحیح تصویر ہے۔ آج بھی کسی بدکردار کو اس کی حیاسوز حرکات سے منع کرنے کی کوشش

کہیئے تو یہی جواب ملے گا۔ جب آپ نے زیادہ زور دیا تو یہ لوگ اس حربے پر اُتر آئے جو نشۂ قوت کی بدمستی کا خاصہ ہوتا ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ○ (۲۶/۱۶۷)

تو وہ کہنے لگے،" اے لوط! اگر تو باز نہ آیا، تو یاد رکھ تو لامحالہ (یہاں سے) نکال دیا جائے گا۔

انہوں نے یہ دھمکی دی اور آپ نے نہایت سکوت و سکون سے یہ جواب دے دیا کہ ان دھمکیوں سے تمہارے اعمال کے خلاف میرے دل کی نفرت کم تھوڑی ہو جائے گی؟

قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ○ (۲۶/۱۶۸)

لوط نے کہا (اس کے باوجود) میں تمہاری بدکرداریوں کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والوں میں سے ہوں۔

یہ سلسلہ جاری رہا۔ اِدھر سے تذکیر و تنذیر اور اُدھر سے ضد اور انکار برابر بڑھتا گیا۔ جب حضرت لوطؑ ان سے کہتے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اس نے جو تمہیں مہلت دے رکھی ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ، تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جاؤ! وہ عذاب لے آؤ جس کی یوں دھمکی دے رہے ہو!

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (۲۹/۲۹)

لوط کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو یہی کہ وہ کہنے لگے، اگر ایسے ہی سچے ہو تو وہ اللہ کا عذاب ہم پر لے آؤنا! (جس کی روز دھمکیاں دیا کرتے ہو)۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ○ (۵۴/۳۶)

اور (دیکھو) لوط نے انہیں ہماری گرفت سے آگاہ کر دیا تھا مگر انہوں نے (الٹا) اس سے جھگڑا مول لیا۔

جب حضرت لوطؑ ان راہ گم کردہ بدبختوں کے انکار و جحود اور سرکشی و تمرّد کی ان حدود فراموشیوں کو دیکھتے تو اللہ سے دعائیں مانگتے کہ وہ انہیں اور ان کے متبعین کو اس انسانیت فروش قوم کے اعمالِ بد

کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھے۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ٥ (٢٦/١٦٩)

(لوط نے ہماری بارگاہ میں عرض کیا) اے پروردگار! مجھے اور میرے متبعین کو اُن (بداعمالیوں کے نتائج) سے محفوظ رکھ جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

اور ان پر غلبہ و نصرت عطا فرمائے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ع (٢٩/٣٠)

(اور دیکھو، لوط نے ہماری بارگاہ میں عرض کیا کہ) اے میرے پروردگار! مجھے (یعنی میرے مشن کو) فساد انگیز لوگوں پر (غلبہ و) نصرت عطا فرما!

یہ مہلت کا عرصہ یونہی گذرتا گیا حتیٰ کہ وہ وقت آپہنچا جب قانونِ مکافات کے مطابق ان کے اعمال کی کھیتی پک گئی اور ظہورِ نتائج کا زمانہ آگیا۔ خدا کے فرستادہ اس قوم کی طرف آئے تاکہ آخری حجت کا بھی اتمام ہو جائے۔ یہ راستہ میں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاں گئے اور انہیں حضرت اسحٰقؑ کی خوشخبری دی (تفصیل سابقہ عنوان میں گذر چکی ہے)۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہوا کہ قومِ لوطؑ پر تباہی اور بربادی کا عذاب آنے والا ہے تو ان کی رقیق القلبی نے بہت چاہا کہ کسی طرح انہیں مہلت کا مزید موقع مل جائے جس سے وہ شاید اپنی حرکاتِ قبیحہ سے باز آجائیں۔ لیکن مشیّتِ ایزدی کے علم میں تھا کہ وہ قوم رجعت و انابت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ ان کی بازآفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں۔ ان کے اعمال کے ہلاکت آمیز نتائج مرتب ہو چکے ہیں۔ سورۂ ہودؔ میں ہے۔

ظہورِ نتائج کا وقت

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا[1] فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ٥ ...... وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ٥ (١١/٧٤-٧٦)

پھر جب ابراہیم کے دل سے اندیشہ دُور ہو گیا اور اسے خوشخبری ملی، تو قومِ لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے لگا (یعنی ہمارے فرستادوں سے بار بار سوال و جواب کرنے لگا کہ آنے والی

---

[1] یُجَادِلُنَا کی مزید تشریح کے لئے چند صفحات کا انتظار کیجئے۔

بلا ٹل جائے) حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا ہی بُردبار، بڑا ہی نرم دل اور (ہر حال میں) اللہ کی طرف رجوع ہو کر رہنے والا تھا! (ہمارے فرستادوں نے کہا) کہ اے ابراہیم! اب اس بات کا خیال چھوڑ دے۔ تیرے پروردگار کی (ٹھہرائی ہوئی) بات جو تھی، وہ آپہنچی، اور ان لوگوں پر عذاب آرہا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

خُدا کے فرستادہ

اس کے بعد وہ حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر کئی ایک مقام پر کیا ہے اس لئے کہ یہ اس قوم کی بداعمالیوں کا نقطۂ آخریں تھا۔ خدا کے یہ برگزیدہ بندے، حضرت لوطؑ جیسے پاکباز انسان کے ہاں مہمان آتے ہیں اور یہ بدبخت ان پر پل پڑتے ہیں۔

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا ...... وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ۝ (۷۷ — ۱۱/۷۹)

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے، تو وہ ان کے آنے سے خوش نہیں ہوا۔ ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ بولا کہ آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے اور اس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر) دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ پہلے سے بُرے کاموں کے عادی ہو رہے تھے۔ لوط نے ان سے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں (یعنی ان کی بیویاں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا)۔ یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں۔ پس ان کی طرف ملتفت ہو، دوسری بات کا قصد نہ کرو۔ اور) اللہ سے ڈرو۔ میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ ان لوگوں نے کہا "تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اور تو اچھی طرح جانتا ہے ہم کیا کرنا چاہتے ہیں"۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے۔ (۵۷ — ۱۵/۶۰؛ ۶۷ — ۱۵/۷۲؛ ۳۲ — ۲۹/۳۳)۔

حضرت لوطؑ کا اضطراب

غرضیکہ اُدھر سرکشی و تمرد اور قوت و استیلاء کے اندھے نشے کا ایک بپھرا ہوا طوفان تھا جو چاروں طرف سے دیوار و در کی تمیز بھلا کے احاطہ کئے تھا اور اُدھر خدا کا ایک تنہا بندہ ان نووارد مسافروں کی حفاظت کے لئے سینہ

سر کھڑا تھا۔ پریشانی تھی تو صرف ان مہمانوں کے لئے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ○

(۱۱/۸۰)

لوط نے کہا "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا۔

جب مہمانوں نے حضرت لوطؑ کی اس گھبراہٹ کو دیکھا تو انہیں تسلی دی کہ مت گھبراؤ یہ ہم تک دست درازی نہیں کر سکتے۔

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ...... اِنَّ مَوْعِدَھُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ○ (۱۱/۸۱)

تب مہمانوں نے کہا" اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ تجھ پر قابو نہ پا سکیں گے (کہ تجھے رسوا کرکے ہم تک دست اندازی کر سکیں) تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصّہ گزر جائے تو اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل چل اور اس طرح یہاں سے دامن جھاڑ کر نکل جا کہ پھر تم میں سے کوئی بھی اس سرزمین کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ یہ بھی سمجھ لے کہ تیری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ وہ پیچھے رہ جائے گی اور جو کچھ ان لوگوں پر گزرنا ہے وہ اس پر بھی گزرے گا۔ ان لوگوں کے لئے عذاب کا وقت صبح کا ہے اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔"

نیز دیکھئے۔ (۱۵/۶۶ – ۶۱ ؛ ۲۹/۳۴)۔

عذاب کی نوعیت

قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔ آتش فشاں پہاڑوں کا انشقاق بڑا ہلاکت انگیز عذاب ہوتا ہے۔ کبھی تو آتش فشاں سیّال مادّہ (لاوا) کی شکل میں ایک بہتا ہوا جہنّم بن کر گردو پیش کے علاقوں کو دہکتے ہوئے انگاروں کی بھٹی بنا دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دہانہ سے راکھ اور پتھروں کا مینہہ برستا ہے جس کی بوچھاڑ دُور دُور تک جاتی ہے۔ پمپیائی کی تباہی اسی قسم کی "بارش" سے ہوئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان پتھروں کی زد سینکڑوں میل تک تھی۔ قوم لوطؑ کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اُٹھی اور پھر ایسے زلزلے

آئے کہ زمین نیچے دھنس گئی اور جھیل (DEAD SEA) کا پانی اوپر آگیا۔ یہ علاقہ آج بھی بالکل کھینگر ہے اور بحرِ میت کے پانی میں اس قدر تیزابی مادّوں کی آمیزش ہے کہ وہ خود ایک آتشِ سیّال ہے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ سورۃ اعراف میں فقط اتنا بیان فرمایا کہ

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۟

ہم نے اُن پر (پتھروں کا) مینہہ برسا دیا تھا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟

یہ مینہہ جلے ہوئے پتھروں (کھینگروں) کا تھا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ۙ۬ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۟

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس بستی کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں اور اس میں آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے کہ تیرے پروردگار کے حضور (اس غرض سے) نشان کئے ہوئے تھے۔ یہ (بستی) ان ظالموں سے (یعنی اشرارِ مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے (یہ اپنی سیروسیاحت میں وہاں سے گذرتے رہتے ہیں اور اگر چاہیں، تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں)۔

یہاں پتھروں کی بارش کی تصریح کے ساتھ زلزلہ کا عبرت انگیز نتیجہ بھی بیان فرمادیا جس سے بڑی بڑی بلند عمارات پستیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ بلکہ وہ اتنا نیچے دھنس گئیں کہ پانی سطحِ ارض کے اوپر چڑھ آیا۔ دوسری جگہ انہی کو مُؤْتَفِكٰت (وہ جن کی بستیاں اُلٹ دی گئی تھیں) سے تعبیر کیا گیا ہے (دیکھئے ۹/۷۰ (۶۹/۹)۔ سورۃ حجر میں ان دونوں چیزوں کے ساتھ "صَيْحَةً" (ایک ہولناک آواز) کا اضافہ فرمادیا گیا، جس سے اس ماجرے کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے۔ (دیکھئے ۳، ۱۵/۷۹–)۔ آیت ($\frac{15}{78}$) میں قومِ سدوم کے ساتھ اصحٰب الایکہ کا بھی ذکر آگیا ہے، کیونکہ ان کا علاقہ ان سے ملحق تھا۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ یہاں یہ چیز مزید غور طلب ہے کہ قومِ سدوم کے اس تباہ شدہ علاقہ کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی شاہراہ (اِمَامٌ مُّبِيْنٌ) پر واقع ہے جو نزولِ قرآن تک قائم (سبیلِ مقیم) تھی۔ یہ وہی تجارتی سڑک ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے۔ قریش کے قافلے

اس سڑک پر سے گزرتے تو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اسی لئے (11/83) میں یہ فرمایا گیا کہ وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ کہ یہ علاقہ ان ظالمین سے کہیں دور نہیں۔ اس پر تو یہ اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکذیب و انکار کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے؟

سورۂ شعراء میں اس عذاب کے متعلق فرمایا کہ حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو تو بچا لیا گیا اور دوسروں کو تباہ کر دیا۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۚ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ (172—173/26) نیز (136/37)۔

پھر (خاندان لوط اور اس کے متبعین کو بچا کر) ہم نے اوروں کو بری طرح ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) خوب بارش کر ڈالی۔ تو (دیکھو، ان بداعمالیوں کے نتائج سے ڈرائے ہوؤں کی بارش کیسی بری رہی!

نیز دیکھئے۔ (27/50)؛ (34—51/33؛ 54/34؛ 54/38)۔

اہل سے مراد! گذشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قومِ لوطؑ کی تباہی کے ضمن میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ حضرت لوطؑ اور ان کے اہل اور آل کو بچا لیا گیا۔ البتہ ان کی بیوی ان میں شامل نہیں تھی۔ اہل اور آل سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر سورۂ ذٰریٰت میں ان الفاظ میں فرما دی۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۚ (35—51/36)

چنانچہ ہم نے اس بستی میں سے جتنے ایمان والے تھے ان کو نکال لیا۔ مگر ہم نے اس بستی میں مطیع و فرمانبردار بندوں کے صرف ایک گھر کے علاوہ (کوئی دوسرا مکان) نہیں پایا۔

یعنی حضرت لوطؑ کے اہل سے مراد "گھر والے" اور آل سے مفہوم "ان کی اولاد" نہ تھی بلکہ اس سے مراد جماعت مومنین تھی۔ معیارِ خداوندی کے مطابق "اپنوں اور بیگانوں" کی تمیز و تفریق کے متعلق سابقہ عنوانات میں کئی

ایک جگہ ذکر آچکا ہے، بالخصوص تذکرہ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ میں! اسی سلسلہ میں اس کڑی کو بھی شامل کر لیجئے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اپنے "اہل اور آل" وہ ہیں جو ایمان کے رشتہ سے منسلک ہیں۔ جو اس رشتہ سے مربوط نہیں وہ بیٹا ہو یا باپ، بیوی ہو یا بھائی "اپنوں" میں سے نہیں ہو سکتا۔ ان تمام رشتوں میں بیوی اور خاوند کا رشتہ، چولی اور دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس بتایا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (۲/۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

لیکن ایمان کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ وہ چولی کو دامن سے اور لباس کو جسم سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ سورۂ تحریم میں ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ...... وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ (۶۶/۱۰-۱۱)

(اور دیکھو) اللہ نے نافرمانی کرنے والوں کے لئے نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کی ہے۔ یہ دونوں کی دونوں ہمارے بندوں میں سے دو (بہت ہی) نیک بندوں (پیغمبروں) کے نکاح میں تھیں۔ مگر انہوں نے ان دونوں (نیک بندوں) کی حق تلفی کی۔ پس خدا کے مقابلہ میں وہ دونوں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم بھی اور داخل ہونے والوں (کی طرح ان ہی) کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

اور (اس کے برعکس) اللہ نے ایمان لانے والوں کے لئے (بھی) فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی ہے (جو ایک نہایت ہی سرکش اور نافرمان بندہ کے نکاح میں تھی، مگر مومن تھی)۔ جب اس نے (اپنے پروردگار کے حضور) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لئے اپنے ہاں جنت میں اندر ایک مکان بنا دے اور فرعون اور اُس کے (بُرے) کردار سے مجھے نجات دے۔ (نہ صرف فرعون سے، بلکہ) مجھے (تمام) ظالم (اور سرکش) قوم سے ہی نجات عطا فرما!

داستانِ عبرت یہ ہے قومِ لوطؑ کا واقعہ اور ان کا ایسا انجام جس میں ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی داستانیں پوشیدہ ہیں ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی لٹی ہوئی عظمتوں اور چھنی ہوئی ثروتوں کے زندہ مرثیے ہیں لیکن صرف اُن کے لئے جو حیاتِ آخرت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) پر ایمان رکھیں، ورنہ مٹی کے ڈھیر ہیں یا زیادہ سے زیادہ علمائے آثار و حضریات کی دلچسپیوں کا مرکز۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو سورۂ فرقان میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ (۲۵/۴۰)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ (یعنی مخالفینِ مکہؔ) اس بستی پر جس پر بری طرح پتھر برسائے گئے تھے (یعنی قومِ لوط کی آبادی پر بارہا) گذر چکے ہیں۔ کیا یہ اس بستی کو (بارہا) دیکھ نہیں چکے ہیں؟ (یقیناً دیکھ چکے ہیں، مگر ان کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا)۔ بلکہ بات یہ ہے کہ وہ مر کر دوبارہ جی اُٹھنے (اور اپنے اعمالِ بد کا نتیجہ بھگتنے) کی توقع ہی نہیں رکھتے۔

چونکہ ان لوگوں کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں، اس لئے ان اُممِ گذشتہ کے یہ نشانات ان کے لئے عبرت کا موجب نہیں بنتے۔

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ (۲۵/۴۲—۴۱)

اور جب کبھی وہ تمہیں (اے پیغمبرِ اسلامؐ!) دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق ہی بنا لیتے ہیں (اور انجام سے بالکل بے پروا ہو کر ایسے ایسے جملے چست کرتے ہیں کہ) "کیا یہی ہے وہ جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اگر ہم مضبوطی سے قائم نہ رہے ہوتے تو اس نے ہمیں اپنے معبودوں سے کھو ہی دیا ہوتا" (وغیرہ وغیرہ)۔

اس کے بعد فرمایا:-

وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵/۴۲)

اور (اے پیغمبرِ اسلام! تم گھبراؤ نہیں) انہیں تھوڑے ہی عرصہ میں معلوم ہو جائے گا جب وہ (خدا کا) عذاب (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے کہ (درحقیقت، صحیح راستہ سے کھویا ہوا کون تھا؟ (وہ یا تم)۔

دیکھتے بوجھتے آنکھوں پر پردے اس لئے پڑجاتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کا محکوم و پرستار بن جاتا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۗ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝

(۲۵/۴۳)

(اور اے پیغمبرِ اسلام!) تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ کیا تم ان لوگوں پر نگران بن سکتے ہو؟ (ہرگز نہیں)۔

اور یہاں پہنچ کر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ فہم و بصیرت کی تمام قوتیں اور سمجھنے بوجھنے کی تمام صلاحیتیں رکھنے کے باوجود اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے اور یوں شرفِ انسانیت کھو کر حیوان بلکہ ان سے بھی گیا گزرا ہو جاتا ہے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۴۴)

(اے پیغمبر!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان میں کے اکثر افراد کچھ سنتے اور سمجھتے بھی ہیں (بالکل نہیں) وہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ (وہ کم از کم اپنی جبلّت پر تو چلتے ہیں)۔

سورۂ شعراء میں قومِ لوطؑ کی تباہی اور ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۗ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۶/۱۷۴)

بلاشبہ اس میں ایک (زبردست) نشانی تھی۔ مگر (انہی کے لئے جو کچھ بصیرت رکھتے ہوں) ان میں تو اکثر ایسے ہی ہیں جو ایمان والے (صاحبِ بصیرت) نہیں۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ قصص و وقائع ان لوگوں کے لئے اس لئے آیۂ عبرت نہیں بنتے کہ یہ لوگ اللہ کے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے اور عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔

وَ لَقَدۡ تَّرَكۡنَا مِنۡهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (۲۹/۳۵)

اور (دیکھو) ہم نے اس (تباہ شدہ) بستی میں سے (کچھ نہ کچھ) واضح نشانات چھوڑ دیئے (مگر ہر ایک کے لئے نہیں) صرف ان لوگوں کے لئے جو کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

اور اللہ کی ان نشانیوں سے آنکھیں بند کئے گذر جاتے ہیں۔

وَ اِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ ۙ وَ بِالَّيۡلِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ (۳۷/۱۳۷-۱۳۸)

اور (اے منکرینِ دعوتِ ایمانی!) حقیقت یہ ہے کہ تم اُن (تباہ شدہ) بستیوں پر صبح (دن) کے وقت اور رات کے وقت (ہمیشہ ہی) گذرتے ہو (اور ان کی تباہی کے نمونے تمہاری آنکھوں کے سامنے آتے ہی رہتے ہیں) کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟

اور قانونِ مکافات کی محکم گرفت سے نہیں ڈرتے۔

وَ تَرَكۡنَا فِيۡهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ؕ (۵۱/۳۷)

اور (دیکھو) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں اس بستی (یعنی قوم لوط کی آبادی) میں نشانیاں چھوڑ دی ہیں۔

یعنی صحیح علم و بصیرت اور عقل و فکر کا یہ تقاضا ہے کہ ان واقعات سے استقرائی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ان اقوامِ گذشتہ نے یہ کچھ کیا تو ان کا انجام یہ ہوا۔ اگر ہم بھی وہی کچھ کریں گے تو ہمارا بھی انجام ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جس طرح فطرت کے اٹل قوانین دیگر اشیائے فطرت میں کارفرما ہیں، اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی قوانینِ خداوندی جاری و ساری ہیں۔ اگر پانی آج بھی اسی طرح نشیب کی طرف بہتا ہے جس طرح قومِ لوط و عاد و ثمود کے زمانہ میں بہتا تھا تو آج غلط روش کے نتائج بھی وہی ہوں گے جو اس زمانہ میں ہوتے تھے۔ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (۳۳/۶۲) قوانینِ الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہ ایک عام حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ اور ارسطو کے ذہن کی ضرورت نہیں۔ قانونِ فطرت کا ایک کھلا ہوا اور نہایت واضح گوشہ ہے جو ہر سلیم الطبع انسان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسی لئے سورۂ قمر میں اممِ گذشتہ کے احوال و ظروف اور ان کے اعمال کے نتائج و عواقب بیان کرتے ہوئے ہر کڑی کے بعد فرمایا کہ

وَ لَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ۝ (۵۴/۴۰)

اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے ہم نے قرآن کو (بہت ہی) آسان کر دیا ہے۔
تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ (جو اس سے نصیحت حاصل کر لے)۔

یہ ہے تذکرۂ جلیلہ حضرت لوطؑ کا جنہیں اللہ نے حکم و علم عطا فرمایا۔

وَ لُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ ۙ (۲۱/۷۴)

اور (اسی طرح) لوط کو بھی ہم نے (احکامِ حق دینے کا) منصب اور (نبوت کا) علم عطا فرمایا۔ ہم نے اس بستی سے اسے نجات دیدی جس کے باشندے بڑے ہی گندے کام کیا کرتے تھے اور کچھ شک نہیں، بڑے ہی بدراہ، حد سے گذرے ہوئے لوگ تھے۔

اور ان کا شمار اپنے منتخب بندوں میں کیا۔ (۲۶/۵۹)

تورات کا بیان

لیکن اس کے برعکس، ذرا تورات کو اٹھا کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ کے ان برگزیدہ رسولوں کی سیرت کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش، باب ۱۹، آیت ۲۳ میں حضرت لوطؑ کو نیکوکار کہا گیا ہے۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر یہ قصہ بھی مذکور ہے۔

اور لوط ضغر سے اپنی دو بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ ضغر میں رہنے سے اسے دہشت ہوئی اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگیں۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہمبستر ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی۔ پر اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی۔ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہمبستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات کو بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی اٹھ کے اس سے ہمبستر ہوئی اور اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ

ہوئیں اور بڑی ایک بیٹا جنی اس کا نام موآب رکھا اور وہی موآبیوں کا جواب تک ہیں باپ ہوا
اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی اور اس کا نام بن عمی رکھا۔ وہ بنی عمون کا جواب تک ہیں باپ ہوا۔
(پیدائش ۳۰۔۳۸/۱۹)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خرافات کا نقل کرنا بھی قارئین کے ذوقِ سلیم کے منافی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

اس قسم کے تقابل کے بغیر یہ حقیقت اجاگر ہو نہیں سکتی کہ سابقہ "کتبِ آسمانی" کی موجودگی میں خدا کی طرف سے ایک "نئی کتاب" (قرآنِ مجید) کی کیا ضرورت تھی؟ سابقہ "کتبِ آسمانی" کے ان بیانات سے محرّف اور خالص پیغامِ خداوندی کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

بیٹیوں سے مراد

قرآنِ کریم میں قومِ لوطؑ کی عبرت انگیز داستان اتنی ہی مذکور ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے بیشتر دو ایک مقامات پر غور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بستی کے لوگوں نے ضیوفِ حضرت لوطؑ کو آن گھیرا ہے تو حضرت لوطؑ نے ان سے کہا کہ

يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ (۱۱/۷۸)

لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں۔ پس ان کی طرف ملتفت ہو۔ (دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو۔ میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟

دیگر مقامات میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ (۱۱/۷۹؛ ۱۵/۷۱)۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے انہیں اپنی بیٹیوں کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (۲۶/۱۶۶ نیز ۷/۸۱؛ ۲۷/۵۵)

(تم پر حیف ہے کہ تم یہ بد عملی کی راہ اختیار کرتے ہو) اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لئے تمہاری

بیویاں پیدا کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو۔

اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مَردوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت لوطؑ انہیں اس خلافِ فطرت خبیثانہ فعل سے روکتے تھے اور فطرت کی صحیح راہوں کی طرف اُن کی توجہ ملتفت کراتے تھے۔ اس خاص مقام پر بھی آپ نے اپنی اس دعوت کو دہرایا اور اُن سے کہا کہ اس حماقت سے کیا حاصل! تمہارے لئے تمہاری بیویاں (بستی کی عورتیں) پاک وصاف موجود ہیں۔ اُن کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟

بستی کی عورتوں کو آپ نے بیٹیاں کہا۔ ایک مردِ بزرگ و پاک باز کے نزدیک بستی کی عورتیں بمنزلہ بیٹیوں کے ہوتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ حضرت لوطؑ اس قوم میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے، قرآنِ کریم نے انہیں قوم لوطؑ کا بھائی [اَخُوْھُمْ = اُن کا بھائی ۲۶/۱۶۱) کہا ہے اور اس برباد ہونے والی قوم کو [اِخْوَانُ لُوْطٍ ۵۰/۱۳) کہہ کر پکارا ہے۔ اسی نسبت سے حضرت لوطؑ نے بستی کی عورتوں کو جنہیں ان بدبختوں نے چھوڑ رکھا تھا، اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کے نزدیک (اپنی بیوی کو چھوڑ کر) دنیا کی تمام عورتیں اپنی بیٹیوں، بہنوں اور ماؤں کے برابر ہوتی ہیں۔

یہ مہمان کون تھے؟

دوسرا غور طلب مقام یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کے مہمان (بلکہ یوں کہیئے کہ ضیوفِ ابراہیمؑ) کون تھے؟ قرآنِ کریم نے انہیں اللہ کے فرستادہ (مرسلین) کہہ کر پکارا ہے اور اس کی کہیں تصریح نہیں کہ وہ فرشتے تھے۔ لیکن جس انداز سے قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ مثلاً سورۂ ہود میں کہا کہ

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (۱۱/۶۹)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے (قاصد) ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے تھے۔

یہی کچھ سورۂ عنکبوت (۲۹/۳۱) میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے فرستادہ تھے جو حضرت

ابراہیمؑ کے پاس بیٹے کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے۔ سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو ہم نے بشارت دی۔

وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ○ (۱۱/۷۱)

اور اس کی بیوی (سارہ) بھی (خیمہ میں) کھڑی (سُن رہی) تھی۔ وہ ہنس پڑی (یعنی اندیشہ کے دُور ہو جانے سے خوش ہو گئی)۔ پس ہم نے اسے (اپنے فرستادوں کے ذریعہ) اسحاق (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی اور اس کی کہ اسحاق کے بعد یعقوب کا ظہور ہو گا۔

اور دوسرے مقامات پر ہے کہ ان فرستادگانِ بارگاہِ ایزدی نے کہا کہ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ○ (۵۱/۲۸)

انہوں نے کہا "ڈرو مت۔ ہم تو تمہیں ایک علم والے فرزند کی پیدائش کی خبر سُناتے ہیں"۔

ان مقامات میں تطبیق مشکل نہیں۔ بشارت ان فرستادگان کی زبان سے دی گئی تھی اس لئے اسے ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بشارت ان کی اپنی طرف سے نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس کے پہنچانے والے تھے اس لئے (۱۱/۷۱) میں اس بشارت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

اسی طرح قوم لوطؑ پر عذابِ خداوندی کے متعلق بھی دونوں نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ سورۃ حجر میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○ (۱۵/۶۰-۵۸)

انہوں نے کہا "ہم ایک مجرم گروہ کی طرف بھیجے گئے ہیں (کہ ہلاک ہونے والا ہے) مگر (ہاں) ایک خاندان وہاں لوط کا ہے اس کے تمام افراد کو ہم بچا لیں گے۔ البتہ اس کی بیوی نہیں بچے گی۔ اس کے لئے ہمارا اندازہ ہو چکا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کا ساتھ دے گی"۔

پہلی آیت میں ہے کہ "ہم قومِ لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں"۔ اس سے آگے ہے کہ "ہم آلِ لوطؑ کو نجات دیں گے"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ یہ "ہمارا اندازہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی تباہ ہونے

والوں میں سے ہوگی"۔ اسی طرح دیگر مقامات میں ہے (دیکھئے ۳۳-۲۹/۳۲؛ ۳۱-۵۱/۳۲؛ ۲۹/۳۴-۳۳)۔ ان تمام مقامات میں قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کرنے اور متبعینِ حضرت لوطؑ کو نجات دینے کی نسبت ان فرستادگان کی طرف کی گئی۔ لیکن دوسرے مقامات پر اس نسبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف بیان فرمایا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں فرمایا۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (۷/۸۴)

ہم نے اُن پر (پتھروں کا) مینہہ برسا دیا تھا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟

نیز (۱۱/۸۲؛ ۵۴/۳۴؛ ۷/۸۴)۔

ان مقامات میں بھی کوئی الجھاؤ نہیں۔ قومِ لوطؑ پر عذاب اور جماعتِ مومنین کی اس سے رستگاری، دونوں اللہ کے قانونِ مکافات کے تابع تھے۔ لیکن یہ فرستادگان چونکہ اس مقصد کے لئے مامور تھے کہ ان کے ذریعے اس سرکش قوم پر اتمامِ حجت ہو اور متبعینِ حضرت لوطؑ اس عذاب سے محفوظ رکھے جائیں، اس لئے انہوں نے ان امور کو اپنی طرف منسوب کیا جیسے جب کوئی مامور من اللہ (رسول) اپنی قوم سے کہتا ہے کہ "میری بات سنو"، تو اس سے مقصود پیغامِ خداوندی ہوتا ہے یا وہ کہتا ہے کہ "میری اطاعت کرو"، تو اس سے مفہوم اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سورۃ ہود کی ان آیات پر بھی غور کیجئے جن میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان فرستادگان سے سُنا کہ وہ قومِ لوطؑ کی تباہی کے لئے مامور ہو کر جا رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس قوم پر سے عذاب ٹل جائے اور انہیں مزید مُہلت مل جائے تاکہ (شاید) وہ اس دوران اپنی اصلاح کر سکیں یہ سب باتیں "فرستادگان" سے ہو رہی تھیں اور انہوں نے بھی جواب میں کہا تھا کہ

يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ (۱۱/۷۶)

اے ابراہیم! اس بات کا خیال چھوڑ دے۔ تیرے پروردگار کا اَمر آ پہنچا

لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کے متعلق کہا ہے کہ

يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ (۱۱/۷۴)

اس نے قومِ لوط کے بارے میں ہم سے سوال و جواب شروع کئے۔

اس لئے کہ کسی مامور سے امر کے متعلق کچھ کہنا، دراصل صاحبِ امر سے کہنے کے مرادف ہے۔ مامور

تو پیغامبر ہوتا ہے۔ پیغام کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ صاحبِ پیغام (جس کی طرف سے پیغام آیا ہے) سے ہی متعلق ہو گا۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے اس باہمی تعلق کو پیشِ نظر رکھنے سے انسان بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتا ہے۔

خلاصۂ مبحث

آج سے قریب چار ہزار سال پہلے، جبکہ دنیا کا بیشتر حصہ، جہالت اور وحشت کی تاریکیوں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، سرزمینِ بابل اپنے مخصوص تمدّن کی درخشندگی سے ہر دیکھنے والے کی نگاہوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے عروج کا تو یہ عالم تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہر دیدۂ بینا کے لئے وجۂ صد استعجاب تھی کہ وہی سَر جو اپنی ندرت کاریوں سے خاک کے ذرّوں کو آسمان کی بلندیوں تک لیجانا چاہتے تھے خود اجرامِ سماوی اور ان کی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز تھے! یہ تضاد کچھ بابل اور نینوا ہی سے مخصوص نہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں جہاں جہاں تہذیب کی بنیادیں تنہا عقلِ انسانی پر استوار ہوئی ہیں، مادی ترقی اور زندگی کے حقائق سمجھنے میں ایسا ہی بُعد اور تضاد رہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنے ہاتھوں سے تراشیدہ مورتیوں (یا اپنے فکر کی کارگاہ میں ڈھلے ہوئے بُتوں) ہی کو اپنا معبود سمجھ لے تو اسے دنیائے انسانیت میں سرفرازی کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اہلِ بابل اس شرکِ جلی کے ساتھ ساتھ ملوکیّت اور برہمنیّت کے شرکِ خفی کی لعنتوں میں بھی گرفتار تھے۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں اُور کے ایک بڑے پجاری کے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جسے دنیا نے آگے چل کر ایک بہت بڑے توحید پرست اور بُت شکن کی حیثیت سے پہچانا۔ ان کا اسمِ گرامی حضرت ابراہیمؑ تھا۔ آپ نے اپنے اس علمِ حقیقی کی بنا پر جو سرچشمۂ وحی سے عطا ہوا تھا اپنے گھرانے کے افراد، قوم کے اراکین، بُت کدہ کے عمائدین اور خود مستبد بادشاہِ وقت کو اجرامِ فلکی اور بتوں کی پرستش پر سرزنش کی اور انہیں، ان کے برعکس، خدائے واحد کی عبودیّت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ چونکہ اپنے معبودانِ باطل کی عقیدت ان لوگوں کے خون کے ذرّات تک میں حلول کر چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس روش کو اسلاف کی طرف سے سندِ موروثیت بھی حاصل ہو چکی تھی، اس لئے اپنے بیگانے، ہر ایک نے اس "انوکھی" تعلیم کی مخالفت کی۔

جوں جوں ان کی طرف سے مخالفت بڑھتی جاتی تھی، یہ معلمِ توحید اپنی دعوت کے پیش کرنے کے اسلوب و انداز بدلتا جاتا تھا، تاکہ اگر ایک پہلو سے نہیں تو کسی دوسرے پہلو سے، ہی بات ان کی سمجھ میں آجائے۔ لیکن بات تو اس کی سمجھ میں آیا کرتی ہے جو بات سمجھنے کی کوشش کرے۔ جو بات کو اس مفروضہ کے ماتحت سنے کہ یہ ہے ہی غلط، بات کی صداقت اس کی سمجھ میں کس طرح آسکتی ہے؟ لیکن آپ کے دلائل ایسے محکم اور اندازِ موعظت و تذکیر ایسا مسکت تھا کہ ان سے مقابلہ میں کوئی جواب نہ بن پڑتا اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی مستبد قوم لاجواب ہو جائے تو وہ کیا کیا کرتی ہے؟ انہوں نے یہ سب کچھ کیا لیکن یہ اپنے مقام سے ذرا بھی نہیں ہٹے۔ جب آپ نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اس قوم میں قبولیتِ حق کی صلاحیت ہی نہیں تو آپ نے اس سرزمین کو چھوڑا، تاکہ کوئی اور ایسا خطہ تلاش کیا جائے جس میں حق و صداقت کی بارآوری کی استعداد موجود ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنے برادرزادہ (حضرت) لوطؑ کے ساتھ (جنہیں بعد میں اللہ نے شرفِ نبوت سے نوازا تھا) اس ملک کو چھوڑا اور حالات کے مطالعہ اور معائنہ کے بعد سرزمینِ فلسطین میں متمکن ہو گئے۔ یہیں کبرسنی کے عالم میں مبدارِ فیض نے انہیں حضرت اسمٰعیلؑ جیسا فرزند عطا فرمایا جسے بعد میں اللہ نے تولیتِ کعبہ کی خدمتِ عظیمہ کے لئے مختص کر لیا۔ حجاز کی بے برگ و گیاہ زمین میں انہی باپ بیٹے نے "اللہ کے گھر" کی دیواریں بلند کیں۔ آپ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو وہیں بسا دیا اور خود حضرت اسحاقؑ کے ساتھ فلسطین واپس تشریف لے آئے جہاں آپ کی اولاد "بنی اسرائیل" کے نام سے تاریخ کے صفحات پر اُبھرے ہوئے نقوش کی صورت میں دنیا سے متعارف ہوئی۔

یوں تو دنیا میں ہر رسول کی بعثت کا مقصد دعوتِ توحید ہوتا ہے لیکن جس ناسا عد ماحول میں حضرت ابراہیمؑ نے اس شدّ و مد سے اپنی دعوت کو پیش کیا اس کے پیشِ نظر قرآن نے آپ کی اس خصوصیتِ کبریٰ کو نمایاں طور پر اُجاگر کیا ہے۔ کہیں ایجابی انداز سے یہ کہہ کر کہ وہ ملّتِ موحّدہ کے مورثِ اعلیٰ تھے اور کہیں، اس اعتبار سے کہ (بقول ہیگل) "اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں"، اس قسم کے سلبی انداز سے کہ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (۲/۱۳۵) اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بھی نمایاں طور پر بیان کیا ہے کہ آپ ہی کا مسلک بنی اسرائیل کا سچا مذہب تھا اور اس کے بعد مُحَمَّدؐ عربی نے بھی اسی ملّتِ ابراہیمیؑ کا احیاء اور اتباع کیا۔ اس اعتبار سے دنیا میں توحید کے جس انقلابِ عظیم کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں رکھی گئی تھی اس کی تکمیل نبئ اکرمؐ کی باطل شکن دعوت سے ہوئی۔ قرآنِ کریم نے حضرت

ابراہیمؑ کی انہی خصوصیات کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے اور ان کی سیرت کے مختلف گوشوں کو اس حسین انداز سے سامنے لایا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آج بھی ہمارے بزرگِ خاندان کی حیثیت سے ہم میں چلتے پھرتے ہیں۔

اس کے برعکس تورات کو دیکھئے تو اس میں آپ کی حیثیت ایک قبیلہ کے سردار سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ دورِ حاضرہ کی تحقیقات اسی مقامِ ابراہیمیؑ کی تصدیق کر رہی ہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "ابراہیم" کے عنوان کے ماتحت لکھتا ہے:۔

> ایک خدائے عظیم جو عرش کی بلندیوں پر مستوی ہے جس کی عظمت کو برہمن اور ہیکل کی وساطت کے بغیر ثبت کیا جا سکتا ہے، خدائے مطلق محیطِ کُل، وہ ذات جس تک ہر مومن کی رسائی ممکن ہے۔ یہ ہے ابراہیم کا خدا۔ (اور حقیقت یہ ہے کہ) روایات کی تفاصیل کی بہ نسبت ہمارے نزدیک (حضرت) ابراہیمؑ کا یہ کارنامہ زیادہ اہم ہے۔

یہ ہوئی ایک خصوصیت۔ دوسری خصوصیت۔

> ابراہیم، اسرائیلیوں کی ملّت (مذہب) کا مؤسس تھا۔

اور تیسری خصوصیت۔

> (حضرت) محمدؐ کی طرح، آپ سے دو ہزار سال قبل سامی اقوام و قبائل میں (حضرت) ابراہیم بھی ایک عظیم الشان تحریک کے قائد تھے۔

یہ تھے حضرت ابراہیم! (علیہ السلام)

خلاصۂ مبحث

(حضرت لوطؑ)

جب حضرت ابراہیمؑ فلسطین میں متمکن ہو گئے تو اللہ تعالےٰ نے حضرت لوطؑ کو سدوم کے علاقہ کے لوگوں کی اصلاح کے لئے منتخب کیا اور آپ اُدھر تشریف لے گئے۔ یہ تو قرآن کا بیان ہے لیکن تورات، حسبِ دستور، اس واقعہ کو بھی "قبائلی مناقشات" کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ چنانچہ کتابِ پیدائش کے تیرھویں باب میں مذکور ہے :-

> اور ابراہیم کے چرواہوں اور لوط کے چرواہوں میں جھگڑا ہوا .... تب ابراہیم نے لوط سے کہا کہ میرے اور تیرے درمیان اور میرے چرواہوں اور تیرے چرواہوں کے درمیان جھگڑا نہ ہوا کرے کہ ہم بھائی ہیں .... اپنے تئیں مجھ سے جدا کیجئے۔
>
> (پیدائش ۷ — ۱۳/۹)

اسی طرح قرآنِ کریم میں ہے کہ چونکہ حضرت لوطؑ کی بیوی ایمان نہ لائی تھی اس لئے وہ بھی جماعتِ منکرین کے ساتھ ہلاک ہوگئی۔ لیکن تورات کا بیان ہے کہ آپ کی بیوی آپ کے ساتھ ہی اس بستی سے محفوظ نکل آئی تھی۔ لیکن آگے آکر

> اس کی جورو نے اس کے پیچھے پھر کر دیکھا اور
> وہ نمک کا کھمبا بن گئی۔ (پیدائش، باب ۱۹، آیت ۲۶)

قومِ لوط کی حیاسوز فحاشی دنیا میں بطور ضرب المثل مشہور ہے۔ تورات کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ وبا وہاں سے آگے بڑھی اور یہودیوں میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ اس کے خلاف حکم نافذ

کرنا پڑا۔ کتاب احبار میں ہے۔

تو مرد کے ساتھ، جس طرح عورت کے ساتھ سوتا ہے مت

سو۔ یہ مکروہ ہے۔　　　(باب ۱۸، آیت ۲۲)

قرآنِ کریم نے قومِ لوط کی جن بستیوں (سدوم اور عمارہ وغیرہ) کی بربادی کا ذکر کیا ہے وہ بحرِ میت کے اردگرد واقع تھیں۔ دورِ حاضرہ کے اثری اور تاریخی اکتشافات سے اس کی تصدیق ہوتی جا رہی ہے۔ تفصیل کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں سدوم (SODOM) اور بحرِ میت (DEAD SEA) کے عنوانات دیکھئے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ (۱۲/۵۶)

جمالِ یوسفی

حسنِ سیرت کی رعنائیاں

نور و نکہت کی داستانِ خموش!

حضرت یوسف علیہ السلام

گذشتہ ابواب میں حضرات انبیائے کرامؑ کے جو احوال و کوائف ہمارے لئے وجہِ نورانیت قلب و نظر ہوئے ہیں وہ قرآنِ کریم کے صفحات پر پراگندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے جنھیں مختلف گوشوں سے چُن چُن کر ایک سلکِ گہر دار میں پرو دیا گیا۔ لیکن نور و نکہت کی جو مقدّس داستان اس وقت ہمارے لئے جنّتِ نگاہ بن رہی ہے، وہ اس صحیفۂ آسمانی کے ایک ہی باب میں سلسلۃ الذہب کی طرح مسلسل بیان ہوئی ہے۔ سابقہ انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ، درحقیقت ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف کے ساتھ منسلک تھے جو ان کی دعوتِ رشد و ہدایت کی مخاطب تھیں اور ان کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ وہ اقوام، قوانینِ خداوندی کی تکذیب سے کس طرح تباہ و برباد ہو گئیں۔ موجودہ داستانِ زرّیں اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ایک فرد کے جوہرِ ذاتی یعنی اس کے حُسنِ عمل کی قوت اور سیرت (کیرکٹر) کی فضیلت اسے کس طرح خاک نشینی سے اُٹھا کر مدارج و مناصب کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن یہ راہ صحنِ گلستان کی روش نہیں کہ جس میں انسان رنگینیٔ بہار کے جھُولے جھولتا، مچلتا، لوٹتا، اٹھکھیلیاں کرتا بڑھتا چلا جائے۔ یہ وہ کٹھن راستہ ہے جہاں قدم قدم پر ایسی صبر آزما اور نظر فریب لغزش کی گھاٹیاں آتی ہیں کہ جہاں سے ذرا پاؤں پھسلا اور انسان سیدھا ذلت و خواری کے جہنّم میں جا گرا۔ اس راستہ سے ہر کانٹے سے دامن بچاتے اور ہر گھاٹی سے قدم سنبھالتے مردانہ وار صحیح و سلامت آگے بڑھ جانا یقیناً من عزم الامور ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس میں ہر چشمِ بصیرت کو گوشے گوشے میں جمالِ یوسف کی رعنائیاں جلوہ بار نظر آتی ہیں اور وہ قدم قدم پر اُن کے نقوش پاکے

متبسم ذرات کو دیکھ کر بےساختہ پکار اُٹھتی ہے کہ ؎

موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی!

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ دجلہ و فرات کی شاداب (لیکن خزاں در آستیں) وادیوں اور بابل و نینوا کی پُرشکوہ (لیکن فنا در آغوش) آبادیوں سے ہجرت کر کے فلسطین کے علاقے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے' جہاں عام ذریعۂ معاش گلہ بانی تھا۔ اس علاقے میں حضرت اسحٰقؑ نے عمر بسر کی اور یہیں اُن کے بیٹے حضرت یعقوبؑ متمکن رہے۔ چوپانوں کے اسی مویشی چرانے والے قبیلہ میں حضرت یوسفؑ کی پیدائش ہوئی جنہوں نے اپنی زندگی کے قریب سولہ سترہ برس اسی بیابان میں بسر کئے۔

لوحِ جبیں میں مستقبل کا آئینہ

لوگ اس بچے کو عام چرواہے سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے لیکن باپ (حضرت یعقوبؑ) کی حقیقت بیں نگاہیں بیٹے کی پیشانی میں کچھ اور ہی جھلکتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس کی خداداد ذہانت و فطانت اور سنجیدگی و متانت سے اس کی لوحِ جبیں پر کھلے کھلے الفاظ میں پڑھ رہے تھے کہ دایۂ فطرت اُسے کس طرح مویشیوں کی پاسبانی سے جہاں داری و جہاں بانی کے طور طریق سکھا رہی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر بیٹا باپ کی آنکھوں کا تارا بن رہا تھا۔ لیکن یہ چیز دوسرے بھائیوں[1] کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی یہیں سے اس قصے کی ابتدا ہوتی ہے۔

اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝ (۱۲/۴)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا "اے میرے باپ! میں نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند' اور یہ سب میرے سامنے

---

[1] تورات بتاتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے (مختلف بیویوں سے) بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسفؑ اور بن یامین حقیقی تھے اور یامین سب سے چھوٹے تھے۔ اس لئے حضرت یوسفؑ کی طرف باپ کا میلانِ خصوصی' سوتیلے بھائیوں کی آتشِ حسد و رقابت کا موجب بن گیا تھا۔

سجدہ ریز ہیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۲/۵)

(باپ نے کہا) "اے میرے بیٹے! اپنے اس خواب کا حال اپنے بھائیوں سے نہ کہہ دیجیو کہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبہ کی تدبیریں کرنے لگیں۔ یاد رکھ! شیطان (حسد و عداوت کا جذبہ) انسان کا صریح دشمن ہے۔"

دیکھئے! بیٹوں کے حسد کو کس طرح "شیطان کی عداوت" کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سے "شیطانی" وسواس و مکائد کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم")۔ یہ تاکید کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ انھیں حضرت یوسفؑ کا مستقبل کس قدر درخشندہ نظر آرہا تھا۔ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۱۲/۶)

اور (اے میرے بیٹے!) جس طرح تُو نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند تیرے آگے جھکے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ خدا تجھے کسی عظیم مقصد کے لئے منتخب کرے گا اور تجھے اس قسم کی فراست و بصیرت عطا کرے گا جس سے تیری نگاہ معاملات کے انجام و مآل تک پہنچ جائے۔ نیز جس طرح وہ اب سے پہلے تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحٰق پر اپنی نعمت پوری کر چکا ہے، اسی طرح تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر بھی پوری کرے گا۔ بلاشبہ تیرا پروردگار (سب کچھ) جاننے والا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

"تاویل الاحادیث" سے کیا مفہوم ہے؟ اس کی تشریح اخیر میں آئے گی۔ اس امر کی تصریح بھی اپنے موقع پر آجائے گی کہ حضرت یوسفؑ پر اتمامِ نعمت کس طرح ہوا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں میں جو کچھ گذری اس کی تفصیل مذکور ہے، جس کے متعلق فرمایا کہ اس میں

ہر متجسسِ حقیقت اور جویائے صداقت کے لئے نشانیاں ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝ (۱۲/۷)

جو لوگ (حقیقتِ حال) پوچھنے والے ہیں (اگر وہ سمجھیں تو) ان کے لئے یوسف اور ان کے بھائیوں کے معاملہ میں (موعظت و عبرت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

برادرانِ یوسفؑ کی آتشِ حسد

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے جذباتِ حسد و عداوت کی شدت میں یہ طے کرلیا کہ کسی طور پر اس چہیتے بیٹے کو باپ سے جدا کردیا جائے۔

اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِۚۖ ۝ اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ۝ (۸ – ۱۲/۹)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ (یوسف کے بھائی آپس میں) کہنے لگے "ہمارے باپ کو یوسف اور اس کا بھائی (بن یامین) ہم سب سے زیادہ پیارا ہے۔ حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں۔ (یعنی ہماری اتنی بڑی تعداد ہے) اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔

پس (بہتر یہ ہے کہ) یوسف کو مار ڈالیں یا کسی جگہ پھینک آئیں، تاکہ ہمارے باپ کی توجہ ہماری ہی طرف رہے اور اس کے نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھر جائیں اور یہ اونچ نیچ باقی نہ رہے۔

تورات میں ہے کہ ان میں سے ایک بھائی (روبن) نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو، اندھے کنویں میں ڈال دو۔ قرآنِ کریم میں ہے:

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝ (۱۲/۱۰)

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا "نہیں، یوسف کو قتل مت کرو۔ اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ (گذرنے والے قافلوں میں سے کوئی قافلہ (اس پر سے

گذرے گا اور) اسے نکال لے گا۔

سازش

یہ تجویز طے پاگئی تو وہ سب باپ کے پاس آئے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۲/۱۲-۱۱)

اور اس سے کہا " اے ہمارے باپ! کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے؟ (اور ہمارے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیتے؟) حالانکہ ہم تو اس کے دل سے خیرخواہ ہیں۔ کل ہمارے ساتھ اُسے (جنگل میں) جانے دیجئے کہ کھائے پیئے، کھیلے کودے۔ ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کو، تربیتِ خصوصی کے پیشِ نظر، اپنے سے جُدا نہیں کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے دوسرے بیٹے اسے عدم اعتماد پر محمول کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ آپ اس کے بارے میں ہم پر اعتماد کیوں نہیں کرتے؟ اس پر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ تم پر بے اعتمادی نہیں بلکہ:

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ (۱۲/۱۳)

مجھے خطرہ ہے کہ تم اسے اپنے ہمراہ لے جاؤ اور اسے بھیڑیا کھالے اور تم اس سے غافل ہو۔

قرآنِ کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ اُس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر کیا تھی۔ اس خدشہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت کچھ زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن تورات کا بیان ہے کہ اس وقت آپ کی عمر سترہ ۱۷ برس کی تھی۔

> یعقوب کا احوال یہ ہے کہ یوسف سترہ برس کا ہو کے اپنے بھائیوں کے ساتھ گلّہ چراتا تھا اور وہ جوان اپنے باپ کی جورؤوں بلہاہ اور زلفہ کے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور یوسف ان کے باپ پاس اُن کے بُرے کاموں کی خبر لاتا تھا۔ (پیدائش ۲/ ۳۷)

اگر یہ بیان صحیح ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ زیادہ وقت باپ ہی کے پاس رہتے ہوں گے اور جنگل کی زندگی کے عادی نہیں ہوں گے۔ اسی لئے باپ نے کہا کہ مجھے خدشہ ہے کہ اسے جنگل میں کوئی بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے۔ باپ کے اس خدشہ پر بیٹوں نے کہا۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ

(۱۲/۱۴)

انہوں نے کہا " بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بھیڑیا اُسے کھالے اور ہمارا پورا ایک جتھا موجود ہو۔ اگر ایسا ہو تو ہم پھر بڑے نکمّے ہی نکلے!

گلہ بانی کی زندگی میں بھیڑیوں کے حملے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسی خیال سے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیٹوں کی بدخواہ طبیعت نے اس چیز کو اپنے سلسلۂ مکر و فریب کی ایک کڑی بنانے کے لئے گرہ میں باندھ لیا۔ بھائی انہیں ساتھ لے گئے اور اپنی طے شدہ خفیہ تجویز کے مطابق حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ (۱۲/۱۵)

پھر جب یہ لوگ (باپ سے رخصت لے کر) یوسف کو ساتھ لے گئے اور سب نے اس پر اتّفاق کر لیا کہ اندھے کنوئیں میں ڈال دیں (اور ایسا ہی کر گذرے)!

یوسفؑ در چاہ

ذرا اندازہ لگائیے اس جگر گداز سانحہ اور ہوش رُبا منظر کا کہ باپ کا چہیتا بیٹا، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں، زندہ درگور کیا جا رہا ہے! اس بھیانک قبر میں حضرت یوسفؑ کے دل پر کیا گذری ہو گی؟ لیکن اِدھر انہوں نے حضرت یوسفؑ کو (بزعمِ خویش) دنیا کے تمام اسباب و علائق سے منقطع کیا اور اُدھر اسباب و علل کے مالکِ حقیقی نے فوراً وحی بھیجی کہ مت گھبراؤ۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

(۱۲/۱۵)

تو ہم نے یوسف پر وحی بھیجی کہ (مایوس نہ ہو) ایک دن ضرور آنے والا ہے، جب تو انہیں جتائے گا کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا اور ان کی عقل و شعور میں بھی نہیں آئے گا (کہ تم کیسے زندہ بچ گئے اور اس مقام تک پہنچ گئے)۔

بھائیوں کی واپسی

مکر و فریب کے یہ سنگدل مجسمے شام کے قریب گھر لوٹے لیکن عجیب ڈھونگ رچائے ہوئے۔

وَ جَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ۝(۱۲/۱۶)

وہ اپنے باپ کے پاس شام کو روتے پیٹتے آئے۔

اور کہا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝ (۱۲/۱۷)

"اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے لئے دوڑ میں لگ گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ پس ایسا ہوا کہ بھیڑیا آ نکلا اور یوسف کو (مار کر) کھا لیا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ آپ ہماری بات کا یقین کرنے والے نہیں، اگرچہ ہم کتنے ہی سچے ہوں"۔

آیت کے آخری ٹکڑے پر پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ برادرانِ یوسفؑ کے قلبِ خائن (GUILTY CONSCIENCE) کی دھڑکنیں ان کے مکر و فریب کے چلمنی پردوں سے کس طرح پھٹ پھٹ کر باہر آ رہی ہیں۔ "اگرچہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں آپ تو ہمارا یقین کریں گے ہی نہیں"۔ نفسِ نیم شعوری (SUB-CONSCIOUS MIND) کی بیتابانہ، لیکن غیر محسوس کیفیت کا ایسا صحیح نقشہ قرآنِ کریم کے معجزانہ اسلوبِ بیان کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے فریب کارانہ طور پر رونا دھونا بھی شروع کیا اور ساتھ ہی اس مکر کی تکمیل کے لئے حضرت یوسفؑ کے کُرتے پر جھوٹ مُوٹ کا خون بھی لگا لائے تاکہ اسے بطور شہادت پیش کر دیا جائے۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ(۱۲/۱۸)

اور وہ یُوسف کے کُرتے پر جھوٹ مُوٹ کا خون لگا لائے تھے۔

انہوں نے اپنی طرف سے تو اس سوانگ میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن ایک صاحبِ فراست کی نگہِ بصیرت کے لئے اس قسم کے جھوٹ اور سچ میں فرق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ کیوں یونہی باتیں بنا رہے ہو۔ یہ ساری کہانی تمہارے فریبِ نفس کے سوا اور کچھ نہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ (۱۲/۱۸)

(باپ نے) کہا "نہیں (میں یہ نہیں مان سکتا) یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے نفس نے گھڑ لی ہے اور تمہیں خوشنما (بنا کر) دکھا دی ہے (اور تم سمجھتے ہو کہ چل جائے گی)۔

صبرِ یعقوبؑ

حضرت یعقوبؑ کو اس بات کا یقین تھا کہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں (کیونکہ آلِ یعقوبؑ کے لئے اللہ کی اتمامِ نعمت کے وعدے اُنہی کی ذات سے پورے ہونے تھے) اس لئے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس میں مشیّت کا ہاتھ کارفرما ہے۔ لہٰذا' ایسے محبوب بیٹے کے فراق کے صدمے کو استقلال و تحمّل سے برداشت کرنا چاہیئے۔ اسی لئے فرمایا۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ط (۱۲/۱۸)

خیر میرے لئے اب صبر کرنا ہے (اور) صبر (بھی ایسا کہ پسندیدہ ہو)۔

یعنی دردِ فراق کی سینہ کاویوں کو جھیلوں گا اور نہایت مردانہ وار جھیلوں گا۔

وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ o (۱۲/۱۸)

اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگنی ہے۔

اُدھر یہ ہو رہا تھا۔ اِدھر ایسا ہوا کہ ایک قافلہ کا گزر اس راستہ سے ہوا جس پر وہ کنواں پڑتا تھا جس میں حضرت یوسفؑ کو ڈالا گیا تھا۔ انہوں نے پانی لینے کے لئے اپنا آدمی کنویں پر بھیجا۔ اس نے ڈول لٹکایا۔ حضرت یوسفؑ نے اسے نجات کی راہ سمجھی اور ڈول کے ساتھ اوپر چڑھ آئے۔ جب اوپر پہنچے

قافلہ والوں کے ہاتھ میں

تو وہ یوسفؑ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس زمانہ میں بردہ فروشی کا عام رواج تھا۔ اہلِ قافلہ نے اسے مُفت کی متاع سمجھا اور چُھپا کر رکھ لیا کہ کوئی تلاش کرنے والا نہ آ نکلے۔

وَ جَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ط قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ط وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ط وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ o (۱۲/۹)

اور دیکھو' ایک قافلہ کا اُس (کنویں) پر گزر ہوا (جس میں یوسف کو ڈالا گیا تھا) اور قافلہ والوں نے پانی لینے کے لئے اپنا سقہ بھیجا۔ پھر جوں ہی اس نے اپنا ڈول لٹکایا (اور یہ سمجھ کر کہ پانی سے بوجھل ہو چکا ہے اوپر کھینچا) تو (کیا دیکھتا ہے کہ ایک جیتا جاگتا لڑکا اس میں بیٹھا ہے! وہ) پکار اُٹھا " کیا خوشی کی بات ہے! یہ تو ایک لڑکا ہے" اور پھر قافلہ والوں نے آسے

سرمایۂ تجارت سمجھ کر چھپا رکھا (کہ کوئی دعویدار نہ نکل آئے)۔ اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھا!

تورات میں ہے کہ یہ قافلہ اسمٰعیلی عربوں کا تھا جو اپنا سامانِ تجارت لے کر مصر جا رہا تھا۔ نیز یہ کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں بیس سکّوں کے عوض قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم کا یہ بیان ہے کہ اہلِ قافلہ نے انہیں چھپا کر رکھ لیا تھا کہ اُن کا کوئی دعویدار نہ آ نکلے۔ آج بھی خانہ بدوش قبائل جو اس قسم کی بردہ فروشی کرتے ہیں ہاتھ پڑے بچّوں کو اسی طرح چھُپا کر کہیں سے کہیں لیجاتے ہیں۔

اب حضرت یوسفؑ کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے (اور اندازہ لگایئے کہ کس رُوح فرسا مصیبت سے شروع ہوتا ہے)۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فلسطین کی زندگی بدوی زندگی تھی، جیسے جنگلوں میں مویشی چرانے والوں کی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مصر اُس زمانہ میں تمدّن و حضارت کی ان بلندیوں پر تھا کہ آج بھی جب اُس کے نوادرات کے زیرِ زمین دفینے باہر نکلتے ہیں تو چشمِ حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے کہ وہ زمانہ اور اس قسم کے تہذیب و تمدّن کے نمونے! جس طرح آج بھی شہروں کی "مہذّب" آبادی کے نزدیک گاؤں والوں کی غیر مہذّب زندگی نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اہلِ مصر، اپنے گرد و پیش کے چرواہوں کو سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ بہرحال، صحرائی علاقہ کے

پھر بازارِ مصر میں!

چرواہوں کا ایک لڑکا مصر کی آبادی میں پہنچتا ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ ایک اجنبی قافلہ والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے جو اسے بازار میں جنس کی طرح بیچنے کے لئے لئے جا رہے ہیں۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ (۱۲/۲۰)۔

اور پھر انہوں نے یوسف کو بہت کم داموں پر کہ گنتی کے چند درہم تھے (بازارِ مصر میں) فروخت کر دیا۔ اور وہ اس معاملہ میں (اچھی قیمت لینے کے چنداں) خواہشمند بھی نہ تھے (یعنی چونکہ لڑکا مفت مل گیا تھا اور انہیں خطرہ بھی تھا کہ اس کے لواحقین پیچھے سے آ گئے تو وہ مشکل میں پھنس جائیں گے، اس لئے انہیں جو کچھ ملا، اسے غنیمت سمجھا اور لڑکے کو خریدار کے حوالے کر دیا)۔

انہوں نے اس "غلام" کو سرِ بازار فروخت کر دیا۔ اور چونکہ مال مفت ہاتھ آ گیا تھا اس لئے اس کی بھی

چنداں پرواہ نہ کی کہ کتنے میں بک رہا ہے۔ جو کسی نے دیا لینے کی کی۔

اللہ اکبر! غلام اور اس بے قدری سے بکا ہوا غلام!! یوں مصر میں داخلہ ہوا۔ تورات میں ہے کہ جس شخص نے حضرت یوسفؑ کو خریدا تھا اس کا نام فوطیفار تھا۔

اور مدیانیوں نے اسے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا بیچا۔ (پیدائش ۳۷/۳۶)

اور وہ مصر کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اسے فقط عزیز (بڑی عزت والا یا صاحبِ اختیارات) کے لقب سے پکارا ہے کہ مقصد اس کی حیثیت کا تعارف تھا نہ کہ اس کے عہدے کا ذکر۔

وہاں سے عزیز کے محلات میں

عزیز نے حضرت یوسفؑ کو ایک غلام کی حیثیت سے خریدا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے آپ کی راست بازی، دیانتداری، حُسنِ سیرت اور خداداد فراست سے اندازہ لگالیا کہ یہ لڑکا اس قابل ہے کہ اس پر کُلّی اعتماد کیا جائے اور گھر کا نظم و نسق اس کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ (۱۲/۲۱)

اور اہلِ مصر میں سے جس شخص نے یوسف کو قافلہ والوں سے مول لیا تھا، وہ (مناسب تجربۂ دیانت و امانت کے بعد) اپنی بیوی سے بولا کہ اسے عزت کے ساتھ رکھو۔ عجب نہیں یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔

قرآنِ کریم نے اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ (اسے عزت کے ساتھ رکھو) کہہ کر کہانی کا ایک بہت بڑا حصہ دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ حیاتِ یوسفیؑ میں پہلا انقلاب تھا، یعنی غلام کی حیثیت سے گھر میں داخل ہوئے اور وہ بھی کنعانی غلام (یعنی مصریوں کے نزدیک ایک گنوار غلام) کی حیثیت سے۔ اور چند ہی روز میں مصر کے ایک بہت بڑے صاحبِ منصب امیر کے گھر بار کے معتمد علیہ ناظم بن گئے۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ (۱۲/۲۱)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کا سرزمینِ مصر میں قدم جما دیا اور مقصود یہ تھا کہ

وہاں اس کی ایسی اچھی تعلیم و تربیت ہو جائے کہ اس کے خفتہ جوہر بیدار ہو جائیں اور اس کی استنباطِ نتائج کی صلاحیت چمک اُٹھے۔

چوپانی سے جہاں بانی کے انداز

یوں حضرت یوسفؑ کے قدم سرزمینِ مصر میں جما دیئے گئے اور اتنے بڑے نظم و نسق کو ان کے ہاتھ میں دے کر حُسنِ تدبیر اور معاملات فہمی (تاویل الاحادیث) کی تعلیم کے مواقع بہم پہنچا دیئے، اس لئے کہ

وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۱۲/۲۱)

اور اللہ اپنی اسکیموں میں کامیاب رہتا ہے لیکن اکثر آدمی ہیں کہ نہیں جانتے!

ذرا غور کیجئے! مشیت کی تدبیر کو اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچنے کے لئے اسباب و علل کی کون کونسی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن عام انسانوں کی نگاہوں سے چونکہ یہ راز پنہاں ہوتا ہے اس لئے وہ تدابیر کی ان کڑیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

اس طرح حضرت یوسفؑ نے اس جدید ماحول میں پرورش پانا شروع کیا۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ (۱۲/۲۲)

اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچا، تو ہم نے اُسے کار فرمائی کی قوت اور علم کی فراوانی بخشی۔

ہم نیک عمل والوں کو ایسا ہی (اُن کی نیک عملی کا) بدلہ عطا فرماتے ہیں!

جب حضرت یوسفؑ نے عمر کے کچھ مراحل اور طے کرلئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کار فرمائی کی قوت اور علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور یہ سب اُن کے حُسنِ عمل کی بدولت تھا۔ (وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)

غور کیجئے! قرآنِ کریم نے اس پہلے انقلاب کے ساتھ ہی نگاہوں کو کس طرح قصہ سے عبرت و موعظت کی طرف ملتفت کر دیا، یعنی یہ انقلاب یونہی اتفاقیہ سرزد نہیں ہو گیا تھا بلکہ خدا کے اس اٹل قانون کے ماتحت واقع ہوا تھا کہ حُسنِ سیرت اور فضیلتِ کردار کا لازمی نتیجہ ایسا ہوتا ہے۔ (وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)۔

اب اس زریں داستان کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اس وادی میں داخل

ہوتا ہے جہاں سیرت و کردار کی آزمائش کے لئے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب مناظر، سامانِ صد بہار بداماں کئے، دامِ ہمرنگِ زمین کی طرح چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت بھرپور جوانی کی تھی، تمدّن و حضارت کی اعصاب شکن مصنوعی زندگی سے دُور، دشت و بیاباں کی کھلی فضاؤں میں پرورش یافتہ۔ آج بھی اس کا اندازہ لگانا ہو کہ کھلی فضائیں اور سادہ و بیباک زندگی، انسانی حُسن کو کس طرح نکھارتی ہے تو آزاد قبائل کے کسی بچّے کو دیکھئے۔ افلاس و غربت کا یہ عالم کہ بدن پر کپڑے نہیں، چیتھڑے ہیں، لیکن صحت و تندرستی کو دیکھئے تو رگ رگ سے ارغوانی موجیں تلاطم خیز ہیں۔ حُسن، صحت کا نام ہے اور جب صحت و جوانی یک جا ہو جائیں، تو ان کے امتزاج سے جذب و کیف کا ایک ایسا بلّوریں مجسّمہ وجود میں آ جاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائی و رعنائی سے مرتسم دکھائی دیتی ہے۔ پھر رگوں میں خانوادۂ نبوّت کا صالح خون! ان تمام خصوصیات کے ساتھ حُسنِ عفّت سونے پر سہاگہ۔ تندرست جوانی اگر قلب و نگاہ کی پاکیزگی میں گزرے تو اس سے

حُسنِ سیرت اور حُسنِ صُورت

بڑا حُسن اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تھے حضرت یوسفؑ۔ دوسری طرف عزیز کی بیوی، تہذیب و تمدّن کی بیباکیوں کی تخلیق، عشرت و کامرانی کے ماحول کی پروردہ، دولت کی مرصّع کاریوں سے جگمگاتا حُسن۔ غرضیکہ دونوں طرف جذب و کشش کے پورے پورے سامان۔ لیکن ایک طرف جذباتِ نفس کی مکمل حکمرانی اور دوسری طرف ترغیباتِ نفس پر حدود اللہ کی سلطانی۔ نتیجہ یہ کہ حضرت یوسفؑ کا خیال کبھی بھولے سے بھی اُدھر نہ گیا۔ لیکن عزیز کی بیوی کی دل باختگی، آتشِ خاموش کی طرح سلگتی چلی گئی۔ حتّٰی کہ ایک دن جوشِ

دوسری طرف؟

فریفتگی نے شعلۂ بیباک کی صورت اختیار کر لی۔ حضرت یوسفؑ کمرے کے اندر تھے۔ وہ عشوہ طرازیوں کا فتنۂ مجسّم، ہزاروں بجلیاں اپنے دامنِ نگاہ میں لئے وہاں آ پہنچی۔ دروازے بند کر لئے اور ناز، ہزار نیاز مندیوں کے ساتھ، ایک نگۂ التفات کے لئے ملتجی ہوا۔ قرآنِ کریم نے اس تمام واقعہ کو چند لفظوں میں سمو دیا ہے۔ فرمایا۔

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ (۱۲/۲۳)

اور پھر (ایسا ہوا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی)، وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی

گئی اور) ڈورے ڈالنے لگی کہ بے قابو ہو کر بات مان جائے۔ اُس نے (ایک دن) دروازے
بند کر دیئے اور بولی "لو آؤ!"

کشمکش

اُدھر سے یہ التجائیں تھیں اور اِدھر یہ خیال دامنگیر کہ معاذ اللہ! یہ کتنی بڑی خیانت ہے جس کی طرف مجھے دعوت دی جا رہی ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (۱۲/۲۳)

یوسف نے کہا" معاذ اللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی) میرے پروردگار نے مجھے سیرت و کردار کے ایسے بلند اور موزوں مقام پر پہنچا دیا ہے (کیا تو مجھے اس مقام سے نیچے گرانا چاہتی ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا)۔ یہ تو قانونِ خداوندی سے کھلی ہوئی سرکشی ہے اور ایسے لوگوں کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھا کرتیں۔

لیکن اس کی آتشِ جذبات کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس دیوانگی میں سب کچھ بھول کر معاملہ کی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ذرا غور کیجئے۔ اس کمرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے والا نہ تھا۔ جذباتِ نفس کی تسکین کے پورے سامان موجود تھے۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلاب انگیزیوں کے باوجود حضرت یوسفؑ کے دامنِ عفت کو تر نہ ہونے دیا! فقط ایک اللہ کا خیال! یعنی اس بات پر ایمان اور غیر متزلزل ایمان کہ جب کوئی اور دیکھنے والا نہیں تو ایک ذات ایسی ہے جو دیکھنے والی ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہر غلط کام اپنا تباہ کن نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے، خواہ اس پر گرفت کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہ تھا امرأة العزیز اور حضرت یوسفؑ

دونوں میں فرق

میں فرق۔ ایک کی آنکھوں پر ترغیباتِ نفس کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کی نگہ، حقیقت رس ایسے خود فراموش ماحول میں بھی قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہی تھی ورنہ انسان ہونے کی حیثیت سے جوانی کی اُمنگیں دونوں طرف تھیں۔ دیکھئے قرآنِ کریم نے اس بیّن فرق کو ایجاز و اختصار کے باوجود کس حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا:۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ

رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (۱۲/۲۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت یوسف کے پیچھے پڑ چکی تھی اور اس نے حالات ایسے پیدا کر دیئے تھے کہ اگر یوسف (کی جگہ کوئی اور ہوتا جس) کے سامنے اپنے پروردگار کا یہ اخلاقی قانون نہ ہوتا تو وہ بھی اس کی طرف مائل ہو جاتا۔ اس اخلاقی قدر کے سامنے ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس فحش کام سے مجتنب رہا اور اس سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو برگزیدگی کے لئے چُن لئے گئے ہوں۔

اور ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ حضرت یوسفؑ اللہ کے مخلص بندے تھے جن کے متعلق خود ابلیس نے کہا تھا کہ

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (۱۵/۴۰-۳۹)

اس نے کہا "خدایا! چونکہ تُو نے مجھے بہکا دیا ہے، تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لئے (جھوٹی) خوشنمایاں بنا دوں اور (راہِ حق سے) گمراہ کر دوں۔ ہاں، ان میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے، (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں۔"

اور خدا نے کہا تھا کہ

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ (۱۵/۴۲)۔

جو میرے (مخلص) بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ صرف انہی پر چلے گا جو (صحیح) راہ سے بھٹک گئے۔

اس لئے حضرت یوسفؑ ان نظر فریب مناظر کے دامِ تزویر میں کس طرح آ سکتے تھے! اللہ کے بندے ان تمام خار دار جھاڑیوں سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل جاتے ہیں۔

بندہ را کہ بفرمانِ خدا راہ رَود
نگذارند کہ در بندِ زلیخا ماند (غالبؔ)

عورت بے قابو ہو کر دست درازی تک آ پہنچی۔ حضرت یوسفؑ دامن چھڑا کر بھاگے کہ باہر نکل جائیں۔

جذبات بیباک کی دست درازیاں

وہ عورت بھی لپکی کہ آگے بڑھ کر انہیں روک لے۔ اس منظر کو قرآن کریم نے دو الفاظ میں بیان فرمایا کہ

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲/۲۵)

اور (ایسا ہوا کہ) دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس طرح، کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ (یوسف اس لئے کہ عورت سے بھاگ نکلے، عورت اس لئے کہ اُسے نکل بھاگنے سے روکے)۔

وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت یوسفؑ سے آگے نہ بڑھ سکی تو پیچھے سے کرتا پکڑ لیا اور پھٹ گیا۔

وَ قَدَّتْ قَمِيصَهٗ مِنْ دُبُرٍ (۱۲/۲۵)

اور عورت نے یوسف کا کُرتا کھینچا اور وہ پیچھے سے پھٹ گیا۔

اور سامنے؟

لیکن اتنے میں حضرت یوسفؑ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے اس عورت کا خاوند کھڑا تھا۔

وَ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ (۱۲/۲۵)

اور (ان) دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازہ کے سامنے کھڑا ہے۔

اس اچانک سانحہ نے امرأة العزیز کے قلب کے ہیجانات کا رُخ فوراً بدل دیا۔ بالآخر بوالہوس ہی تو تھی۔ فوراً اس ذلیل ترین حربہ پر اُتر آئی جو اس قسم کے کیرکٹر کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۱۲/۲۵)

تب عورت نے (اپنا جرم چھپانے کے لئے فوراً بات بنالی، اور اپنے خاوند سے) کہا کہ جو آدمی تیرے اہلِ خانہ کے ساتھ بُری بات کا ارادہ کرے، اس کی سزا کیا ہونی چاہیئے ؟ کیا

یہی نہیں کہ اسے قید میں ڈالا جائے یا (کوئی اور) دردناک سزا دی جائے؟

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:-

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي (۱۲/۲۶)

اس پر یوسف نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتی ہے۔ خود اس نے یہ سب مکر و فریب کیا اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں اس فعلِ شنیع کا مرتکب ہو جاؤں۔ (لیکن میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ نکلا)۔

وہ انہیں ملزم قرار دے رہی ہے اور یہ نہ صرف اقبالِ جرم سے منکر ہیں بلکہ اسے ملزم بتاتے ہیں، کمرے کے اندر کوئی تیسرا تھا نہیں۔ حضرت یوسفؑ اپنی بریت میں **شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا** کسے بطور گواہ پیش کر سکتے تھے؟ لیکن جب بات آگے بڑھی تو خود اس عورت کے کنبے میں سے ایک حق شناس آدمی نے کہا کہ جب کوئی اور گواہی نہیں مل سکتی تو احوال و کوائف کی گواہی (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) کو دیکھنا چاہیئے۔

وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (۱۲/۲۶ — ۲۷)

اور اس عورت کے کنبہ والوں میں سے ایک حق شناس نے گواہی دی۔ اس نے کہا، "یوسف کا کرتا (دیکھا جائے) اگر آگے سے پھٹا ہوا ہے، تو عورت سچی ہے، یوسف جھوٹا ہے۔ اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے، تو عورت نے جھوٹ بولا، یوسف سچا ہے۔

اس نے ایک اصول متعین کر دیا جو فی الواقع فیصلہ کن تھا۔ عزیز نے جب دیکھا تو حضرت یوسفؑ کا کُرتا پیچھے سے پھٹ رہا تھا، جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اور اُس کی بیوی انہیں پیچھے سے پکڑ کر روکنے کے لئے کوشاں تھی۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ○ (۱۲/۲۸)

پھر جب عورت کے خاوند نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو (اصلیت کو پا گیا اور) عورت سے کہا "کچھ شک نہیں یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے۔

اور تم عورتوں کی مکاریاں بڑی سخت مکاریاں ہیں۔

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانۂ تہذیب و تمدن میں عورتوں کے متعلق عام خیال کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ عزیزِ مصر کا قول ہے۔ لیکن بعض سادہ لوح اس فقرہ کو جنسِ نسواں کے مکر و فریب کی تائید میں بطورِ آسمانی شہادت پیش کرتے ہیں، یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب!

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ

عورتیں ہوتی ہی مکر و فریب کی گٹھڑیاں ہیں۔ دیکھئے قرآنِ کریم میں ہے کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ۔ لیکن قرآن کا دامن ان اتہامات سے یکسر پاک ہے۔ اس کے نزدیک نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے دیانتداری اور راستبازی کا مجسمہ ہے اور نہ عورت محض عورت ہونے کے اعتبار سے مکر و فریب کی پیکر۔ دیانت و امانت اور مکر و فریب کی استعداد دونوں میں موجود ہے اور دونوں اپنے اپنے اعمال کے مطابق واجب التکریم یا مستوجبِ نفرین ہیں۔

عزیزِ مصر نے اپنی بیوی کی تو اس طرح ملامت کی اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ اس معاملہ کو رفت گذشت سمجھو۔ اور حضرت یوسفؑ کی بریت کی توثیق کے لئے ایک مرتبہ پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اپنی خطاؤں کی معافی مانگ۔ جرم تیرا ہی ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا سکتہ وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ
اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ع (۱۲/۲۹)

(پھر اس نے کہا) اے یوسف! اس معاملہ سے درگذر کر (یعنی جو کچھ ہوا اُسے بھلا دے)
اور (بیوی سے کہا) اپنے جرم کی معافی مانگ۔ بلاشبہ تو ہی خطا دار ہے۔

اس سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہے کہ اس تمدن میں جس کی بنیاد خدا فراموشی پر ہو انسان میں غیرت و حمیت کا کتنا جذبہ باقی رہ جاتا ہے؟ کسی بدوی قبیلہ میں یہی واقعہ ہوتا (جو مہذب شہریوں کے نزدیک جاہل اور گنوار ہوتے ہیں) تو خاوند کی غیرت ایسی بیوی کی گردن اڑا دیتی۔ لیکن اس "تہذیب کے فرزند" کو دیکھئے

غیر فطری تہذیب میں غیرت کا حشر!

کہ آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا، بیوی کا جرم ثابت ہوگیا اور اس پر زیادہ سے زیادہ کہا تو فقط اتنا کہ تمہارا فرقہ بڑا ہی مکار ہے۔ اور حضرت یوسفؑ سے کہتے ہیں کہ میاں صاحبزادے!

اس قصے کو آگے نہ بڑھانا' یہیں ختم کر دینا۔ اور یہ صرف آج سے چار ہزار سال بیشتر کی تہذیبِ مصری کا نتیجہ نہ تھا۔ ہر وہ تہذیب جس کی عمارت حدود اللہ کی بنیادوں پر استوار نہ ہو اس میں غیرت اور حمیت، جہلا کا حصّہ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بقول اکبر ؂

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حیا ان کو نہیں آتی، انہیں غصّہ نہیں آتا

حقیقت یہ ہے کہ غیرت، ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور "تہذیب" کی حکمرانی میں، عقل پرستی کی آڑ میں، خدا سے انکار کیا ہی اس لئے جاتا ہے کہ نفس کی کامرانیوں میں کوئی روک ٹوک باقی نہ رہے۔

عورتوں کی محفل

اس کے بعد قرآن نے ایک اور واقعہ لکھا ہے جس کی تفصیل اس نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کی ہے۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ (۱۲/۳۱-۳۰)

اور (پھر جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں "دیکھو، عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اسے رجھائے۔ وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی۔ لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے جو طریق اختیار کیا وہ بالکل غلط تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا مقصد بھی حاصل نہ ہوا اور بدنام بھی ہو گئی۔ (اُسے یوں کرنا چاہیئے تھا)۔

جب عزیز کی بیوی نے ان کی اس تدبیر کو سُنا تو انہیں بلوا بھیجا اور ان کے لئے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے مطابق) ہر ایک کو ایک ایک چھُری پیش کر دی (کہ کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب ہو چکا تو) یوسف سے کہا ان سب کے سامنے نکل آ۔ اس

کے بعد انہوں نے وہ سب جتن کر ڈالے جو انہوں نے سوچ رکھے تھے انہوں نے یوسف پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اس پر کس درجہ فریفتہ ہو رہی ہیں کہ انہیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے۔ لیکن یوسف پر ان کا جادو نہ چل سکا۔ اس طرح وہ یوسف کے عظمتِ کردار کی قائل ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ سبحان اللہ! یہ انسان نہیں کوئی واجب التکریم فرشتہ ہے۔

ضمناً قرآنِ کریم نے یہاں "قطعِ ید" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر کلائیوں سے الگ کر دیئے تھے۔ اس سے مراد یا تو محض ہاتھ روک لینے کے ہیں اور یا ہاتھوں کو زخمی کر لینے کے۔ قرآنِ کریم میں چور کی سزا کے سلسلہ میں جو "قطعِ ید" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس کا مطلب یہاں سے واضح ہو جاتا ہے۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اسی مجلس میں جو کچھ ہوا اسے حضرت یوسفؑ نے ان عورتوں کا کید (مکر، خفیہ سازش) کہہ کر پکارا ہے (دیکھئے ۱۲/۳۳؛ ۱۲/۵۰) اور اپنے ربّ سے کہا ہے کہ اگر تو میری حفاظت نہ کرے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا (۱۲/۳۳)۔ اس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ خود وہ عورتیں بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب بادشاہ نے اس معاملہ کی تحقیق کی ہے تو اس نے ان عورتوں سے (یعنی اکیلی عزیز کی بیوی سے نہیں بلکہ دوسری عورتوں سے بھی) کہا تھا۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ (۱۲/۵۱)

(اس پر) بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلایا اور) کہا، "صاف صاف بتلا دو تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا، جب تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اسے اپنی طرف مائل کر لو؟" وہ بولیں "حاشا للہ ہم نے اس میں کوئی برائی کی بات نہیں پائی"۔

ان تمام شواہد سے ظاہر ہے کہ تنہا عزیز کی بیوی نے نہیں بلکہ سوسائٹی کی اور عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اُس محفل میں ان کا مبہوت ہو کر اپنے ہاتھ زخمی کر لینا اور حُسنِ یوسفؑ کی اس قدر تعریف کرنا، ان کا "ایکٹنگ" ہی ہو جس سے مقصود خود اپنی محبّت کا اظہار ہو۔

اس لئے کہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ بڑا موثر ہوتا ہے کہ کسی کے حُسن کی اس طرح والہانہ تعریف کی جائے اور اسے عملاً بتایا جائے کہ اسے دیکھ کر بڑے سے بڑے بھی اپنے ہوش و حواس پر قابو نہیں رکھ سکتے۔

اس کے بعد:

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ (۱۲/۳۲)

تب (عزیز کی بیوی) بولی "تم نے دیکھا؟ یہ ہے وہ آدمی جس کے بارے میں تم نے مجھے طعنے دیئے تھے۔ ہاں بے شک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا۔"

جذبۂ انتقام اس کے بعد وہ عورت اپنی ضد پر آ گئی اور اس نے برملا کہہ دیا۔

وَ لَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ○ (۱۲/۳۲)

"اور (اب اسے سنا کے کہے دیتی ہوں کہ) اگر اس نے میرا کہا نہ مانا (اور اپنی ضد پر اڑا رہا) تو ضرور ایسا ہو گا کہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔"

ذرا اس منظر کو تصور میں لائیے۔ دنیا جہان میں قاعدہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس لئے قید و بند کی مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے کسی کی عصمت پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہاں معاملہ دگرگوں ہے۔ حضرت یوسفؑ کو اس لئے قید کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے جذبات پر قابو کیوں رکھا! یہ پھر ایک نئی آزمائش تھی۔ محل کی آرام کی زندگی، ہر ایک پر حکومت، عزت و وقار، دولت و حشمت اور اس کے مقابلہ میں جیل خانہ کی عقوبت! حضرت یوسفؑ کو پورا پورا اختیار حاصل تھا کہ ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند کر لیں۔ انہوں نے ایقان و ایمان کی پوری قوت سے بلا تامل کہہ دیا کہ

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ○ (۱۲/۳۳)

یوسف نے (یہ سُنکر) اللہ کے حضور دُعا کی "خدایا! مجھے قید میں رہنا اس بات سے

کہیں زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں بلا رہی ہیں۔ سو تو مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ
میں اس مرحلہ میں ثابت قدم رہوں۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوا اور میں ان کی طرف مائل ہو گیا
تو یہ بڑی حق ناشناسی ہوگی۔

عورتوں کی نگاہوں میں حضرت یوسفؑ کا حسنِ صورت ہی تھا لیکن دیکھنے والی آنکھوں کے لئے اُن کے حُسنِ سیرت کی جمال آفرینی حسنِ صورت سے کہیں بڑھ کر تھی۔

یہاں پھر دیکھئے، حضرت یوسفؑ نے یہی کہا ہے کہ "مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ" جس بات کی طرف مجھے یہ عورتیں بلا رہی ہیں اس سے قید خانہ کہیں اچھا ہے۔ اس سے بھی اس توجیہہ کی تائید ہوتی ہے جسے ہم مجلسِ ضیافت والے واقعہ میں درج کر چکے ہیں، یعنی اس مجلس کے تمام اہتمامات اس غرض کے لئے تھے کہ وہ عورتیں حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کر لیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے طرح طرح کے مکر و فریب سے کام لیا تھا۔ انہیں میں سے ایک ہاتھ کاٹنے کا تریا چلتر بھی تھا۔

اِدھر سے خدا کے اس مخلص بندے نے اپنے ربّ کو مدد کے لئے پکارا اور اُدھر سے اس کے ربّ نے اس کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۱۲/۳۴)

تو (دیکھو) اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کر لی اور اس سے عورتوں کی مکاریاں دفع
کر دیں۔ بلاشبہ وہی ہے (دعاؤں کا) سننے والا (اور سب کچھ) جاننے والا۔

بلا جُرم قیدوبند

جب عزیزِ مصر کی بیوی نے دیکھا کہ خالی دھمکی سے بھی کام نہیں چلا تو دھمکی کو سچ کر دکھانے کی سوجھی اور اپنی ہمراز عورتوں کے صلاح و مشورہ سے کچھ ایسی بات بنائی کہ عزیز اور اس کے متعلقین کو اسی میں مصلحت نظر آئی کہ حضرت یوسفؑ کو کچھ وقت کے لئے قید میں ڈال دیا جائے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ
حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (۱۲/۳۵)

پھر (ایسا ہوا کہ) اگرچہ وہ لوگ (یعنی عزیز اور اُس کے خاندان کے آدمی یوسف کی پاکدامنی کی)

نشانیاں دیکھ چکے تھے پھر بھی انہیں یہی بات مناسب معلوم ہوئی کہ ایک خاص وقت تک کے لئے یوسف کو قید میں ڈال دیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر، راستہ کے اس حصّہ پر ایک مرتبہ پھر نگہ باز گشت ڈال لیتے۔ عزیزِ مصر دیکھ چکا تھا کہ اس کی بیوی حضرت یوسفؑ کی طرف کس طرح مائل ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو وہ حضرت یوسفؑ کو محلّات سے الگ کر سکا (اس لئے کہ اس کی بیوی کبھی ایسا نہ ہونے دیتی) اور نہ ہی اپنی بیوی کو اس کے مذموم ارادوں سے روک سکا۔ یہ سب اس لئے کہ اس قسم کی غلط تہذیب میں عورت کے مقابلہ میں مرد بیچارے کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حالت اکیلے عزیز ہی کی نہ تھی۔ دیگر امراء دارکین بھی ایسے ہی تھے۔ اس لئے کہ ان کی عورتوں کی حالت بھی ہمارے سامنے آچکی ہے، یعنی اس سوسائٹی کی عام معاشرتی حالت ہی ایسی ہو چکی تھی۔ پھر دیکھئے کہ ایک ناکام محبت عورت اپنے جذبۂ انتقام میں کیا کچھ کر دیتی ہے؟ اور تیسرے یہ کہ مرد کس طرح عورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ عزیز اور اس کے گھرانے کے لوگ حضرت یوسفؑ کی راست بازی اور عصمتِ نفس کی نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ سب کچھ جانتے تھے کہ قصور کس کا ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجبور ہو گئے کہ امرأۃ العزیز نے جو دھمکی دی تھی اسے پورا کر دیا جائے۔

خدا فراموش سوسائٹی میں حق دانصاف کی اسی طرح مٹی پلید ہوا کرتی ہے۔

محلّات کے نظم ونسق کا کارفرما یوسفؑ اب قیدخانے کی مصیبتیں جھیل رہا ہے اور اس جُرم میں کہ اس نے جذبات کو مشتعل کر دینے والے اسباب و مواقع میں بلند اخلاقی قدر کی، جو خدا کی طرف سے متعیّن ہوئی تھی، پابندی کیوں کی! حضرت یوسفؑ کی پاک بازی، شرافتِ نفس، نیکوکاری کچھ چھپی ڈھکی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصّہ اسی جگہ گذارا تھا جہاں انہیں اب قید میں ڈالا گیا تھا۔ اس لئے اب قیدخانہ میں بھی ان کا احترام و تقدّس مسلّم تھا۔ قیدخانہ میں آپ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی تھے۔

قیدخانہ کے ساتھیوں کے خواب

ایک بادشاہ کے ساقیوں کا سردار اور دوسرا داروغۂ مطبخ۔ یہ کسی معاملہ میں زیرِ عتاب آگئے اور قیدخانہ میں ڈال دیئے گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک رات خواب دیکھے۔ اور چونکہ حضرت یوسفؑ کی فراست اور

بزرگی پہلے سے معروف تھی، وہ ان کے پاس گئے کہ اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کریں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (۱۲/۳۶)

اور (دیکھو) ایسا ہوا کہ یوسف کے ساتھ دو جوان آدمی اور بھی قید خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے (یوسف سے) کہا، مجھے (خواب میں) ایسا دکھائی دیا ہے کہ میں شراب (بنانے) کے لئے (انگور کا عرق) نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا " مجھے ایسا دکھائی دیا ہے کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اُسے کھا رہے ہیں۔" (اور دونوں نے درخواست کی کہ) " ہمیں بتلا دو، اس بات کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ تم بڑے نیک آدمی ہو۔"

تعبیر حضرت یوسفؑ کی نگاہوں کے سامنے تھی لیکن آپ نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ نوجوان اپنی ضرورت کی غرض سے آپ کی طرف خاص طور پر متوجہ تھے۔ آپ نے سوچا کہ دینِ حقیقی کے متعلق ایک اصولی بات اُن کے کان میں ڈال دی جائے۔ ممکن ہے وہ اسے بادشاہ کے کانوں تک پہنچا سکیں۔ اس غرض کے لئے حضرت یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتانے کو تھوڑا سا التوا میں ڈال دیا۔ قرآن کریم میں ہے۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ (۱۲/۳۸-۳۷)

یوسف نے کہا (گھبراؤ نہیں) قبل اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے، میں تمہارے خوابوں کا حال تمہیں بتلا دوں گا۔ اس بات کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جن کی فراست میرے خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ (لیکن پہلے یہ سُن لو کہ میں کون ہوں اور میرا مسلک کیا ہے)۔

میں نے ان لوگوں کی ملت ترک کی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی۔ (ہم اولادِ ابراہیم) ایسا نہیں کرسکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں۔ یہ (ملت) اللہ کا ایک فضل ہے جو اُس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ہیں جو (اس نعمت کا) شکر نہیں بجالاتے۔

وعظِ یوسفی | اپنے کیش و مشرب کا یوں تعارف کرانے کے بعد اب مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کی تشریح ارشاد فرمائی اور اس میں دینِ خداوندی کی اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کردیا جو اسلام کا اصل الاصول ہے۔ فرمایا:-

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰-۳۹)

اے یارانِ مجلس! (تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا آقاؤں کا ہونا بہتر ہے یا ایک اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے سوا جن ہستیوں کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرتے ہو، ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ حکومت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اُسی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور کسی کی نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

اسلام کیا ہے؟ وعظِ یوسفی کے ان مختصر سے جملوں کی عملی تفسیر۔ یوں کہیئے کہ سارا قرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہجہاں کو جب قلعۂ آگرہ میں قید کردیا گیا تو اس نے ایک نادرہ کار صناع سے کہا کہ اس کے کمرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا نگینہ اس انداز سے ٹکا دے کہ وہ کمرے کے اندر جہاں بھی ہو اُٹھتے بیٹھتے پورے کا پورا تاج اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ وعظِ یوسفی کے ان چھوٹے چھوٹے نگینوں کو دیکھئے۔ ایک ایک نگینہ میں "پورے کا پورا" تاج، کس طرح جھلمل جھلمل کرتا نظر آرہا ہے۔!

حکومت صرف خدا کی ہے

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (۱۲/۳۹) توحید کی پوری کائنات اس نگینہ کے اندر سمائی ہوئی ہے۔ انسان اسی کے سامنے جھکتا ہے جس میں (بزعم خویش) شانِ ربوبیت سمجھتا ہے جس کے متعلق اسے خیال ہوتا ہے کہ جب مجھے کچھ فائدہ پہنچا سکتا (یا نقصان دے سکتا) ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس خدا تراشی کے مسلک میں اُسے دنیا میں کس کس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور وہ کن کن چوکھٹوں کی ذلت آمیز خاک سے اپنی پیشانی کو داغدار بناتا ہے۔

گاہ او را با کلیسا سازباز گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز

دینِ او آئینِ او سوداگری است عنتری اندر لباسِ حیدری است (اقبالؒ)

مثل مشہور ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اُس "عملی مشرک" کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے اپنی ہر ضرورت کے لئے ایک نئے آقا کے سنگِ آستاں پر جبیں سائی کرنی پڑے۔ اور پھر ستم ظریفی یہ کہ ان میں سے کسی میں بھی وہ قوت نہ ہو جس کے احساس سے وہ اُن کے سامنے جھکتا ہے۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ سو جب کسی انسان میں ربوبیت کی قدرت نہیں تو ایک انسان کسی دوسرے انسان کی محکومیت کیوں اختیار کرے؟ حکومت صرف اس ذات کو زیبا ہے جس کے قانون کے مطابق نفع و نقصان کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے سُن رکھو کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (۱۲/۴۰) اس کا حکم ہے کہ اس کے قوانین کے سوا اور کسی قانون کی اطاعت نہ کرو۔ یہ ہے (دِيْنُ الْقَيِّمُ) محکم نظام جس کے تابع انسان کو چلنا چاہیئے۔

وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

تعبیر

اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے ان نوجوانوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتائی۔ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝ (۱۲/۴۱)

اے یارانِ مجلس! (اب اپنے اپنے خوابوں کا مطلب سُن لو) تم میں ایک آدمی (وہ ہے جس نے

دیکھا کہ انگور نچوڑ رہا ہے) تو وہ (قید سے چھوٹ جائے گا اور بدستور سابق) اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا آدمی (وہ ہے جس نے دیکھا کہ اس کے سر پر روٹی ہے اور پرندہ روٹی کھا رہے ہیں) تو وہ سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرند اس کا سر (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔ تمہارے خوابوں کی یہ تعبیر ہے۔ تعبیر کیا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ ایسا ہی ہوگا۔ میرا اندازہ یہی ہے۔

جس کے متعلق سمجھا تھا کہ وہ مصائب سے نجات پا جائے گا، حضرت یوسفؑ نے اس سے کہا کہ موقع پا کر بادشاہ سے ان امور کا تذکرہ کر دینا جو میں نے تم سے کہے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا اثر اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ قیدی بے گناہ ہے۔ ورنہ ایک مجرم قیدی کے پند و نصائح پر کون کان دھرتا ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا ہوگا کہ بادشاہ سے میری قید کی حقیقت بھی کہہ دینا۔ وہ دونوں نوجوان قید سے نکال لئے گئے اور حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر کے مطابق ہی ان کے ساتھ سلوک ہوا۔ لیکن وہ نوجوان جو اپنے منصب پر بحال ہو گیا تھا حضرت یوسفؑ کی بات بھول گیا اور یوں حضرت یوسفؑ ایک عرصہ مزید تک قید میں رہے۔

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ز فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ؏ (۱۲/۴۲)

اور یوسف نے جس آدمی کے متعلق اندازہ لگایا تھا کہ نجات پائے گا، اس نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس جب جاؤ تو مجھے یاد رکھنا (یعنی میرا حال اس سے ضرور کہہ دینا) لیکن (جب تعبیر کے بموجب اس نے نجات پائی تو) شیطان نے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے حضور پہنچ کر اسے یاد رکھتا۔ پس یوسف کئی برس تک قیدخانہ میں رہا۔

(ان خوابوں کی تعبیر کے متعلق آخر میں لکھا جائے گا)۔

بادشاہ کا خواب

وقت گزرتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک رات بادشاہ نے عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی تعبیر بتانے سے دربار کے اہلِ دانش عاجز رہ گئے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ

اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ کُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ○ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ○ (۱۲/۴۳-۴۴)

اور پھر ایسا ہوا کہ (ایک دن) بادشاہ نے (اپنے تمام درباریوں کو جمع کر کے) کہا کہ میں (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی۔ انہیں سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات دوسری سوکھی۔ اے اہلِ دربار! اگر تم خواب کا مطلب بتا سکتے ہو، تو بتلاؤ میرے خواب کی تعبیر کیا ہے۔

درباریوں نے (غور وخوض کے بعد) کہا: "یہ پریشان خواب وخیالات ہیں (کوئی ایسی بات نہیں جس کا کوئی خاص مطلب ہو) ہم پریشان خوابوں کا حل نہیں جانتے۔

اہلِ دربار میں جب اس کا چرچا ہوا تو ساقیوں کے سردار کو اپنا قید خانہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی بتلائی ہوئی تعبیر اور تعبیر کی صداقت یاد آگئی۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ○ (۱۲/۴۵)

اور جس آدمی نے (اُن) دو قیدیوں میں سے نجات پائی تھی، اسے مدت کے بعد (یوسف کی) بات یاد آئی، وہ (خواب کا معاملہ سُن کر) بول اُٹھا" میں اس خواب کا نتیجہ تمہیں بتلا دوں گا۔ تم مجھے (ذرا قیدخانے تک) جانے دو۔

چنانچہ وہ بھاگا بھاگا حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا۔

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ (۱۲/۴۶)

(چنانچہ وہ قید خانہ میں آیا اور کہا)" اے یوسف! اے کہ تو مجسم سچائی ہے! اس (خواب) کی ہمیں تعبیر بتا کہ سات موٹی تازی گایوں کو سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں سات سوکھی۔ تاکہ ان لوگوں کے پاس واپس جا سکوں (جنہوں نے مجھے بھیجا ہے)۔ کیا عجب ہے، وہ (تمہاری قدر ومنزلت) معلوم کر لیں۔

غور کیجئے۔ یہ وہی نوجوان ہے جسے حضرت یوسفؑ نے اس کی رہائی کا مژدہ سُنایا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ اس کا ذکر بادشاہ سے کرے۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ سے اس کا ذکر کرنا ہی بھول گیا بلکہ اظہارِ تشکر کے لئے بھی اس کے پاس نہ آیا اور اب، جب کہ ایک اور غرض لاحق ہوئی، تو حضرت یوسفؑ یاد آئے۔ کوئی عام انسان ہوتا تو سب سے پہلے اس نوجوان سے ان تمام باتوں کا گلہ کرتا اور معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس سے کہتا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر کیوں بتاؤں۔ بادشاہ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو مجھے یہاں سے نکالے میں خود جا کر بتاؤں گا۔ لیکن ایک عام انسان اور اللہ کے مخلص بندوں میں کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کا بھی فرق ہوتا ہے۔ آپ نے نہ اس سے کسی قسم کی شکایت کی اور نہ ہی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ تعبیر بھی بتادی اور اس تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی۔

تعبیر اور تدبیر

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝

(۱۲/۴۷—۴۹)

یوسف نے کہا ـــــــ (اس خواب کی تعبیر اور اس کی بناء پر تمہیں جو کچھ کرنا چاہیئے، وہ یہ ہے کہ) سات برس تک تم لگاتار کھیتی کرتے رہو گے (ان برسوں میں خوب بڑھتی ہوگی)۔ پس (جب فصل کاٹنے کا وقت آیا کرے تو) جو کچھ کاٹو، اسے اس کی بالوں ہی میں رہنے دو (تاکہ اناج گلے سڑے نہیں) اور صرف اتنی مقدار الگ کر لیا کرو جو تمہارے کھانے کے لئے (ضروری) ہو۔ پھر اس کے بعد سات بڑے سخت مصیبت کے برس آئیں گے جو وہ سب ذخیرہ کھا جائیں گے جو تم نے (اس طرح) پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا۔ مگر ہاں تھوڑا سا جو تم (بیج کے لئے) روک رکھو گے، بچ رہے گا۔ پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا کہ لوگوں پر خوب بارش بھیجی جائے گی۔ لوگ اس میں (پھلوں اور دانوں سے) عرق نچوڑیں گے۔

جب بادشاہ نے اس تعبیر اور اس کے ساتھ حُسنِ تدبیر کو سُنا تو اس پر حضرت یوسفؑ کی دانش و بینش اور فراست و تدبر کے جوہر آشکارا ہو گئے۔ اور اس نے فوراً حکم دیا کہ اس شخص کو قید خانہ سے رہا کر کے دربار

میں لایا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کا قاصد، رہائی کا حکم لے کر حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا۔
اس مقام پر سیرتِ یوسفی کا جمال اپنی انتہائی رعنائیوں پر نظر آتا ہے۔ جب تک قرآنِ کریم نہ بتائے آپ تصور میں بھی نہیں لا سکتے کہ انہوں نے قاصد کو کیا جواب دیا ہوگا! اس لئے کہ اس کے بعد جواب کیسا؛

سیرتِ یوسفی کی ایک اور جھلک

یہی نظر آتا ہے کہ آپ نے قید و بند کے مصائب سے نجات ملنے کو غنیمت سمجھا ہوگا اور فوراً اس کے ساتھ دربار میں تشریف لے گئے ہوں گے۔ ہر شخص ایسے موقع پر یہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کی خودی میں اتنی بیداری اور جس کے کیریکٹر میں اتنی بلندی پیدا ہو چکی ہو جو اللہ کے منتخب بندوں کا حصہ ہوتی ہے، وہ یہ نہیں کرے گا اس سے الگ کچھ اور کرے گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ بادشاہ کی توجہ فرمائی کا شکریہ، لیکن میں اس کے رحم و کرم کے صدقے قید خانہ سے نکلنا نہیں چاہتا۔ اس سے جا کر کہو کہ پہلے میرے مقدمہ کی تحقیق کرے اور جب اسے یقین ہو جائے کہ میں بے گناہ ہوں تو پھر میری رہائی کا حکم بھیجے۔ میرا مقصد قید و بند کے مصائب سے خلاصی حاصل کرنا نہیں، اپنی بریت ثابت کرنا ہے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْــَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ (۱۲/۵۰)

(جب اُس آدمی نے یہ بات بادشاہ تک پہنچائی تو) بادشاہ نے کہا "یوسف کو (فوراً) میرے پاس لاؤ"۔ لیکن جب (بادشاہ کا) پیامبر یوسف کے پاس پہنچا، تو اس نے کہا "(میں یوں نہیں جاؤں گا) تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور (میری طرف سے) دریافت کرو کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (میں چاہتا ہوں پہلے اس کا فیصلہ ہو جائے) جیسی کچھ مکاریاں انہوں نے کی تھیں میرا پروردگار اسے خوب جانتا ہے"۔

تورات کا بیان

اللہ اکبر! کتنی بلند سیرت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن تورات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہاں یہی مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے لباس تبدیل کیا اور فوراً دربار میں چلے گئے۔

تب فرعون نے یوسف کو بلوایا۔ وہ جلد اسے قید خانہ سے لے آئے اور اس نے سر منڈایا اور کپڑے

بدل کے فرعون کے حضور آیا۔ (پیدائش ۴۱/۱۴)

یہاں پہنچ کر ہمیں اپنے ہاں کی بھی ایک بات یاد آ گئی۔ تورات کے متعلق تو ہمارا یقین ہے کہ وہ محرّف ہے،

ہمارے ہاں کی ایک روایت

لیکن مقامِ تأسف ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جنہیں "اصح الکتب" کہا جاتا ہے، اس سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جیسے بادشاہ کا قاصد آیا تھا اگر میں حضرت یوسفؑ کی جگہ ہوتا تو فوراً اس کے ساتھ چلا جاتا۔

لو لبثت فی السجن ما لبث یوسف لاجبت الداعی۔

اگر قید خانہ میں میں اتنے عرصہ تک رہا ہوتا جتنے یوسف رہے تو میں قاصد کے ساتھ ہو لیتا۔

صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایتیں معاندینِ اسلام (یہود و نصاریٰ) کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہیں جو انبیائے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حضورؐ کی سیرتِ اقدس کو گھٹا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن گلہ ان پر نہیں، انہوں پر ہے کہ یہ اس قسم کی روایتوں کو سینہ سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور اگر حضورؐ کی عظمت و تقدس کا خیال کسی کو اس امر پر مجبور کر دے کہ وہ ان روایات کو حضور کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہ کرے تو اس کی تکفیر و تفسیق کے فتاویٰ صادر کر دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ یہ روایتیں بخاری اور مسلم کی کتابوں میں درج ہیں یعنی حضورؐ کی شانِ اقدس میں (معاذ اللہ) طعن پایا جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن بخاری اور مسلم میں غلط روایات کے امکان کا خیال نہ پیدا ہونے پائے۔ لیکن حقیقت بیں نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ غلطی سے مبرّا اس آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰/۳۰)

معاملہ کی تحقیق

فرعون حضرت یوسفؑ کی دانش و بینش کا تو پہلے ہی معترف ہو چکا تھا۔ جب آپ کا یہ جواب سُنا تو آپ کی بلندیٔ سیرت کا احترام بھی اس کے دل میں اُتر گیا۔ اس نے فوراً تحقیقات کا حکم دیدیا اور ان عورتوں سے دریافت کیا کہ بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے؟

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ط قُلْنَ حَاشَ

لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ (۱۲/۵۱)

(اس پر) بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلایا اور) کہا "صاف صاف بتاؤ کہ تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا، جب تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اسے اپنی طرف مائل کرلو" وہ بولیں "حاشا للہ! ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی"۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، یہاں ظاہر ہے کہ ان عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور مجلسِ ضیافت کی تمام حیلہ جوئیاں اور فریب اندازیاں اسی غرض کے لئے تھیں۔ اور اس کے بعد حضرت یوسفؑ کو قید خانہ میں بھجوانا بھی اُنہی کے دامِ تزویر کی ایک کڑی تھی جو امرأۃ العزیز کے ایماء پر تیار کی گئی تھی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے امرأۃ العزیز کا نام نہیں لیا، صرف ان عورتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس لئے کہ قمیص پھٹنے والے واقعہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عزیز نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا کہ اس معاملہ کو رفت گذشت سمجھو۔ حضرت یوسفؑ کو ابھی تک اس بات کا خیال تھا اس لئے اپنے مربی کی بات کا پاس کیا اور اس کی بیوی کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب عورتوں کے معاملہ کی تحقیق ہوئی تو سب کچھ بے نقاب ہوگیا۔ اس دوران میں عزیزِ مصر کی بیوی کے جذبات کی آندھیاں بھی اُتر چکی تھیں اور وہ حضرت یوسفؑ کی بلندیٔ سیرت کی قائل ہوچکی تھی۔ لاکھ جذباتِ انتقام

حقیقت بے نقاب

ہوں، سیرت کی بلندی اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب دوسری عورتوں نے حضرت یوسفؑ کی پاکیزگیٔ داماں کی قسم اُٹھائی تو اس سے بھی نہ رہا گیا اور اس نے برملا کہہ دیا کہ یہ معاملہ تو ایک طرف، خود میرے معاملہ میں بھی یوسفؑ کا کوئی قصور نہ تھا۔

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ز .... (۱۲/۵۱)

(یہ سن کر) عزیز کی بیوی بھی (بے اختیار) بول اُٹھی! "جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہوگئی۔ ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے۔ بلاشبہ وہ اپنے بیان میں بالکل سچا ہے"۔

اس پر حضرت یوسفؑ نے کہا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ

كَيْدَ الْخَائِنِيْنَ ○ (۱۲/۵۲)

میں نے اپنے مقدمہ کی تحقیق اسی لئے کرائی تھی کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملے میں خیانت نہیں کی نیز اس لئے کہ (واضح ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔

پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۱۲/۵۳)

میں اپنے آپ کی پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اسے برائی کے لئے آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی بچ سکتا ہے جس پر میرا پروردگار رحم کرے۔ بلاشبہ میرا پروردگار بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

کون تھا جس کے دل میں سیرتِ یوسفی کی اس درخشندگی سے احترام و عظمت کے جذبات بیدار نہ ہو جاتے۔ دانش و بینش، تدبر و فراست کے ساتھ ساتھ سیرت کی اتنی بلندی اور کیرکٹر کی اتنی پختگی، بادشاہ کی نگہ جوہر شناس نے فوراً اس کندن کو پہچان لیا۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ○ (۱۲/۵۴)

اور (پھر) بادشاہ نے حکم دیا "یوسف کو میرے پاس لاؤ کہ اسے خاص اپنے (کاموں کے) لئے مقرر کردوں۔" پھر جب (وہ آیا) بادشاہ نے اس سے گفتگو کی (تو یوسف کے جوہر اس پر در کھلے) تب اسے کہنا پڑا کہ "آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا ہی صاحبِ قدر و منزلت اور امانتدار انسان ہے!"

اللہ اکبر! کنعان کا چرواہا، بازارِ مصر میں نیلام شدہ غلام، برسوں کا قیدی اور بادشاہ کی طرف سے ان الفاظ کا مخاطب کہ

اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ

حضرت یوسفؑ نے سلطنت کے نظم و نسق کے مختلف شعبوں پر نگاہ ڈالی اور فیصلہ کر لیا کہ کس شعبہ

منصب بلند پر سرفرازی کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے باقی تمام انتظامات اپنی اپنی جگہ درست چلیں گے۔

قَالَ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝ (۱۲/۵۵)

یوسف نے کہا کہ "زمین کے خزانوں پر مجھے مختار کر دیجئے۔ میں حفاظت کر سکتا ہوں اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔" (چنانچہ بادشاہ نے زمین کی پیداوار کا نظم ونسق ان کے سپرد کر دیا)۔

غور کیجئے! جب حضرت یوسفؑ عزیز کے محلات میں پہنچے ہیں اور وہاں کا نظم ونسق ان کے اعتماد میں سونپ دیا گیا ہے، اللہ نے کہا تھا،

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۲۱)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کا سرزمین مصر میں قدم جما دیا اور مقصود یہ تھا کہ ہم اسے طرح طرح کی باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا سکھا دیں۔ اور اللہ کو جو معاملہ کرنا ہوتا ہے وہ کر کے رہتا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے!

یعنی اس تمکن سے غرض یہ تھی کہ معاملات فہمی اور حسنِ تدبیر کے مختلف گوشوں کی تعلیم دی جائے۔ اس عملی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ آج حضرت یوسفؑ اتنے بڑے انتظام کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر فرمایا:-

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۱۲/۵۶)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جما دیئے کہ جس جگہ چاہے اختیار رکھے۔ ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

تمکن فی الارض اور ایسا تمکن کہ آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو۔ جہاں چاہیں اپنا حکم چلائیں۔

تمکّن فی الارض دنیا میں حسنِ عمل اور تطہیرِ فکر و نظر کی اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے. باقی رہی اس دنیا سے اگلی منزل' سو وہاں کے مناصب و مدارج کے کیا کہنے!

وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۲/۵۷﴾

اور جو لوگ (اللہ پر) ایمان لائے اور (بدعملیوں سے) بچتے رہے' ان کے لئے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی اسکیم کے مطابق فاضلہ اناج کا ذخیرہ کر لیا. اس کے بعد قحط سالی شروع ہوئی تو مصر کے اردگرد کے علاقوں کے لوگ بھی غلہ لینے کے لئے اسی چشمۂ فیض کی طرف آنے شروع ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا قبیلہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہوا تو برادرانِ یوسفؑ بھی غلہ خریدنے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن چونکہ یہ بات اُن کے بھائیوں کے حیطۂ تصور میں بھی نہ آسکتی تھی کہ یوسف اس مقامِ بلند پر فائز ہوگا' اس لئے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا.

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ (۱۲/۵۸)

اور (پھر قحط کے سالوں میں) ایسا ہوا کہ یوسف کے بھائی (کنعان سے غلہ خریدنے مصر) آئے. یوسف نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے نہیں پہچانا.

بھائی غلہ لینے کے لئے آتے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اُن سے "ان کے گھر" کے تمام حالات کرید کرید کر پوچھے ہوں گے اور اس طرح باتوں باتوں میں یہ بھی ان سے کہلوا لیا ہوگا کہ ان کا ایک سوتیلا بھائی اور بھی ہے جو باپ کے پاس ہے۔ چنانچہ وہ واپس جانے لگے تو آپ نے اُن سے کہا کہ اب کے لوٹ کر آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو بھی ساتھ لانا.

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ

وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ٥ (۵۹ ـ ۱۲/۶۰)

اور جب یوسف نے ان کا سامان مہیا کر دیا، تو (جاتے وقت) کہا "اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو بھی ساتھ لانا۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں پوری تول (غلہ) دیتا ہوں۔ اور (باہر سے آنے والوں کے لئے) بہتر مہمان نواز ہوں۔ لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے، تو پھر یاد رکھو، نہ تو تمہارے لئے میرے پاس ماپ تول کا غلہ ہوگا، نہ تم میرے نزدیک جگہ پاؤ گے۔

انہوں نے کہا:

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ٥ (۱۲/۶۱)

انہوں نے کہا "ہم اس کے باپ کو اس بات کی ترغیب دیں گے اور ہم ضرور ایسا کریں گے۔"

حضرت یوسفؑ نے ان کے دوبارہ آنے کو اور پختہ کرنے کے لئے ان کی پونجی بھی ان کی بوریوں میں رکھوا دی۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَا اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ٥ (۱۲/۶۲)

اور یوسف نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا "ان لوگوں کی پونجی (جس کے بدلے انہوں نے غلہ مول لیا ہے) انہی کی بوریوں میں رکھ دو جب یہ لوگ اپنے گھر کی طرف لوٹیں گے تو بہت ممکن ہے اپنی پونجی دیکھ کر پہچان لیں (کہ لوٹا دی گئی) اور پھر عجب نہیں کہ دوبارہ آئیں۔"

انہوں نے واپس جا کر حضرت یعقوبؑ سے "امیر مصر" (یعنی حضرت یوسفؑ) کی شرط بیان کی۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ (۱۲/۶۳)

پھر جب یہ لوگ اپنے باپ کے پاس لوٹ کر گئے، تو کہا "اے ہمارے باپ! آئندہ کو غلہ کی فروخت ہم پر بند کر دی گئی ہے۔ پس ہمارے بھائی (بن یامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دے کہ غلہ خرید لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔"

اس پر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا :

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ (۱۲/۶۴)

باپ نے (یہ سُنکر) کہا " کیا میں اس کے لئے اسی طرح تمہارا اعتبار کروں جس طرح پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں کر چکا ہوں ؟ سو خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں !"

اس کے بعد جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں اپنی پونجی موجود پائی۔ اس پر حضرت یوسفؑ کی توقع کے مطابق انہوں نے باپ سے مزید اصرار شروع کر دیا۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْؕ.... ..... ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ○ (۱۲/۶۵)

اور جب ان لوگوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ اُن کی پونجی انہی کو لوٹا دی گئی ہے۔ تب انہوں نے (اپنے باپ سے) کہا " اے ہمارے باپ! اس سے زیادہ اور ہمیں کیا چاہیئے ؟ دیکھ یہ ہماری پونجی ہے جو ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ (ہمیں اس نے غلّہ بھی دے دیا اور قیمت بھی واپس کر دی۔ بس ہمیں اجازت دے کہ بن یمین کو ساتھ لے کر پھر جائیں) اور اپنے گھرانے کے لئے رسد لے آئیں۔ ہم اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لے لیں گے۔ یہ غلّہ (جو اس مرتبہ لائے ہیں) بہت تھوڑا ہے۔

دوسری مرتبہ

بالآخر حضرت یعقوبؑ نے اُن سے اللہ کے نام پر عہد لیا کہ وہ بن یمین کو بخیریت واپس لے آئیں گے اور اس کے بعد اسے جانے کی اجازت دیدی۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ○ (۱۲/۶۶)

باپ نے کہا" میں اسے کبھی تمہارے ساتھ بھیجنے والا نہیں جب تک کہ اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو (تم عہد کرو کہ) بجز اس صورت کے کہ ہم خود گھیر لئے جائیں (اور بے بس ہو جائیں)

ہم ضرور اسے تیرے پاس لے آئیں گے۔" جب انہوں نے اپنے باپ کو (اس کے کہنے کے مطابق) اپنا پکا قول دے دیا، تو اس نے کہا، "ہم نے جو قول و قرار کیا اس پر اللہ نگہبان ہو۔"

تورات میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی پہلی مرتبہ مصر گئے ہیں تو ان پر جاسوسی کا شُبہ گزرا تھا حضرت یعقوبؑ کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ مبادا اُن پر کچھ ایسا ہی شُبہ گزر جائے اور یوں یہ بھی گھر جائیں اور ان کے ساتھ بن یامین بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے احتیاطاً ان سے کہا کہ مصر میں داخل ہونا تو ایک جتھے کی صورت میں نہ جانا، الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔ قرآنِ کریم میں ہے:

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ .... وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۠ (۶۷ — ۱۲/۶۸)

اور باپ نے انہیں (چلتے وقت) کہا" اے میرے بیٹو! دیکھو جب مصر پہنچو تو شہر کے ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا، جُدا جُدا دروازوں سے داخل ہونا۔ میں نے یہ بات یونہی بربنائے احتیاط کردی ہے ورنہ وہاں موقع پر جو کچھ پیش آئے اس کے لئے تم نے قوانینِ خداوندی کے مطابق خود فیصلہ کرنا کہ کیا کرنا چاہیئے، اس لئے کہ ہر معاملہ خدا کے قانون کے مطابق طے ہوتا ہے اور میں بھی اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہی ہے جس پر تمام بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے!"

پھر جب یہ لوگ (مصر میں) داخل ہوئے اسی طرح جس طرح باپ نے حکم دیا تھا تو دیکھو یہ بات اللہ کے قانون کے مقابلے میں کچھ کام آنے والی نہ تھی، مگر ہاں، یعقوب کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا تھا جسے اس نے پورا کردیا۔ بلاشبہ وہ صاحبِ علم تھا کہ ہم نے اس پر علم کی راہ کھول دی تھی۔ لیکن اکثر آدمی (اس بات کی حقیقت) نہیں جانتے!

جب یہ قافلہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا تو آپ نے اپنے بھائی (بن یامین) کو اشارے سے بتایا کہ میں تیرا بھائی ہوں، غمگین نہ ہو۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۲/۶۹)

اور جب ایسا ہوا کہ یہ لوگ حضرت یوسف کے پاس پہنچے، تو اس نے اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اُسے (پوشیدگی میں) اشارہ کر دیا کہ "میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تلقین کر دی کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے چلے آئے ہیں اس پر کبیدۂ خاطر نہ ہونا (اب دن پلٹ جائیں گے)۔

حضرت یوسفؑ ہزار دل سے چاہتے ہوں گے کہ بن یامین اُن کے پاس رہ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا تا وقتیکہ اسے یا تو یونہی روک لیتے یا بھائیوں پر اس راز کا انکشاف کر دیتے کہ وہ کون ہیں؟ اوّل الذکر مرفوع القلم تھا، اس لئے کہ قانون کی رُو سے ایسا ہو نہیں سکتا تھا اور استبداد آپ کی ذات سے ناممکن تھا۔ دوسری طرف بھائیوں پر راز کا انکشاف ابھی قبل از وقت تھا۔ اس لئے آپ نے مجبوراً ان کے ساتھ بھائی کو بھی الوداع کہہ دیا۔ حضرت یوسفؑ نے ان کی واپسی کا سامان مہیا کیا۔ جب یہ سامانِ سفر تیار ہو رہا تھا تو ان بھائیوں میں سے ایک نے چپکے سے حضرت یوسفؑ کا شاہی کٹورہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا۔ نیت یہ ہوگی کہ اگر کسی کی نگاہ نہ پڑی تو کٹورہ گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بن یامین بدنام ہوگا اور باپ کی نظروں سے گر جائے گا۔

کٹورہ کی گمشدگی

اس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔ جب محلات کے کارندوں نے مختلف چیزوں کا جائزہ لیا تو شاہی کٹورہ کو وہاں نہ پایا۔ چونکہ یہ کنعانی قافلہ وہاں ٹھہرا تھا اس لئے ان کا لامحالہ انہیں پر شبہ گزرا۔ وہ اُن کے پیچھے گئے اور انہیں آواز دے کر ٹھہرا لیا اور پوچھا کہ کیا تم پیالہ لے آئے ہو؟

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۝ (۷۰-۷۲/۱۲)

پھر جب یوسف نے ان لوگوں کا سامان ان کی روانگی کے لئے تیار کرا دیا، تو اس کے بھائیوں میں سے ایک نے شاہی کٹورہ یوسف کے بھائی کی بوری میں رکھ دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ (جب یہ لوگ روانہ ہو گئے اور شاہی کارندوں نے پیالہ ڈھونڈا اور نہ پایا، تو ان پر شبہ ہوا اور) ایک پکارنے

والے نے (اُن کے پیچھے) پکارا "اے قافلہ والو! (ٹھہرو) ہو نہ ہو تم ہی چور ہو۔" وہ پکارنے والے کی طرف پھرے اور پوچھا "تمہاری کونسی چیز کھوگئی ہے؟" (شاہی کارندوں نے) کہا "ہمیں شاہی پیمانہ نہیں ملتا۔ جو شخص اسے لادے اس کے لئے ایک بارِ شتر (غلہ) انعام ہے" اور (کارندوں کے سردار نے کہا) میں اس بات کا ضامن ہوں"۔

ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں سے ایک نے یہ کٹورہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تھا تو اس کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر جب حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو بتایا ہے کہ وہی یوسف ہیں تو اُن سے کہا کہ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ اَخِيْهِ (۱۲/۸۹) تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ بن یامین کے ساتھ انہوں نے خاص طور پر کیا کیا تھا اس کا کوئی ذکر اس قصے میں نہیں بجز اس مقام کے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بن یامین کی بوری میں یہ کٹورہ انہی بھائیوں میں سے کسی نے رکھا تھا اور یہی وہ شرارت تھی جس کی طرف حضرت یوسفؑ نے بعد میں اشارہ کیا تھا۔

بہر حال شاہی کارندوں نے ان سے پوچھ گچھ شروع کی اور انہوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ ہم چور نہیں ہیں۔ ہم تو ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ ہم نے کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں کی تھی۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ○ (۱۲/۷۳)

انہوں نے کہا، "اللہ جانتا ہے، ہم اس لئے یہاں نہیں آئے کہ ملک میں شرارت کریں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو (کہ ہم پہلے بھی ایک مرتبہ آچکے ہیں) اور ہمارا کبھی یہ شیوہ نہیں رہا کہ چوری کریں"۔

شاہی کارندوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ یونہی سہی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تلاشی لینے پر پیالہ تمہارے پاس سے نکل آیا تو اس کی کیا سزا؟

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ○ (۱۲/۷۴)

(کارندوں نے کہا) "اچھا' اگر تم جھوٹے نکلے تو بتلاؤ چور کی سزا کیا ہونی چاہیئے؟"

انہوں نے جواب دیا کہ سزا صاف ہے۔ جو چور ہو وہ اپنے جرم کی پاداش میں اپنی سزا آپ بن جاتے

یعنی اسے روک لیا جائے اور سزا دی جائے۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ○ (۱۲/۷۵)

انہوں نے کہا "چور کی سزا یہ کہ جس کی بوری میں چوری کا مال نکلے، وہ آپ اپنی سزا (یعنی اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے)۔ ہم زیادتی کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔"

بن یامین کی بوری میں

چنانچہ کارندوں کے سردار نے (جس نے پہلے کہا تھا کہ جو پیالہ لے آئے اسے انعام دیا جائے گا اور اس کا میں ضامن ہوں) تلاشی لینی شروع کر دی اور پیالہ بن یامین کی بوری سے برآمد کر لیا۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِیَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِیْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِیْهِ ؕ (۱۲/۷۶)

پس (کارندوں کے سردار نے) ان کی بوریوں کی تلاشی لینی شروع کی (اور کچھ نہ پایا)۔ پھر یوسف کے بھائی کی بوری (دیکھی اور اس میں) سے پیالہ نکال لیا۔

یہاں تک دیکھئے کہ ہوا کیا ہے؟ حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس رکھ لیں لیکن (ان وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ برادرانِ یوسفؑ میں سے ایک نے بن یامین کی بوری میں کٹورہ رکھ دیا۔ اس لئے نہیں کہ بن یامین یہیں رہ جائے بلکہ کٹورہ حاصل کرنے یا بن یامین کو بدنام کرنے کی غرض سے۔ جب کٹورہ کی تلاشی ہوئی تو برادرانِ یوسفؑ نے خود ہی کہہ دیا کہ جس کے پاس سے چوری کا کٹورہ نکلے گا وہ ماخوذ ہو جائے گا اور اپنی سزا بھگتنے کے لئے یہاں رہ جائے گا۔ کٹورہ بن یامین کی بوری سے نکلا اور اس طرح اس کے یہاں رکنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس توجیہہ کی سند، قرآنِ کریم کا ایک لطیف اشارہ ہے۔ آیت ۷۶ کا پہلا حصہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس کے آگے ہے۔

از خود تدبیر

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ (۱۲/۷۶)

تو (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کے لئے (بن یامین کو پاس رکھنے کی) ایک مخفی (اور لطیف) تدبیر پیدا کر دی۔

اس لئے کہ

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ[1] الْمَلِكِ (۱۲/۷۶)

وہ بادشاہ (مصر) کے قانون کی رُو سے ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے بھائی کو روک لے۔

اس کے لئے یہی صورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کوئی راہ نکال دیتی۔

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (۱۲/۷۶)

مگر ہاں اسی صورت میں کہ اللہ کو (اس کی راہ نکال دینا) منظور ہوتا۔ (سو اس نے غیبی سامان کر کے راہ نکال دی)۔

اور راہ بھی ایسی کہ حضرت یوسفؑ کو اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے نہ قانون شکنی کرنی پڑے نہ دست درازی اور اس طرح ان کی عظمتِ منصب بھی قائم رہے۔ بلکہ اظہارِ واقعہ کے بعد یہ عظمت لوگوں کی نگاہوں میں اور بھی بڑھ جاتے۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ (۱۲/۷۶)

ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلند کر دیتے ہیں۔

یہ اس طرح رکاوٹوں کے حل علم کی بنا پر ملتے ہیں۔ اور خدا جس کا علم سب سے زیادہ ہے، سب سے بہتر حل دے سکتا ہے۔

وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲/۷۶﴾

اور ہر علم والے کے اوپر ایک علیم (یعنی اللہ کی) ہستی ہے (جس کا) علم سب کو احاطہ کئے ہوتے ہے۔

اب معاملہ حضرت یوسفؑ کے سامنے آچکا تھا۔ وہ اس سے پیشتر بن یامین کو اپنے متعلق بتا چکے تھے اس لئے بن یامین کے لئے نہ تو اس الزام سے گھبرانے کی کوئی تھی اور نہ معاملہ کے حضرت یوسفؑ کے سامنے

---

[1] دین کے معانی پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ دین الاسلام کے معنی ضابطۂ قوانین الٰہیہ کے ہیں جس کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت ہے یا محض پوجا پاٹ کے مذہب کے؟

پیش ہونے سے کوئی تشویش۔ حضرت یوسفؑ نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ مشیت کی تدبیر کے ماتحت ہوا ہے اور اس لئے ہوا ہے کہ بن یامین یہاں رک جائے۔ اس لئے وہ خاموش رہے۔ لیکن ان برادرانِ یوسفؑ کو بن یامین سے پہلے ہی دشمنی تھی (اس لئے کہ وہ یوسفؑ کے بعد باپ کا چہیتا بیٹا تھا) اس لئے جوشِ حسد و عداوت میں بے اختیار پکار اٹھے کہ اس نے اگر چوری کی ہے تو کچھ عجب نہیں۔ یہ بات تو ان کے ہاں پہلے ہی سے چلی آ رہی ہے۔ اس کا ایک بھائی تھا وہ بھی ایسا ہی تھا۔ اندازہ فرمائیے کہ حضرت یوسفؑ نے کس

برادرانِ یوسفؑ کی تنگ ظرفی

دل سے اس الزام کو سنا ہوگا۔ لیکن ابھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہ کیا جائے۔ اس لئے کہا تو صرف اتنا کہ اپنے بھائی کو چور بنا کر تم اپنے متعلق بھی کچھ اچھا ظن پیدا نہیں کر رہے۔ تم بھی تو اسی خانوادہ کے نونہال ہو! قرآنِ کریم میں ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ○ (۱۲/۷۷)

(جب بن یامین کی بوری سے کٹورہ نکل آیا، تو) بھائیوں نے کہا، "اگر اس نے چوری کی تو یہ کوئی عجب بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا (حقیقی) بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔" تب یوسفؑ نے (جس کے سامنے اب معاملہ پیش ہوا تھا) یہ بات اپنے دل میں رکھ لی، ان پر ظاہر نہ کی (کہ یہ میرے منہ پر مجھے چور بنا رہے ہو) اور (صرف اتنا) کہا کہ "سب سے بُری جگہ تمہاری ہوئی (کہ اپنے بھائی پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اللہ اسے بہتر جاننے والا ہے۔"

جب جذباتِ بغض و عناد یوں ٹھنڈے ہوئے تو اب منت و سماجت پر اتر آئے۔ کہنے لگے۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا

---

[1] اس کے برعکس تورات (کتابِ پیدائش، باب ۴۴ آیت ۲) میں دیکھئے تو وہاں یہ مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے خود ہی وہ پیالہ بن یامین کی بوری میں رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہو چکا تو خود ہی اپنے کارندوں کو تعاقب میں بھیج دیا کہ ان کی تلاشی لیں اور چور کو پکڑ کر لے آئیں۔ غور کیجئے۔ قرآنِ کریم اور محرّف کتبِ آسمانی میں کس قدر فرق ہے؟

مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ٥ (۱۲/۷۸)

انہوں نے کہا، "اے عزیز! اس باپ بہت بوڑھا آدمی ہے (اور اس سے بہت محبت رکھتا ہے) بس اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے (مگر اسے نہ روکئے)، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں۔"

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چور اپنی سزا آپ بھگتے۔ اب ہم اس جگہ کسی دوسرے کو کیسے روک لیں۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ٥ (۱۲/۷۹)

یوسف نے کہا، "اس بات سے اللہ کی پناہ کہ ہم اس آدمی کو چھوڑ کر جس کے پاس ہمارا سامان نکلا کسی دوسرے کو پکڑ لیں۔ اگر ایسا کریں تو ہم ظالم ٹھہریں۔"

اس بات کو پھر نہ بھولئے کہ بن یامین کو علم تھا کہ روکنے والا یوسفؑ ہے۔ اس لئے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنی کوششوں میں مایوس ہو گئے، تو الگ ہو کر باہمی مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۗ قَالَ كَبِيْرُهُمْ ....

...... وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ٥ (۸۰ — ۱۲/۸۲)

پھر جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے (کہ یہ ماننے والا نہیں) تو مشورہ کے لئے (ایک جگہ اکیلے میں بیٹھ گئے۔ جو ان میں بڑا تھا، اس نے کہا "تم جانتے ہو کہ باپ نے (بن یامین کے بارے میں) اللہ کو شاہد ٹھہرا کر تم سے عہد لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں بڑی تقصیر ہو چکی ہے۔ پس میں تو اب اس ملک سے ٹلنے والا نہیں جب تک کہ باپ از خود مجھے حکم نہ دے یا پھر اللہ میرے لئے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!"

"تم لوگ باپ کی طرف لوٹ جاؤ اور اس سے جا کر کہو" اے ہمارے باپ! (ہم کیا کریں) تیرے (چہیتے) بیٹے نے (پرائے ملک میں) چوری کی۔ اور ہم تو انہی معاملات میں اس کی نگرانی اور حفاظت کر سکتے تھے جن کا ہمیں علم ہوتا۔ (وہ اگر ہم سے خفیہ چوری کرنے پر اتر آئے تو ہم اسکی

کس طرح نگرانی اور پاسبانی کر سکتے !"

اور (یہ بھی کہہ سنا کہ) آپ اُس بستی سے دریافت کرلیں جہاں ہم ٹھہرے تھے اور اس قافلہ کے آدمیوں سے پوچھ لیں جس میں ہم آئے ہیں. ہم (اپنے بیان میں بالکل) سچے ہیں"

آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا اس نشتر کو دیکھتے جائیے جو اس طعن آمیز فقرہ میں چھپا ہوا ہے کہ یَاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ "اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے" دل میں بغض و عناد کے جذبات نہ ہوتے تو سیدھی طرح کہتے کہ ہمارے بھائی نے چوری کی ہے یا بن یامین نے چوری کی ہے. لیکن باپ کو جتا کر کہنا کہ

قساوتِ قلبی کی ایک جھلک

"یہ ہے آپ کے اس بیٹے کے کرتوت، جسے آپ یوں سینے سے لگائے رہتے تھے"، کس قدر کلیجے کو چھلنی کر دینے والا گھاؤ ہے! اور پھر شقاوتِ قلب دیکھئے. یہ نشتر کس وقت رگِ جان میں پیوست کئے جانے کی تجویز ہو رہی ہے؟ جب کہ ضعیف باپ پہلے ہی ایک بیٹے کے غم میں نیم سوختہ ہو رہا تھا اور اس کے بعد اب دوسرے بیٹے کے متعلق یہ خبر سنائی جانے والی تھی کہ وہ بھی تم سے جدا ہو گیا. یہ وقت تھا کہ اس خبر کو انتہائی ہمدردی کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا. لیکن قرآنِ کریم نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دُنی الطبع لوگوں کی قساوتِ قلبی ایسے مواقع پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے.

چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان میں آکر باپ سے اسی طرح بات کہہ دی. لیکن اس پر حضرت یعقوبؑ نے پھر وہی فقرہ دہرایا جو بھیڑیئے والا افسانہ سُنکر بیٹوں سے کہا تھا.

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ (۱۲/۸۳)

(چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان آکر یہ ساری باتیں باپ سے کہہ دیں) اُس نے (سُنکر) کہا "نہیں، یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے جی نے تمہیں سجھا دی ہے. (یعنی بن یامین کا چوری کرنا) خیر! میرے لئے صبر کے سوا چارہ نہیں، ایسا صبر کہ خوبی کا صبر ہو. اللہ (کے فضل) سے کچھ بعید نہیں کہ وہ (ایک دن) ان سب کو میرے پاس جمع کر دے. وہی ہے جو (سب کچھ) جاننے والا (اور اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے.

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا پر غور کیجئے. حضرت یعقوبؑ نے اس بات کو بھی صحیح

تسلیم نہیں کیا تھا کہ حضرت یوسفؑ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ اب جو بن یامین کے متعلق یہ سب کچھ سنا تو ان تمام واقعات پر غائر نگاہ ڈالنے سے آپ کی فراست نے بھانپ لیا کہ یہ کڑیاں کچھ غیر معمولی سی ہیں۔ اس سے آپ کی نگاہِ دوررس نے بن یامین کی گم گشتگی میں سب کے دوبارہ اکٹھے ہو جانے کی جھلک دیکھ لی (یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا بیٹا جو باقیوں کے ساتھ نہیں آیا تھا)۔ بن یامین کی جدائی نے پچھلے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا اور یوسفؑ کی یاد اور بھی ستانے لگی۔ ہرچند انہیں امید کی جھلک نظر آچکی تھی لیکن فراق آخر فراق ہے جب حتماً مایوسی نہ ہو بلکہ بیم و رجا کا عالم ہو تو دردِ فراق کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَ تَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ وَ ابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰهُ مِنَ الۡحُزۡنِ فَهُوَ کَظِیۡمٌ ﴿۱۲/۸۴﴾

اور اُس نے ان لوگوں کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور (چونکہ اس نئے زخم کی خلش نے پچھلا زخم تازہ کر دیا تھا، اس لئے) پکار اٹھا "آہ یوسف کا دردِ فراق!" اور شدتِ غم سے اس کی آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی تھیں اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔

پھر اس آتشِ غم کی جگر سوزی کا اس سے اندازہ لگایئے کہ چارہ ساز تو ایک طرف، کوئی غمخوار بھی پاس نہ تھا۔ بیٹے تھے تو ایسے کہ انہیں یوسفؑ اور بن یامین کے نام سے چڑھ تھی! خود بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایسے میں بیٹوں کی ہر بات سننی پڑتی ہوگی۔ اور ان باتوں کا زخم، داغِ جدائی سے بھی زیادہ کرب انگیز ہوتا ہوگا۔

قَالُوۡا تَاللّٰهِ تَفۡتَؤُا تَذۡکُرُ یُوۡسُفَ حَتّٰی تَکُوۡنَ حَرَضًا اَوۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡهٰلِکِیۡنَ ﴿۱۲/۸۵﴾

(باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹے) کہنے لگے "بڑے میاں! تم اس قصے کو چھوڑ دو گے بھی یا ہر وقت اسی کی یاد کرتے رہو گے، یہاں تک کہ (اسی غم میں) گھل جاؤ یا اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔"

بیٹوں کی طرف سے نشتر

حضرت یعقوبؑ یہ سب کچھ سنتے اور جواب میں کہتے تو فقط اتنا کہ میں تم لوگوں سے تو کچھ نہیں کہتا! میں تو اپنا درد و غم اسی چارہ سازِ حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیا تمہیں اتنا بھی گوارا نہیں؟

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ وَ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (۱۲/۸۶)

باپ نے کہا، "میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ کی جناب میں عرض کرتا ہوں (کچھ تمہارا شکوہ نہیں کرتا) میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔"

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، حضرت یعقوبؑ کی امیدیں بڑھتی جارہی تھیں کہ فراق کی یہ جاں سوز گھڑیاں وصال میں تبدیل ہونے والی ہیں. آپ نے دیکھا ہے کہ جس طرح انہوں نے بیٹوں کی پہلی افسانہ طرازی کو صحیح نہیں مانا تھا اسی طرح اس دوسری کہانی کو بھی درست تسلیم نہیں کیا. انہوں نے آہستہ آہستہ بیٹوں کو آمادہ کر لیا کہ وہ ایک بار جائیں اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کا سراغ لگائیں.

يٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۱۲/۸۷)

(پھر انہوں نے کہا) "اے میرے بیٹو! (ایک بار پھر مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو. اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، مگر وہی لوگ جو اس کے قانون پر یقین نہیں رکھتے۔

دیکھئے! یہاں اُمیدوں کی دنیا کس طرح بیدار ہوتی نظر آرہی ہے. بیٹے غلہ لینے کے لئے پھر مصر پہنچے. قحط زدگی سے ان کی حالت بہت زیادہ سقیم ہو چکی تھی. اس لئے اب خرید و فروخت کے بجائے حضرت یوسفؑ سے بھیک کے طلبگار ہوئے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِی الْمُتَصَدِّقِيْنَ ○ (۱۲/۸۸)

پھر جب (باپ کے حکم کی تعمیل میں یہ لوگ مصر پہنچے اور) یوسف کے پاس گئے، تو اپنے پھر آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے) کہا، "اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھر کے آدمیوں پر بڑی سختی کے دن گذر رہے ہیں. پس (مجبور ہو کر غلہ کی طلب میں ہمیں پھر نکلنا پڑا) ہم تھوڑی سی پونجی لے کر آئے ہیں اسے قبول کر لیجئے اور غلہ کی پوری تول عنایت کیجئے. اور (اسے خرید و

فروخت کا معاملہ نہ سمجھئے بلکہ (ہمیں محتاج سمجھ کر) خیرات دیدیجئے۔ اللہ خیرات کرنے والوں کو ان کا اجر دیتا ہے۔!"

ذرا غور کیجئے۔ عزیزِ مصر (حضرت یوسفؑ) کی عاجز نوازیوں کی شہرت کتنی عام تھی کہ اُن (اجنبیوں) نے اتنے وثوق سے کہہ دیا کہ ہماری بضاعت کی طرف نہ دیکھئے، اپنے رحم و کرم کی طرف دیکھئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھئے بلکہ صدقہ و خیرات کا خیال کیجئے۔ کیسا درد انگیز اور عبرت آموز تھا یہ منظر! یہ جابر و قاہر بھائی اُس یوسفؑ سے بھیک کے سوالی ہیں جسے انہوں نے اس بیدردی سے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ یہ سُنکر حضرت یوسفؑ کا بھی جی بھر آیا اور انہوں نے کہا،

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ ٥ (۱۲/۸۹)

(یہ حال سُنکر) یوسف (کا دل بھر آیا۔ اُس) نے کہا "تمہیں یاد ہے تم نے بربنائے جہالت یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا۔"

اِذْ اَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ پر نگاہ ڈالئے۔ سیرتِ یوسفی کی زیبائیاں چھلک کر باہر آ رہی ہیں۔ ایک یہ بھائی تھے کہ بن یامین تو ایک طرف، اس کے بھائی کے متعلق بھی چوری کا غلط الزام لگانے سے نہ جھجکے۔ حتّٰی کہ بوڑھے باپ سے بھی طعن آمیز نشتر کے بغیر بات نہ کی۔ اور انہی کے بھائی حضرت یوسفؑ ہیں کہ ایسے شقی القلب بھائیوں کو ان کی شقاوتِ قلبی کی یاد دلائی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم سے یہ کچھ نادانی اور جہالت سے ہو گیا تھا۔

سامنے حضرت یوسفؑ ہیں

حضرت یوسفؑ نے اپنی کشادہ نگہی سے الزام کی نوعیت کو اس قدر نرم کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود ذرا تصوّر میں لائیے کہ یہ معلوم کرکے کہ سامنے یوسفؑ کھڑا ہے، بھائیوں کے قلب و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ قرآنِ کریم نے اس اضطرابی کیفیت کو ایک عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کے مُنہ سے یہ الفاظ سنے تو بوکھلاہٹ میں بول اُٹھے۔

ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ (۱۲/۹۰)

کیا فی الحقیقت تم ہی یوسف ہو۔

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (۱۲/۹۰)

یوسف نے کہا "ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بن یامین) میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان کیا۔ درحقیقت یہ ہے کہ جو کوئی (برائیوں سے) بچتا اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہتا ہے تو اللہ (کا قانون یہ ہے کہ وہ) نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا!

غور کیجیے، لسانِ یوسفیؑ نے دو لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ جو کوئی زندگی کی تباہ کن روش سے بچتا اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے اور پھر ہجومِ مشکلات میں ثابت قدم رہتا ہے، اس پر اللہ کی نوازشات کی گہرباری ہوتی ہے۔ اس اللہ کی جو مخلص انسان کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس کے بعد برادرانِ یوسفؑ پر جو کچھ گذری ہوگی اس کا اندازہ بیان میں نہیں، تصور ہی میں آسکتا ہے۔ انہوں نے شرم و ندامت سے گردن جھکائی اور کہا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ ۝ (۱۲/۹۱)

انہوں نے کہا "بخدا، اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ نے تجھے ہم پر برتری دی ہے اور بلاشبہ ہم سرتاسر قصوروار تھے۔"

غور فرمائیے، وہ بھائی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا تھا جو آج تک دنیا میں بطور ضرب المثل مشہور ہے، آج اسی بھائی کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ اُن سے پورا پورا انتقام لیا جاتا۔ لیکن جنہیں اللہ نے وسعتِ ظرف عطا فرمائی ہو وہ ذاتی انتقام نہیں لیا کرتے۔ ان کی دوستی اور دشمنی، عفو اور انتقام، سب اللہ کے لئے ہوتا ہے۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ

چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ (۱۲/۹۲)

یوسف نے کہا "آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سرزنش نہیں (جو کچھ تم نے میرے خلاف کیا تھا اسے تو میں نے معاف کر دیا لیکن اس سے جو کچھ تم نے خود اپنے خلاف کیا، یعنی

اس کا جو اثر تمہاری ذات پر مرتب ہوا۔ اس کے ازالہ کی صورت تو یہی ہے کہ تم قوانین
خداوندی کی اطاعت سے اپنی حفاظت کا سامان مہیا کرو۔ یہ سامان تو اسی کی طرف سے مل
سکتا ہے جو ارحم الرّٰحمین ہے۔

اللہ اکبر! جمالِ یوسفی کا مہرِ عالمتاب نصف النّہار پر نظر آ رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بھائیوں سے کہا
کہ اب تم یوں کرو۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ
وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۲/۹۳)

کہ میرا یہ کرتا اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس سے میرے منصب اور وجاہت کا پتہ چل جاتا ہے۔
جب تم اسے والد کے سامنے پیش کرو گے وہ اس سے سب کچھ سمجھ جائیں گے (اور تمہاری بات
کا یقین کر لیں گے) پھر تم اپنے تمام اہلِ خاندان کو یہاں لے آنا۔

پیرہنِ یوسفؑ

یہی بھائی اس سے پیشتر باپ کے پاس ایک کرتا لائے تھے جسے دیکھ کر روتے روتے باپ کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ آج وہی بھائی اُسی یوسفؑ کا ایک اور کُرتا لے کر اسی باپ کے پاس جاتے ہیں جس کُرتے سے بوڑھے باپ کی چھنی ہوئی متاع واپس مل رہی ہے۔
قافلہ مصر سے روانہ ہوا اور مختلف منازل طے کرتا اس بستی کے قریب آ پہنچا جہاں حضرت یعقوبؑ اور ان کا
گھرانا آباد تھا۔ یہاں سے باقی قافلہ آگے چل دیا اور برادرانِ یوسفؑ کے اونٹ الگ ہو گئے۔ (وَلَمَّا
فَصَلَتِ الْعِيْرُ) قافلہ کی آمد کا چرچا عام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ قافلہ کا انتظار کس
شدّت سے کر رہے ہوں گے۔ ایسا انتظار کہ دل کی ساری حسرتیں سمٹ کر آنکھ کے تل میں آ گئی ہوں گی۔
ان کے دل اور دماغ کی تمام قوتیں ایک نکتہ پر مرتکز ہو چکی ہوں گی۔

شمیمِ یوسفی کی عطر بیزیاں

قرآنِ کریم نے حضرت یعقوبؑ کی وجد و مسرّت کی اس والہانہ کیفیت کو عجیب دلآویز پیرایہ میں بیان فرمایا
ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ
اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ (۱۲/۹۴)

اور پھر جب (یہ لوگ یوسف کے حکم کے مطابق کرتا لے کر روانہ ہوئے اور کنعان کے قریب پہنچ گئے اور) قافلہ (جس میں یوسف کے بھائی آرہے تھے ان سے) جدا ہوا (یعنی یوسف کے بھائی بستی کی طرف چل دیئے) تو (اُدھر گھر میں) ان کا باپ کہنے لگا "اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں کہوں گا، مجھے یوسف کی مہک آرہی ہے (اور مجھے اس کا یقین ہے)۔

سننے والوں کی نگاہیں بھلا وہ کچھ کب دیکھ سکتی تھیں جو دیدۂ یعقوبؑ کو نظر آرہا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ اب وحی کی طرف سے بھی کچھ اشارہ مل گیا ہو جیسا کہ (۱۲/۹۶) سے ظاہر ہے لیکن سننے والوں کو اس کا بھی علم نہ تھا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۝ (۱۲/۹۵)

سننے والوں نے کہا، "بخدا! تم تو اب تک اپنے (اُسی) پرانے خبط میں مبتلا ہو" (یعنی یوسف کا تو نام و نشان بھی نہیں رہا اور تم اب تک اس کی واپسی کے خواب دیکھ رہے ہو!)

کرتا آپہنچا اتنے میں وہ بیٹا جس کے پاس کرتا تھا، اس مژدۂ حیات آور کو لیکر حضرت یعقوبؑ کے پاس آپہنچا۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۹۶)

لیکن پھر جب خوشخبری سنانے والا (دوڑتا ہوا) آیا اور اُس نے یوسف کا پیرہن یعقوب کے سامنے رکھ دیا تو اس نے معاملہ کو سمجھ لیا اور (فرطِ مسرت سے) کہا، "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں؟"

باپ کی اس کیفیت کے ساتھ ساتھ بھائیوں کی اس کیفیت کا بھی اندازہ لگایئے۔ باپ کے سامنے ان کی نگاہیں اوپر کو نہیں اُٹھ سکتی تھیں۔ انہوں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ۝ (۱۲/۹۷)

اے ہمارے باپ! ہماری خطاؤں کے لئے خدا سے سامانِ حفاظت طلب کر۔ فی الحقیقت ہم سے سراسر قصور ہی ہوتے رہے۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (۱۲/۹۸)

باپ نے کہا۔ "وہ وقت دور نہیں کہ میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے حفاظت طلب کرونگا۔ وہ وہی حفاظت و رحمت عطا کرنے والا ہے۔"

گھرانا جانبِ مصر روانہ ہوا

اس کے بعد یہ تمام گھرانا شاداں و فرحاں جانبِ مصر روانہ ہوا۔۔ حضرت یوسفؑ نے شہر[1] سے باہر ان کا استقبال کیا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝ؕ (۱۲/۹۹)

پھر جب (ایسا ہوا کہ یوسف کی خواہش کے مطابق) یہ لوگ (کنعان سے روانہ ہوکر مصر پہنچ گئے اور شہر کے باہر) یوسف سے ملے تو اس نے اپنے باپ اور ماں کو (عزت و احترام سے) اپنے پاس جگہ دی اور کہا، اب شہر میں چلو۔ انشاءاللہ تم سب کے لئے ہر طرح کی سلامتی ہے۔

عزت و تکریم کی مسندیں

پھر انہیں اپنے ساتھ شہر میں لے گئے۔ حضرت یوسفؑ نے دربار منعقد کیا۔ اپنے ماں باپ کے لئے مسند بچھائی۔ اہل دربار تعظیم بجالائے۔ عزت و وقار اور عظمت و اجلال کا یہ وہ منظر تھا جسے آج سے بہت عرصہ پہلے حضرت یوسفؑ نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ آج یوں پورا ہو کر رہا۔

وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ .... اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (۱۲/۱۰۰)

اور (جب شہر میں داخل ہوئے تو) اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا، (باقی سب کے لئے نیچے نشستیں رکھیں) اور سب اُس کے سامنے تعظیماً جھک گئے (اور مصر کے دستور کے مطابق اس کے منصبِ حکومت کی تعظیم بجالائے) اُس وقت (اسے اپنے بچپنے کا خواب یاد آگیا اور بے اختیار) پکار اٹھا "اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا میرے پروردگار

---

[1] اس زمانہ میں مصر کا دارالحکومت عمسیس تھا اور اسے جشن کا شہر کہتے تھے۔

نے اسے سچا ثابت کر دیا اور یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی، تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال رکھا تھا! بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لئے جو کرنی چاہیے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہی ہے کہ (سب کچھ) جاننے والا (اور اپنے سارے کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!"

اس علوِ مرتبت اور رفعتِ مدارج کے احساس سے حضرت یوسفؑ کی گردن اس محسنِ حقیقی کے حضور جھک گئی جس کی ذرہ نوازیوں کے صدقے یہ سب کچھ دیکھنے میں آیا تھا اور اس کی بارگاہ میں عرض کیا کہ

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱)

پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں!

غور فرمائیے، دنیا کی حکومت اور شوکت کے ساتھ ساتھ دعا کیا مانگی جا رہی ہے کہ جب دنیا سے جاؤں تو ایک عبدِ مسلم کی حیثیت سے جاؤں اور عاقبت میں تیرے صالح بندوں کے زمرہ میں شریک ہوں! یہ ہے ایک عبدِ مومن کی دین و دنیا کی آرزوؤں کا منتہیٰ! کیسا خوش بخت ہے وہ انسان اور کیسی طالع مند ہے وہ قوم جسے وہ مبداءِ فیض، دین و دنیا کی سرفرازیاں عطا فرما دے۔ لیکن یہ سب کچھ عطا ہوتا ہے ایمان و عمل کے بدلے، نہ صرف خاص قسم کے نام رکھ لینے اور دعائیں مانگ لینے سے۔!

یہ ہے حسنِ عمل کی وہ سرگذشتِ زریں جس سے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور نبی اکرمؐ کو مطلع فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ

اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ (۱۲/۱۰۲)

(اے پیغمبرؐ!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ (ظاہر ہے کہ) جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے تو تم اُس وقت اُن کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ یہ سب کچھ دیکھ سُن لیا ہو)۔

اور اللہ تعالیٰ نے اسی احسن انداز سے حضرات انبیائے سابقہ کے احوال وکوائف قرآن کریم میں بیان فرمائے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (۱۲/۳-۲)

ہم نے اس شکل میں اُتارا کہ عربی زبان کا قرآن ہے تاکہ تم سمجھو بوجھو۔ (اے پیغمبرؐ!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگذشتیں سناتے ہیں اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگذشتوں سے) بے خبر تھے۔

یہ داستانِ شیریں ختم ہو گئی۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر اس کے دو ایک مقامات پر نگہ بازگشت کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو "تاویل الاحادیث" کا علم عطا فرمایا تھا۔

تاویلِ الاحادیث

چونکہ حضرت یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی اس لئے عام طور سے سمجھ لیا گیا کہ تاویل الاحادیث سے مراد، خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں، جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تاویل الاحادیث کے اندر شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن تاویل الاحادیث سے مراد فقط علم تعبیر المنام نہیں۔ تاویل کے معنی نتیجہ اور مآلِ کار کے ہیں اور احادیث کے معنی ہیں باتیں۔ لہٰذا تاویل الاحادیث کے معنی ہوئے کسی بات سے یہ معلوم کر لینا کہ اس بات کا صحیح صحیح مطلب کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اسی کو معاملہ فہمی کہتے ہیں، یعنی کوئی معاملہ سامنے آئے، اُس کے سیاق وسباق اور متعلقات وتضمنات پر غور کر کے اس حقیقت پر پہنچ جانا کہ اس کا مآل اور انجام کیا ہو گا؟ غور کیجئے، دنیا میں ایک عام انسان اور ایک صاحبِ تدبّر و فراست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ معاملات

واقعات ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں. ایک عام ذہنی سطح کا انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے پیش نظر ہوتا ہے. لیکن ایک دیدہ ور کی نگاہیں، ہواؤں کے رُخ سے طوفان کی آمد کا اندازہ کر لیتی ہیں. قوموں کی زندگی ان کے مفکرین کی دیدہ وری اور مآل اندیشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے وہ مفکر جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگ سمن گفت
ولے بامن بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت (اقبالؒ)

حضرت یوسفؑ، بیابانِ کنعان کے گلہ بانوں کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئے. ہر چند قبیلہ کی سرداری ان کے گھرانے میں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ انہیں وہاں حضریت کی سیاستِ مدن اور عمرانیات و معاشیات کے مہمات و معاملات سے متعلق نہ کوئی تعلیم مل سکتی تھی نہ تربیت کے سامان موجود تھے. بدوی اور حضری زندگی کا فرق چھپا ہوا نہیں. اس لئے اس قسم کا ایک دہقانی بچہ جب ایک غلام کی حیثیت سے شہر میں آئے، تو اس کی زندگی ایک غلام (گھر کے ملازم) سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف اعلیٰ درجہ کی فراست عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ایسے مواقع بہم پہنچا دیئے جن میں آپ نے عملی طور پر اہم معاملات کے نظم و نسق کا سلیقہ حاصل کر لیا، یعنی عزیزِ مصر نے آپ کو اپنے کاروبار کا مختار و معتمد علیہ بنا لیا اور اس طرح آپ کو ان امور کا عملی تجربہ ہو گیا جو تمدنی زندگی کی خصوصیات میں سے تھے. یہ ہے وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشیّت کی طرف سے یہ انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ یوسفؑ کو "تاویل الاحادیث" کا علم سکھا دیا جائے.

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِؕ (۱۲/۲۱)

اور دیکھو! اس طرح ہم نے یوسف کا سرزمینِ مصر میں قدم جما دیا. اور مقصود یہ تھا کہ اسے باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا سکھا دیں.

اسی خداداد فراست اور عملی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت یوسفؑ کو حکومت و مملکت کے اختیارات تفویض کئے گئے تو آپ نے اس حسنِ تدبّر سے ان امور کا انتظام کیا کہ سب کی گردنیں آپ کے سامنے

جھک گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے مملکت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ تاویل الاحادیث کا علم بھی دے دیا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قف اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱)

(پھر یوسف نے دعا کی) پروردگار! تُو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تُو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تُو اپنے فضل و کرم سے ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں!

ان مقامات سے تاویل الاحادیث کا مفہوم واضح ہے۔

کہ خارے دیدو احوالِ چمن گفت

۲۔ خوابوں کی دُنیا

قصۂ حضرت یوسفؑ میں خوابوں کے تذکرہ کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ اُس وقت سے اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز بنا چلا آ رہا ہے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا۔ عصرِ حاضر میں علمِ تجزیۂ نفس کے ماہرین نے اس مسئلہ کو خاص طور پر اپنے غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بنایا ہے جن کی عملی کاوشوں کی بنا پر اس چیستان کے کئی ایک گوشوں پر روشنی پڑ چکی ہے۔ چونکہ یہ علم ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس لئے یہ روشنی ابھی دھندلی سی ہے۔ لیکن بایں ہمہ، اس موضوع کے کچھ نہ کچھ خط و خال سامنے ضرور آ چکے ہیں۔ اس علم کی رُو سے انسان میں نفسِ شعوریہ (CONSCIOUS MIND) کے علاوہ نفسِ غیر شعوریہ (UN-CONSCIOUS MIND) بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سے احوال و کوائف ایسے ہوتے ہیں جنہیں نفسِ شعوریہ کچھ وقت تک یاد رکھتا ہے لیکن اس کے بعد، یا تو ان واقعات کو یکسر بھلا دیتا ہے، یا ان کے خصوصی احساسات و تاثرات کے نقوش

اپنی لوح سے مٹا دیتا ہے۔ لیکن نفسِ غیر شعوریہ ان واقعات سے اہم حصص اور ان کے خصوصی تاثرات کو اپنی گرہ میں باندھ کر رکھ لیتا ہے۔ یہ تاثرات نفسِ شعوریہ کے ساتھ متصادم ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح انسان کے نظامِ عصبی کو غیر محسوس طور پر متاثر کرتے رہتے ہیں اور ان سے اس قسم کے عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں جن کا کوئی طبعی سبب (PHYSICAL CAUSE) سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ حصّہ ایک جداگانہ بحث سے تعلّق رکھتا ہے۔ مبحثِ زیرِ نظر کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ نفس نیم یا غیر شعوریہ اس وقت اپنا عمل شروع کرتا ہے جب نفسِ شعوریہ کی فعالیت (ACTIVITY) معطل ہو جاتی ہے (مثلاً حالتِ نشہ میں یا ہلکے سے غش، ہسٹیریا وغیرہ کے دورے میں) لیکن نفسِ غیر شعوریہ کو اپنی کار فرمائی کے لئے ان ہنگامی مواقع سے بھی زیادہ فرصت کا زمانہ اس وقت ملتا ہے جب انسان سو رہا ہو۔ اس وقت نفسِ شعوریہ کی حرکت معطّل ہوتی ہے اور نظامِ جسمانی میں کسی قسم کا انتشار و اضطراب بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے نفسِ نیم یا غیر شعوری اپنے "جادو" کے البم کو کھولتا ہے اور بھولے ہوئے افسانوں کی مختلف تصویریں ذہن کے پردۂ سیمیں پر لاتا ہے۔ واقعات میں ترتیب اور ان کے نتائج و عواقب میں ربط و ضبط، نفسِ شعوریہ کا حصّہ ہے۔ اس لئے نیم یا غیر شعوریہ نفس جن تاثرات یا واقعات کے ٹکڑے سامنے لاتا ہے ان میں کوئی باہمی ربط یا ترتیب نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی پیش کردہ فلم عجیب سی بے ربطی کا مجموعہ ہوتی ہے (اگرچہ بعض اوقات ایسے ٹکڑے بھی سامنے آجاتے ہیں جو اچھے خاصے مربوط ہوتے ہیں)۔ اسی کا نام خواب ہے۔ ان تاثرات میں جنہیں نفسِ شعوریہ بھلا دیتا ہے اور نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اپنے اسٹور میں جمع رکھتا ہے، ہزاروں خوں گشتہ آرزوئیں، سینکڑوں پامال شُدہ تمنائیں، بیسیوں ایسی للچائی ہوئی نگاہیں جو حسرت بن کر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی ہوں، خوابیدہ ہوتی ہیں۔ جب نفسِ شعوریہ کی دنیا سوتی ہے تو یہ خوابیدہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں، لیکن بے ربطی مضمون سے طلسمِ ہوشربا کا افسانہ بن کر سامنے آتی ہیں اور جب نفسِ شعوریہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھولے ہوئے واقعہ کی دھندلی سی یادیوں تازہ کرا دیتے ہیں جیسے مرمریں گردمیں ڈوبی ہوئی وادیٔ کہسار کے اُس پار، رات کے سناٹے میں، دُور سے بنسری کی آواز دل کے نرم و نازک گوشوں میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر خواب کا افسانہ، اس کی بے ربطی ہی کی نذر ہو جاتا ہے۔ علمِ تجزیۂ نفس کے ماہرین[1] خوابوں کے ان بے ربط ٹکڑوں سے نفسِ نیم یا غیر شعوریہ کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کی ٹوہ لگاتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں بڑی صبر آزما محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ خواب

(۱؎ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

دیکھنے والے کی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف معلوم کرتے ہیں۔ اس کی ناکامیوں اور نامرادیوں اور کامرانیوں اور شادمانیوں کے اسباب و علل دریافت کرتے ہیں۔ وہ ان نیم کش تیروں کی انیاں تلاش کرتے ہیں جو دل کے اندر ٹوٹ کر رہ گئی ہوں۔ وہ ایسی پھانسوں کی ٹوہ لگاتے ہیں جو رگِ جاں میں ڈوب کر پھر نہ ابھری ہوں۔ اس طرح وہ خواب دیکھنے والے کے خیالات کی رَو اور ذہن کی افتاد کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے بڑے بڑے اہم نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قیاسی ہوتا ہے، حتمی طور پر وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے قیاسات سے خواب کے معاملات کو آنے والے واقعات سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مستقبل کے واقعات خواب یا اس کی تعبیر کے مطابق نکل آتے ہیں، لیکن یہ محض اتفاقی امور ہیں۔ انہیں حقائق سے کچھ علاقہ نہیں۔ مثلاً ہوتا کیا ہے؟ آپ کی گہری تمنا ہے کہ آپ کا مستقبل فلاں سانچے میں ڈھلے۔ لیکن حالات اور واقعات آپ کو اس طرف جانے نہیں دیتے۔ آپ کا نفسِ شعوریہ حالات و واقعات کے مطابق کام کرتا ہے۔ لیکن جونہی آپ سوتے ہیں نفسِ نیم شعوریہ آپ کی تمنا کی سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک حسین خواب کی شکل میں آپ کے سامنے آتی ہے۔ جب آپ جاگتے ہیں تو پھر اپنے احوال و ظروف کے مطابق مصروفِ کار ہو جاتے ہیں۔ اب آخر میں، دو صورتوں میں سے ایک صورت پیدا ہوگی۔ یا تو آپ کا مستقبل آپ کی آرزوؤں کے خلاف عام احوال و ظروف کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اُس صورت میں آپ کے خواب جو آپ کے مستقبل کو آپ کی تمناؤں کے رنگ میں پیش کیا کرتے تھے محض واہمہ بن کر رہ جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا کہ آپ نے احوال و ظروف کے علی الرغم، اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا تو اس صورت میں آپ کے خواب "حرف بحرف سچ ہو کر" سامنے آجائیں گے۔ اس وقت آپ کہہ اٹھیں گے کہ مجھے پہلے ہی خواب میں یہ اشارہ ہو گیا

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) لہ بیداری کے وقت، خواب کے متعلق جو کچھ یاد رہتا ہے، وہ سب کچھ وہی نہیں ہوتا جو نفسِ غیر شعوریہ حالتِ خواب میں سامنے لاتا ہے۔ جو کچھ خواب میں سامنے آتا ہے، علم تجزیہ نفس کی رو سے اسے (LATENT CONTENT) کہا جاتا ہے اور حالتِ بیداری میں جو کچھ یاد رہتا ہے اسے (MANIFEST CONTENT) کہتے ہیں۔ اس (MANIFEST CONTENT) سے (LATENT CONTENT) کا سراغ لگانا خواب کی تعبیر کہلاتا ہے۔

تھا کہ میرا مستقبل کیا بننے والا ہے۔ اس طرح آپ کے خواب "پیشین گوئی" (PROPHETIC) ہو جائیں گے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس پر اور واقعات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) بہت سی باتیں تو اتفاقی امور (COINCIDENCE) سے متعلق ہوتی ہیں۔

یہ ہے خواب کی حقیقت جو اس وقت تک کی علمی تحقیق کی رُو سے سامنے آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، علمِ تجزیۂ نفس اور اس کے تضمنات ہنوز اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ اس وقت تک سامنے آیا ہے، وہی حقیقت ہے۔

لیکن بہرکیف، علمی تحقیقات کی رُو سے، جو کچھ سامنے آیا ہے، وہ یہی ہے۔ اس تحقیقات کی رُو سے، خواب انسان کے اپنے ہی گم گشتہ خیالات و تصورات اور دبی ہوئی تمناؤں اور آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے جس قسم کے خیالات و تصورات ہوں گے، اسی قسم کے خوابوں کی دنیا ہوگی۔ جن لوگوں کے خیالات و تصورات اور تمنائیں اور مقاصد کثافتوں سے پاکیزہ ہوں گے، اُن کے خواب بھی آئینے کی طرح مصفّٰی ہوں گے۔ جن کے فکر و نظر کی تطہیر ہو چکی ہوگی اُن کے خوابوں کی دنیا میں بھی کوثر و سلسبیل کی آبشاریں نغمہ بار ہوں گی۔ حضرات انبیائے کرامؑ خیالات و تصورات کی پاکیزگی و رفعت میں اس مقامِ بلند پر ہوتے ہیں جو امکانِ انسانیت کی آخری حد ہے۔ اس لئے جیسی ان کے قلب و نگاہ کی دنیا، ویسے ان کے خواب۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کو اللہ تعالیٰ امورِ غیبیہ کی اطلاع "خواب کی حالت" میں دے۔ لیکن "خواب کا یہ عالم" ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جو درحقیقت **خواب** کہلا بھی نہیں سکتا۔ اس قسم کے "خواب" صرف خاصۂ نبوّت ہوتے ہیں۔ ختمِ نبوّت کے ساتھ ان کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ ختمِ نبوّت کے بعد کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا، نہ خواب کے ذریعے نہ کشف و الہام کے ذریعے۔ اس قسم کے تصوّرات سب غیر قرآنی ہیں اور ختمِ نبوّت کی مہر کو توڑنے والے (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر ملے گی)۔ یہ تو ہے خواب دیکھنے کا معاملہ۔ اب رہا خواب کی تعبیر کا سوال......................

۔۔ سو عام حالات میں اس کا تعلق محض فراست سے ہے جو مختلف احوال و ظروف کی روشنی میں قیاساً کسی نتیجہ تک پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعبیرات محض ظنّی اور قیاسی ہوتی ہیں، حتمی اور یقینی نہیں ہوتیں۔ لیکن حضرات انبیائے کرامؑ کی صورت میں، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آنے والے

واقعات (غیب) سے مطلع کردے تو اس کا تعلق خواب کی تعبیر سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے عطا فرمودہ علم غیب سے ہوگا۔ چونکہ سلسلۂ نبوّت کے ختم ہو جانے سے غیب سے مطلع ہو جانے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا، اس لیے اب خوابوں کی تعبیر کا تعلق فراست سے رہ گیا[1]۔

اس مقدمہ کو سامنے رکھ کر قصہ حضرت یوسفؑ کے خوابوں پر غور کیجئے۔ پہلا خواب خود حضرت یوسفؑ کا ہے۔ ہر چند وہ اُن کے (قریب قریب) بچپن کا زمانہ ہے۔ لیکن خانوادۂ نبوّت کا بہ چشم و چراغ اور خود بھی ہونے والا نبی، اس لیے آپ کا خواب بھی انہی بلندیوں کا آئینہ دار تھا جن کی آماجگاہ آپ کا قلب و دماغ تھا۔ شمس و قمر اور روشن ستارے سجدہ ریز! یہ تھا خواب اور اس کی تعبیر بتانے والے حضرت یعقوبؑ جنھیں بیٹے کا طالع بلند، اس کی سیرت کی پیشانی میں درخشاں نظر آرہا تھا۔

دوسرا خواب قید خانہ کے ساتھیوں کا تھا۔ اگر اس کی تعبیر بشری حیثیت سے بتائی گئی تھی تو کہا جاسکتا ہے کہ کچھ وقت تک ساتھ رہنے سے فراستِ یوسفی نے بھانپ لیا ہوگا کہ ان میں ایک بے گناہ ہے اور دوسرا واقعی مجرم۔ ان کے خیالات کی رَو کا پہچان لینا بھی مشکل نہ تھا۔ ان کے خوابوں کی تعبیر چنداں دشوار نہ تھی۔ یہ درحقیقت آپ کی خصوصیتِ تاویل الاحادیث کا ایک مظاہرہ تھا، یعنی اس میں معاملہ فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک طرف قرآن نے اس تعبیر کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم آپ کو بذریعہ وحی عطا کردیا تھا۔ آپ نے تعبیر بتانے کے بعد فرمایا قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝ (۱۲/۴۱) جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے اور فیصلہ وہ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔" خالی فراست کا قیاس کبھی اس حتم و یقین کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ قُضِيَ الْأَمْرُ معاملہ طے ہوچکا ہے۔ یہ امر فیصل شدہ ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ دوسری طرف قرآن نے اگلی آیت میں کہا ہے کہ وَ قَالَ لِلَّذِي ظَنَّ اَنَّهٗ

---

[1] بعض اوقات طبیعت کے اثر سے بھی خواب مرتب ہوجاتے ہیں۔ مثلاً سوتے میں پیاس لگے تو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں جھلس رہا ہے یا پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں پڑا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ اس قسم کے خواب محض مزاج کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں "اضغاثِ احلام" (پریشان خیالی) کہا جاتا ہے۔ یہ حصہ طب کی دنیا سے متعلق ہے۔

فَاجٍ مِّنْهُمَا (۱۲/۴۲) "ان میں سے جس کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا (ظنّ) کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس نے کہا......" یہاں کہا گیا ہے کہ خواب کی یہ تعبیر حضرت یوسفؑ کا ظنّ تھی۔ ظنّ کے معانی کے متعلق امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ کسی چیز کی علامات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے اسے ظنّ کہتے ہیں اور یہ صرف قیاس اور اندازہ ہوتا ہے یقینی بات نہیں ہوتی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعبیر آپ کی اپنی فراست کا نتیجہ تھا۔ وحی کی صورت میں اسے ظنّ نہیں کہا جا سکتا۔

تیسرا خواب بادشاہ کا ہے۔ اس کی تعبیر کے ساتھ ساتھ حضرت یوسفؑ نے تدبیر بھی بیان کر دی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ آپ یہاں پورے یقین کے ساتھ بتا رہے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور اس کے متعلق کیا کرنا چاہیئے۔

خوابوں کی حتمی تعبیر نبوت ہی کا خاصہ ہو سکتی ہے جس میں کسی غیر نبی کا کوئی حصّہ نہیں ہو سکتا۔ غیر نبی جو کچھ کہے گا محض ظن و تخمین ہوگا۔ (خود نبی بھی جو کچھ ذاتی طور پر اپنی بشری حیثیت سے کہے گا وہ اس کی فراست کا نتیجہ ہوگا)۔ اب چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لئے خدا کے عطا فرمودہ علمِ غیب کی رُو سے اس قسم کی یقینی باتیں بتا دینا بھی ممکن نہیں رہا۔ اب اس بارے میں جو کچھ ہوگا بشری فراست کی رُو سے ہوگا۔ باقی رہا خوابوں کا معاملہ، سو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وہ انسان کے اپنے ہی خیالات و تصوّرات کا پریشان سا عکس ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا، خوابوں کی دنیا کو ایک مستقل عالم قرار دے کر اس پر حقائق کی بنیاد رکھ دینا افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقائق کا تعلق علم سے ہے اور علمِ حقیقی اللہ کی کتاب کے اندر ہے۔ نہ کسی کا خواب کسی دوسرے (یا خود خواب دیکھنے والے) کے لئے حجت ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تعبیر کوئی خدائی سند اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ لیکن حقائق سے مُنہ موڑ لینے کے بعد مسلمانوں کے ہاں جس طرح اوہام پرستی کے سیکڑوں اور گوشے کھل گئے، ان میں خوابوں کی توہّم پرستی بھی شامل ہو گئی۔ فلاں بزرگ خواب میں آکر یہ ارشاد فرما گئے۔ اب اس کی تعمیل آیتِ خداوندی سے بھی زیادہ مقدم ہے۔ مقدم ہی نہیں بلکہ اگر وہ ارشاد حکمِ شریعت کے صریحاً خلاف بھی جاتا ہے، تو بھی یہ کہہ کر اس کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شریعت ظواہر پرستی ہے اور وہ بزرگ حقیقت شناس ہیں، اس لئے ان کے ارشاد میں ایک ایسا رازِ نہاں ہے جسے ظاہر بیں آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی پر بس نہیں۔ قیامت تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر علم المنام کی رُو سے کی جاتی ہے۔ مثلاً

قرآنِ کریم کی کسی آیت کا واضح مفہوم اگر ان کے مفیدِ مطلب نہیں تو وہ کہیں گے کہ اس میں فلاں فلاں لفظ کے متعلق تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے (اور تعبیر ناموں میں ایک ایک لفظ کے متعلق بیس بیس مفہوم درج ہوتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق تعبیر لے لے)۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔ یعنی ان لوگوں کے نزدیک قرآنِ کریم (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) اللہ کے خوابوں کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر (نہیں، بلکہ تعبیر) تعطیر المنام (خوابوں کے تعبیر نامہ) کی رُو سے کی جائے گی؟ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ[۶:۹۲] حقائق کی تفسیر ایسے ظنیات و خرافات سے! اور اس پر دعویٰ یہ کہ اس "قرآن فہمی" کا سرچشمہ خاص علمِ الٰہی ہے!

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے!

سجدہ گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کا کنبہ مصر میں آیا تو آپ نے اپنے ماں باپ کے لئے مسند بچھوائی اور اہلِ دربار بطور اظہارِ اطاعت کورنش بجالائے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (۱۲/۱۰۰)

اور (جب شہر میں داخل ہوئے تو) اُس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا (باقی سب کے لئے نیچے نشستیں رکھیں) اور (دیکھو) اس وقت ایسا ہوا کہ سب اُس کے آگے جُھک گئے (اور مصر کے دستور کے مطابق اس کے منصبِ حکومت کی تعظیم بجالائے)۔

لفظ سجدہ کے متعلق (کتاب ابلیس و آدم، باب آدم) میں بصراحت لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم سچ مچ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا نہیں بلکہ اطاعت شعاری اور فرماں پذیری ہے۔ زمین پر ماتھا رکھ دینا اس اطاعت شعاری کا طریقِ اظہار ہے جو ہمارے ہاں صرف اللہ کے لئے مختص ہے۔ اور حق بھی یہ ہے کہ انسان کی گردن اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنی نہیں چاہیئے۔ اس لئے قصۂ حضرت یوسفؑ میں سجدہ سے مراد یہ نہیں کہ اہلِ دربار (یا اُن کے بھائیوں) نے سچ مچ زمین پر پیشانی رکھ دی بلکہ اس سے مراد اظہارِ اطاعت و تعظیم ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہی سجدہ ہے جس میں انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے، تو اس صورت میں "لہ" میں ضمیر کا مرجع خدا لینا ہوگا، یعنی اس شوکت و اجلال کو دیکھ کر حضرت یوسفؑ کے ماں باپ اور بھائی سب خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگئے۔ لیکن زبان کے قاعدہ کی رُو سے "رفع" کے فاعل

(حضرت یوسفؑ) کو" لَہٗ " کی ضمیر کا مرجع قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے (اس اعتبار سے) اس آیت کا مفہوم وہی درست ہوگا جو پہلے بیان کیا گیا ہے، یعنی اہل دربار (اور حضرت یوسفؑ کے بھائی) ادباً اور تعظیماً آپ کے سامنے جھک گئے۔ یا اگر" لَہٗ " کے معنی یہ لئے جائیں کہ "حضرت یوسفؑ کی خاطر" تو اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور آپ کے بھائیوں نے آپ کی اس قدر عظمت و شوکت دیکھی تو اس کے لئے خدا کے حضور سجدۂ تشکر ادا کیا۔ بہرحال، یہ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لئے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے (تعظیم ہی کے لئے کیوں نہ ہو) سجدہ ریز ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔

۴۔ حضرت یوسفؑ اور شاہِ مصر

قرآنِ کریم نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ شاہِ مصر آپ پر ایمان لے آیا اور نہ ہی تاریخ اس واقعہ پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ خدا کے رسول[1] تھے۔ ان کا مقصد فقط اتنا ہی نہ تھا کہ اپنی بریّت ثابت کرا کر قید خانہ سے نکل آئیں اور اس کے بعد بادشاہ کی حکومت میں شریک ہو کر ملک کا انتظام بہتر کر دیں اور بس۔ رسول کے ذمّے خدا کا پیغام پہنچانا اور اس کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا ہوگا۔ حالات بھی اس کے مؤیّد ہیں۔ بادشاہ نے آپ کے بلند کیرکٹر کا خود مشاہدہ کر لیا۔ خواب کے معاملہ میں آپ کی غیب دانی کو دیکھ لیا۔ ملک کے انتظام میں فراست و تدبّر نکھر کر اس کے سامنے آ گئے۔ جب یہ سب کچھ اس کے سامنے آ گیا، تو حضرت یوسفؑ کی صداقت پر ایمان لانے میں کونسا امر مانع ہو سکتا تھا؟ پھر حضرت یوسفؑ اخیر عمر تک اس ملک میں رہے اور وہیں متمکّن فی الارض ہوئے۔ اگر وہ آپ کی دعوت کا انکار کرتا تو نہ آپ وہاں رہ سکتے تھے نہ وہ آپ کو وہاں رہنے دیتا۔ ان قرآئن سے بھی ظاہر ہے کہ نظامِ زندگی حضرت یوسفؑ کے تجویز فرمودہ خطوط پر ہی متشکل ہوا ہوگا۔ اگرچہ نسبت کی رُو سے اسے" بادشاہ کا قانون" ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو وہاں کس قسم کے اختیارات حاصل تھے؟ اس کے لئے قرآنِ کریم کے ان الفاظ پر پھر غور فرمائیے جہاں ارشاد ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ط (۱۲/۵۶) اس

---

[1] آپ کی رسالت کے متعلق دیکھئے (۸۲ — ۶/۸۳)۔

طرح ہم نے یوسفؑ کو مصر میں متمکن کر دیا کہ وہ جہاں چاہے اختیار رکھے" یعنی آپ کے اختیارات اس قدر وسیع تھے۔ بائبل میں اس موقع پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو کل اختیارات دے رکھے تھے۔ خود حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ (۱۲/۱۰۱) "میرے اللہ نے مجھے حکومت عطا فرمائی"۔ اس سے بھی ظاہر ہے آخر الامر حکومت آپ ہی کی قائم ہوئی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ (معاذ اللہ) کسی طاغوتی نظام کے ممد و معاون نہ تھے بلکہ آپ نے اس طاغوتی نظام کو خدائی نظام میں تبدیل کر دیا تھا۔

سورۂ مومن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کی پوری قوم حضرت یوسفؑ پر ایمان نہیں لائی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن میں (جن کی بعثت حضرت یوسفؑ سے قریب چار سو سال بعد ہوئی) دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا .... (۴۰/۳۴)

اور یقیناً اس (حضرت موسیٰ) سے پہلے یوسف تمہارے پاس دلائل (یا واضح قرائن) لے کر آیا۔ لیکن جو کچھ وہ تمہارے پاس لایا تم اُس کے بارے میں شک میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گیا تو تم نے کہا کہ اس کے بعد اللہ کوئی (اور) رسول نہیں بھیجے گا۔

یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام (رسالت) قوم مصر تک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا اسے پوری کی پوری قوم نے رد کر دیا یا تسلیم بھی ہوا اور رد بھی ہوا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ حقیقت کہ حضرت یوسفؑ عمر بھر مصر میں رہے اور ممتاز حیثیت سے رہے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان کے پیغام کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ورنہ نہ یہ ممکن تھا کہ قوم کی پوری مخالفت کے باوجود آپ ایک ممتاز حیثیت سے وہاں رہ سکتے اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ آپ بحیثیت رسول، اپنے پیغام کی تبلیغ سے باز رہتے۔ اس لئے اس حقیقت اور دربارِ فرعون کے مردِ مومن کی محولہ صدر تقریر کو ملانے سے اسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آپ کا پیغام تسلیم بھی کیا گیا اور اس کی بابت شک بھی کیا گیا اور یہ بھی کہ بادشاہ اور اس کا آئینِ حکومت حضرت یوسفؑ کے فیصلوں کے تابع تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ یوسفؑ، جو قید خانہ میں اس انقلابِ عظیم کا اعلان فرماتے تھے کہ

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹) اور جو اس حقیقت کبریٰ کا بیباکانہ اظہار فرماتے تھے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اور جن کے نزدیک یہی دِیْنُ الْقَیِّمُ (۱۲/۴۰) تھا اس کے سوا سب باطل تھا۔ اس کے متعلق یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ ایک غیر خدائی نظامِ حکومت کے دست و بازو بن کر ساری عمر گزار دیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی زندگی میں ملک کی آبادی کا ایک حصہ آپ کی نبوت کے متعلق شک میں رہا جیسا کہ اکثر انبیاء کے ساتھ ہوا اور ایک حصہ آپ پر ایمان لے آیا۔

خلاصۂ مبحث

مساعد حالات اور موافق ماحول میں راست بازی اور دیانتداری کی زندگی بسر کرنا چنداں وقت طلب نہیں ہوتا۔ لیکن مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں ماحول نامساعد اور حالات مخالف ہوں۔ ایسے وقت میں حق و صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یقیناً من عزم الامور ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کے صحیح کیرکٹر اور بلندیٔ سیرت کا اندازہ بھی ایسے ہی ناموافق حالات میں لگایا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف مکر و فریب کے جال بچھ رہے ہیں۔ جھوٹ اور ملمع کاری کو ہر طرف فروغ حاصل ہے۔ جو جس قدر زیادہ زمانہ ساز اور فریب کار ہے اتنا ہی زیادہ کامیاب و کامران ہے۔ صداقت اور راست اطواری کا ہر طرف گلا گھونٹا جارہا ہے۔ اس طرزِ زندگی سے قدم قدم پر مصائب و تکالیف کا سامنا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مسابقت تصنع اور فریب سے حاصل ہورہی ہے سچے اصولوں پر کاربند رہنے سے ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے۔ آپ اس دوراہے پر ٹھٹک کر رک جاتے ہیں۔ ذہنی کشمکش آپ کو کچھ فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ کامیابیوں کا لالچ آپ کو بھی فریب دیتا ہے کہ جن حربوں سے دوسرے لوگ کام نکال رہے ہیں وہی مجھے استعمال کرنے چاہئیں۔ دوسری طرف اصول پرستی ہے کہ وہ اس فریب کارانہ روش میں ہر مقام پر عناں گیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں وہ لوگ جن کے سامنے نصب العین فقط حصولِ مقاصد ہوتا ہے (خواہ اس کے لئے کسی قسم کے ذرائع بھی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں) اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ اور لوگ کر رہے ہیں ہمیں بھی وہی کرنا چاہیئے۔ نفس کا فریب یہ خوش آئند دلیل پیش کر کے "اطمینان" دلا دیتا ہے کہ ایک فردِ واحد کی اصول پرستی سوائے اس کے کہ اس کی اپنی ہلاکت کا موجب بن جائے اور کیا نتیجہ پیدا کرسکتی ہے۔ عوام ہی نہیں بلکہ (تنہا عقل کے زور پر مسائل حیات کو حل کرنے والے نظام میں) بڑے بڑے مفکرین بھی اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ کے فلسفۂ اخلاق کا بہت بڑا علمبردار ہربرٹ اسپنسر HERBERT SPENCER لکھتا ہے:

ایک مثالی زندگی بسر کرنے والے انسان کے لئے دوسری قسم کے انسانوں کے اندر مثالی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ ان فریب کار لوگوں میں جن کا کوئی اصول نہ ہو خالص سچائی اور صاف دلی یقیناً ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ ایسی روشِ زندگی پر جو عام مروجہ مسالکِ زندگی کے خلاف ہو کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہا جا سکتا۔ یہ چیز آخرکار اس انسان کی اپنی یا اس کی نسل کی یا دونوں کی موت کا باعث ہوتی ہے۔

(The PRINCIPLES OF ETHICS _ Pt. II , P. 108)

ان لوگوں کے ایسے ہی فیصلے ہونے چاہئیں۔ لیکن جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے وہ ناموافق حالات اور نامساعد احوال و ظروف کے طوفان میں حق و صداقت کی چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ آخرالامر (ان کے اپنے سامنے یا ان کے بعد) ماحول کو ان کی روش کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ اس حقیقتِ کبریٰ کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ

حدیثِ بے خبراں ہے " تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز

حضرت یوسفؑ کی داستانِ زرّیں اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔

اس قصّے میں دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اس عالمِ اسباب میں اللہ تعالیٰ اپنی مشیّت کے پروگرام کو اسباب و علل کی کڑیوں سے ہی ظہور میں لاتا ہے۔ کنعان کے ایک "چرواہے" کو ان بلندیوں تک پہنچانے میں، جہاں "چاند اور ستارے" اس کے سامنے جھکیں، اندھے کنوؤں، مصر کے بازاروں اور قید و بند کی مصیبتوں سے گذارنا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ بلندیاں ملتی ہی اس استحکامِ خودی کے نتیجہ اور صدقے میں ہیں جن کا مظاہرہ ان نامساعد حالات میں ہوتا ہے۔

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ (۱۱/۸۴)

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے تذکرۂ جلیلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ کی بیوی (قطورا) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں ایک بیٹے کا نام **مدین** تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ ارضِ حجاز میں متمکن ہوئے اور حضرت اسحٰقؑ فلسطین میں۔ مدین، حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل، تاریخ کے صفحات پر قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۲۱۰۰ یا ۲۲۰۰ ق.م ہے۔ اس لئے قومِ مدین کے آغاز کا زمانہ ۲۰۰۰ ق.م تصور کرنا چاہیئے۔ جو قافلہ حضرت یوسفؑ کو چاہِ کنعان سے بازارِ مصر میں لے گیا تھا وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ یہ قوم اس علاقہ میں بڑھی اچھولی پھلی۔ قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی۔

قومِ مدین

جب حضرت موسیٰؑ (قبل از نبوت) مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ انہوں نے یہاں پہنچ کر ایک کبیر سن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا (ملاحظہ ہو ۲۰/۴۰؛ ۲۸/۲۲ تا آخرِ رکوع۔ تفصیل حضرت موسیٰؑ کے ذکر میں آئے گی)۔ قرآنِ کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بزرگ کون تھے لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ تورات میں ان کا نام کہیں رعوائیل کہیں یترو اور کہیں حوباب لکھا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا (جیسا کہ کتاب گنتی ۱۰/۲۹ میں مذکور ہے)۔ باقی نام دراصل القاب تھے! اور یہی حوباب ہیں جو قرآنِ کریم میں شعیبؑ کے

---

۱ تورات، کتاب گنتی، باب ۱۰، آیت ۲۹ کے مطابق حوباب حضرت موسیٰؑ کے خسر کا نہیں بلکہ ان کے بیٹے کا نام تھا۔ (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)۔

نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی ۱۶ ویں صدی ق م۔

اصحابُ الایکہ تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا بیٹا دِوان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قومِ مدین کے علاوہ، اصحاب الایکہ کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ اربابِ تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ بنو دوآن ہی تھے۔ ایکہ کے معنی ہیں جنگل۔ ان کی بستی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ وہ اسی شاہراہ (امامِ مبین) پر واقع تھی جو حجاز سے شام کی طرف جاتی ہے اور جس کا ذکر قومِ لوط کی سرگذشت میں آچکا ہے۔

وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ۙ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۚ (۱۵/۷۸)

اور (اسی طرح) گھنے جنگل کے لوگ بڑے ظالم تھے (یعنی اصحاب الایکہ)، انہیں بھی ہم نے ظلم و سرکشی کی سزا دی۔ اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قومِ لوط اور اصحاب الایکہ کی) شارعِ پر سب کو دکھائی دیتی ہیں۔

یہ تھے وہ قبائل جن کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ نسبی طور پر آپ مدین کے قبیلہ سے متعلق تھے۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ

(۷/۸۵، نیز ۱۱/۸۴؛ ۲۹/۳۶)

اور اسی طرح مدین کی بستی میں شعیب کو بھیجا گیا کہ اُنہی کے بھائی بندوں میں سے تھا۔ اس نے کہا، بھائیو! اللہ کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (آقا و حاکم) نہیں۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح ضابطہ ہدایت تمہارے سامنے آچکا ہے پس چاہیئے کہ ناپ تول پورا کیا کرو۔ لوگوں کو خرید و فروخت میں ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک میں درستی کے بعد (کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے ظہور میں آرہی ہے) خرابی نہ پیدا کرو۔

اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے۔
آپ ان قبائل کی طرف سب سے پہلے رسول نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے اور رسول بھی آ چکے تھے جن کی تکذیب کی گئی تھی۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۶/۱۷۶)

گھنے جنگل والوں (اہلِ مدین) نے اللہ کے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

انہی کو حضرت شعیبؑ نے مخاطب کیا تھا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۞ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۞
(۲۶/۱۷۸—۱۷۷)

جب شعیب نے ان سے کہا، "کیا تم اپنی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے ڈرتے نہیں؟ یقین رکھو، میں تمہارے لئے (خدا کی طرف سے) ایک امانت دار رسول ہوں (میرا اتباع کرو اور مجھ پر ایمان لاؤ)۔

دولت کے نشہ میں مست

ایک تو علاقہ سرسبز و شاداب، اس پر دُور دور تک کی تجارت۔ اہلِ مدین دولت کے نشہ میں مست تھے۔ دولت کے ساتھ کثرتِ افراد بھی شامل تھی جو قبائلی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لئے دولت و قوت کی فراوانی سے یہ قوم طاغوتی سرکشیوں کا آتشیں پیکر بن چکی تھی۔ جب سرمایہ داری اور تجارت ایک خدا فراموش قوم کے ہاتھ میں ہوں، تو وہ لوگ جن ابلیسی حربوں سے لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ اس قوم میں یہ سب خرابیاں ایک ایک کر کے آ چکی تھیں۔ اس تاجرانہ "جیب تراشی" کے علاوہ، یہ لوگ اپنی قوت و کثرت کے گھمنڈ پر رہزنی سے بھی نہیں چُوکتے تھے۔ یہ ان کی عام حالت تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ نے (بعد از نبوت) بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کی ہے تو وہ انہی علاقوں میں خیمہ زن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل روزمرّہ کی ضروریات کی چیزیں انہی لوگوں سے خریدتے تھے۔ یہ انہیں یوں بھی لُوٹتے تھے اور پھر ہر قسم کا فتنہ و فساد بھی برپا کرتے تھے۔ تورات (سفر القضاۃ[1] اور سفر العدد) میں دیکھئے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے خلاف کس کس قسم کی ننگِ انسانیت حرکتیں کیں۔ ان کی عورتوں نے بنی اسرائیل

---

[1] قضاۃ، باب ۶، آیت ۱ تا ۶۔

کے نوجوانوں کو (جو درحقیقت ان کی سپاہ تھی) اپنے دامِ فریب میں اُلجھا کر بداخلاقی کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں، آہستہ آہستہ، اُن کے سرداروں سے باغی بنا دیا۔ اردگرد کے قبائل کے ساتھ سازشیں شروع کردیں کہ بنی اسرائیل کو ان علاقوں سے نکال دیا جائے۔ غرضیکہ جس طرح ہر مستبد قوم کا شیوہ ہے، انہوں نے اس قسم کے ابلہ فریب حربوں سے بنی اسرائیل کے جواہرِ ملی کو ایک ایک کرکے چھین لینا چاہا۔ یہ تھا وہ وقت جب حضرت شعیبؑ نے انہیں للکارا اور کہا کہ وہ اس قسم کے انسانیت سوز جرائم سے کیوں غضبِ الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں؟ سورۂ اعراف میں ہے۔

فتنہ و فساد

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ .... وَ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝

(۷/۸۶ — ۸۵)

اور اسی طرح مدین کی بستی میں شعیب کو بھیجا گیا کہ اُنہی کے بھائی بندوں میں سے تھا۔ اس نے کہا بھائیو! اللہ کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (آقا و حاکم) نہیں۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح ضابطۂ ہدایت تمہارے سامنے آچکا ہے پس چاہیئے کہ ماپ تول پورا پورا کیا کرو۔ لوگوں کو (خرید و فروخت میں) ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک کی درستی کے بعد (کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے ظہور میں آرہی ہے) اس میں خرابی نہ ڈالو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے۔

اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ اس دعوت کی اشاعت روکنے کے لئے) ہر راستے پر جا بیٹھو اور جو آدمی بھی ایمان لائے، اسے دھمکیاں دے کر خدا کی راہ سے روکو اور اس میں خرابیاں پیدا کرنے کے درپئے ہو۔ خدا کا احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے تھے اُس نے (امن و عافیت دے کر) تمہاری تعداد زیادہ کردی۔ اور پھر غور کرو، جن لوگوں نے فساد کا شیوہ اختیار کیا تھا، انہیں کیسا انجام پیش آچکا ہے؟"

غور کیجئے! وہ تمام عیوب و جرائم جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے کس طرح ایک ایک کرکے بیان کئے گئے ہیں۔ سورۂ ہود میں ارشاد ہے۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔۔۔۔۔۔۔۔ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○ (۸۴—۸۶/۱۱)

اور ہم نے (قبیلۂ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔

اُس نے کہا، "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (آقا اور حاکم) نہیں۔ اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دن ایسا نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا۔

اور اے میری قوم کے لوگو! ماپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں (اُن کے حق سے) کم نہ دو۔ ملک میں شر و فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر تم میرا کہا مانو، تو جو کچھ اللہ کے قانون کے مطابق تمہارے پاس رہے اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے۔ اور دیکھو! میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں (کہ جبراً اپنی راہ پر چلا دوں)۔

دعوتِ شعیبؑ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ کے ٹکڑے پر غور فرمایئے۔ دنیائے معاملات کا کونسا گوشہ ہے جو اس احاطہ کے اندر نہیں آجاتا۔ تم پوری پوری محنت کرو اور پھر اس محنت کے ماحصل کو خدا کے اس نظام کے تابع رکھو جو ربوبیتِ عامہ کے لئے متشکل ہوا ہے وہاں سے اس رزق کی تقسیم قانونِ خداوندی کی رُو سے اس طرح ہوگی کہ کسی ضرورتمند کی ضرورت رُکی نہیں رہیگی۔ جو کچھ اس طرح سے حاصل ہو، حقیقی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس سے ملتی ہیں۔ اس سے تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما اور انسانیت کی پرورش ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آیات ۱۷۹—۱۸۴/۲۶؛ ۳۶/۲۹ بھی دیکھئے۔

دعوت کا جواب قوم کی حالت اور حضرت شعیبؑ کی دعوت ہمارے سامنے آچکی۔ اس دعوت کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پیشتر کی اقوام میں ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس سے عبرت حاصل کی لیکن باقی اپنی سرکشی میں بدمست رہے (۸۶/۷)۔

قوم کی بدعنوانیاں اور حضرت شعیبؑ کی اصلاح کی کوششیں دوش بدوش آگے بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ قوم ان اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئی جو اندھی قوت کے آخری حربے ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے قوم اور حضرت شعیبؑ کے مکالمات کو اپنے خاص انداز میں بیان فرمایا ہے جسے اسی ترتیب و اسلوب سے درج کیا جاتا

ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ (۷/۸۸)۔

اس پر قوم کے دولت مند سرداروں نے جنہیں (اپنی دنیوی طاقتوں کا) گھمنڈ تھا، کہا، اے شعیب! (دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی) یا تو تجھے اور اُن سب کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، ہم اپنے شہر سے نکال باہر کریں گے یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔"

تخویف و ترہیب دیکھئے جب دانش و بصیرت پر مبنی کوئی جواب پاس نہیں ہوتا تو مستبد قوتیں کن دھمکیوں پر اُتر آتی ہیں۔ "یا تو اس انقلاب انگیز مسلک سے باز آجاؤ ورنہ ملک بدر کر دیئے جاؤ گے!" لیکن جن کی آنکھیں حقیقت کو بے نقاب دیکھ چکی ہوں ان پر ان دھمکیوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا، قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ۟ۚ (۷/۸۸) خواہ ہم اس مسلک کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں، پھر بھی اسے اختیار کر لیں؟ غور کیجئے! استبداد کے مطالبات کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ مستبد قوتیں اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ جسے آپ کی بصیرت درست سمجھے اسے اختیار کر لینے کا آپ کو حق حاصل ہو۔ آپ کو وہ مسلک اختیار کرنا ہو گا جسے ان کی مصلحتیں اپنے مفیدِ مطلب سمجھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ علیٰ وجہ البصیرت ان گمراہ کن راستوں کو چھوڑ چکا ہو، وہ محض استبداد کے ڈر سے ان راہوں کو کیسے اختیار کر لے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ۟ۚ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ۝ (۸۸ — ۷/۸۹)

شعیب نے کہا، "اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً مان لیں؟ اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں، حالانکہ خدا نے (علم و یقین کی روشنی نمایاں کر کے) ہمیں اس سے نجات،

دیدی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے خدا پر بہتان باندھا۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اب قدم پیچھے ہٹائیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم نے یہ دین اس خدا کی طرف سے پایا ہے جس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ باقی رہیں تمہاری دھمکیاں، سو ہم ان کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ ہمارا بھروسہ قوانین خداوندی کی محکمیت پر ہے۔

(اس کے بعد شعیبؑ نے خدا کے حضور عرض کیا کہ "اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!"

جب حضرت شعیبؑ کی محکم خودی کے سامنے ان لوگوں کی کوئی پیش نہ چلی تو عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ خبردار! جو شخص اس کے پیچھے چلے گا سخت عذاب میں ماخوذ کر دیا جائے گا۔

وَ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (۷/۹۰)

قوم کے سرداروں نے جو شعیب کے منکر تھے (لوگوں سے) کہا، "اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو بس سمجھ لو، تم برباد ہوئے"!

غور کیجئے! دعوتِ حق و صداقت کو کس طرح رد کیا جاتا ہے! دنیا میں کوئی طاغوتی قوت ایسی نہیں جو دعوت الی اللہ کی عام تبلیغ اور اس کی اتباع و اطاعت کی اجازت دیدے۔ ابد سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور ازل تک یہی ہوتا چلا جائے گا۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ ابلیس، آدم کے ساتھ اس اسٹیج پر کن دعاوی کو ساتھ لے کر آیا ہے؟ لہٰذا اگر طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں

ایک نکھرا ہوا معیار

ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوت، حق و صداقت کی دعوت نہیں، خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاذبِ نگاہ و نظر فریب پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتوں کو پرکھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کبھی، کہیں، کوئی استثناء نظر نہیں آئے گا۔ لہٰذا،

حضرت شعیبؑ کے ساتھ یہی کچھ کیوں نہ ہوتا؟

سورۂ ہود میں قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض درج کیا گیا ہے جو اسلام کی ایک بہت بڑی اصولی حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ○ (۱۱/۸۷)

لوگوں نے کہا، اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ یہ حکم دیتی ہے کہ ہمیں آکر کہے "ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں تمہارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو!

مذہب وسیاست

مذہب کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے اور اس خیال کو ہمارے زمانے میں خاص مصلحتوں کے ماتحت اور بھی عام کیا جا رہا ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام ہے اسے دنیاوی معاملات سے کیا واسطہ؟ مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ، نماز روزہ" نیک عملی اور خدا پرستی" تک محدود ہے، اس سے آگے دنیاوی معاملات ہیں۔ ان معاملات میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خیال نیا نہیں۔ خدا کا سچا مذہب (جس کے لئے صحیح لفظ 'دین' یعنی نظامِ اطاعتِ خداوندی ہے) جہاں اور جب بھی پیش کیا گیا، خود ساختہ قوانین پر چلنے والے انسانوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ "مذہب کو ان معاملات کے ساتھ کیا تعلق"! خدا کی عبادت (بمعنی پوجا پاٹ) سے دنیا میں کوئی نہیں روکتا۔ اس سے دوسرے کا بگڑتا کیا ہے۔ آپ صبح سے شام تک اس شکل کی عبادت کرتے رہیئے آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہر جگہ آزادی ہے۔ لیکن جب آپ عبادت بمعنی عبودیت (یعنی انسانوں کی بجائے قوانینِ خداوندی کی محکومیت) کو مذہب (یعنی دین) کی حیثیت سے اختیار کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے تو مستبد قوتیں کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔ اس لئے کہ دنیا کا نظامِ استبداد، بعض انسانوں کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ لیکن اللہ کا نظام (یعنی دین) انسانوں سے یہ حق چھین کر اس ذات کے سپرد کر دیتا ہے جو حکومت کی فی الواقع سزاوار ہے۔ لہٰذا دوسروں پر اپنی مرضی چلانے کا خوگر انسان اسے کس طرح گوارا کرسکتا ہے؟ یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس کے ماتحت مستبد قوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مذہب پوجا پاٹ کی حد تک رہے تو بالکل درست، لیکن

اگر معاملات میں دخل دینے لگ جائے تو سخن درین است۔ یہی ہے وہ اعتراض جو قوم مدین نے پیش کیا۔ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ آپ نمازیں پڑھتے رہیئے۔ ہم کب روکتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کی یہ نماز کیسی ہے جو اس باب میں دخیل ہوتی ہے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں بلکہ اسے کسی اور قانون کے تابع رکھیں۔ "اموال" کے لفظ کو خاص طور پر سامنے رکھئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ صرف مساجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات کو بھی اپنے اندر لے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دینِ خداوندی ان ناہمواریوں کو دُور کرنے کے لئے آتا ہے، جو تقسیم رزق کے بارے میں انسانوں نے اپنے خود ساختہ آئین و قوانین کی رُو سے پیدا کر رکھی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر غیر خدائی نظام، نظامِ خداوندی کے مقابلہ میں آتا ہے اور اس سے بڑی شدت سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی صلوٰۃ کا دائرہ اپنی مساجد تک رکھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو ایک طرف، میں تمہاری مساجد کی تعمیر و مرمت، روشنی، جھاڑ فانوس، فرش، قالین تک کے لئے مدد دوں گا۔ لیکن اگر تم یہ کہو کہ خدا کا قانون ہماری معاشی زندگی کو بھی محیط ہے تو اس کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔[1]

یہ تو تھا آیت کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق۔ اب پہلے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اہلِ مدین بت پرست تھے۔ بُت پرستوں سے پوچھئے، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم پرستش تو درحقیقت خدا ہی کی کرتے ہیں لیکن ان بتوں کو خدا کی صفات کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری نماز اور ہماری بھگتی ایک ہی منزل تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ اور ایک بُت پرستوں تک ہی کیا موقوف ہے، دنیا میں کسی "خدا کے بھگت" سے پوچھئے، وہ یہی کہے گا کہ راستے مختلف ہیں لیکن قبلۂ مقصود سب کا ایک ہے۔ کسی نے خدا خدا کہہ لیا، کسی نے رام رام۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ تعلیم بظاہر بڑی خوش آئند ہے اور دلآویز۔ اسی لئے مذہب کو خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق تک محدود رکھنے کے مدعی اور سناعی ہمیشہ اس قسم کے فقروں اور بزرگوں کے اقوال پیش کرتے رہتے ہیں جن سے یہ پایا جائے کہ راستے جدا جدا ہیں مطلوب سب کا ایک ہے (جمنا ایک، گھاٹ بہتیرے۔ کہت کبیر سمجھ کے پھیر سے)۔ اور اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھاتے

مقصود سب کا ایک ہے بابا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "نظامِ ربوبیت"۔

ہیں کہ جب عالمگیر سچائیاں سب جگہ یکساں طور پر موجود ہیں[1] تو پھر اختلافِ طریق پر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ دوسروں کو اپنے طریق کی دعوت دے۔ جس طریق پر کوئی چلا آرہا ہے ٹھیک ہے۔ غور کیجئے، قومِ مدین نے حضرت شعیبؑ سے کیا یہی نہیں کہا؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے جس طریق پر چلے جارہے ہیں اور جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تم جس انداز سے اپنے رب کی عبادت کرتے ہو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ لوگوں سے یہ کہو کہ وہ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کرلیں؟

متذکرہ صدر تصریحات کو سامنے رکھ کر آیتِ زیرِ نظر پر پھر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حقائق و عبر کا کتنا بڑا بحرِ ذخار ہے جو چند الفاظ کے سواحل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دینِ الٰہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی معاملہ دین کی حدود نہیں باہر نہیں۔ اور دینِ خداوندی (اسلام) میں عبادت سے مفہوم محض پرستش (پوجا پاٹ) نہیں بلکہ اس ضابطۂ قوانین کی عملی اطاعت ہے جس کا نفاذ قوت و حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ عبادت کی مختلف شکلیں (نماز، روزہ وغیرہ) اسی اطاعت کا محسوس مظہر ہیں اور اس نظام کے قیام و بقا کا ذریعہ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی)۔

دین کا صحیح مفہوم

قوم نے یہ کہا اور اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (۱۱/۸۸)

شعیب نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیلِ روشن رکھتا ہوں اور (اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ) اچھی

---

[1] اس مسلک کی اشاعت مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنے ترجمان القرآن میں کی تھی۔

(سے اچھی) روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہِ حق کی طرف نہ بلاؤں؟) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں، اُس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں (میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر عمل بھی کرتا ہوں) میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاحِ حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بننا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بننا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں!

اس بصیرت افروز جواب کے مختلف ٹکڑوں پر غور فرمائیے۔ قوم نے یہ کہا تھا کہ ہم اُس روش پر چلے جا رہے ہیں جو ہمارے آبا ر و اجداد سے ہم تک متوارث ترچی ہے۔ تم اس کے خلاف کیوں کہتے ہو؟ آپ نے

اسلاف پرستی!

اس کے جواب میں وہی کہا جو اس سے پیشتر ہر رسول نے اس اعتراض کے جواب میں کہا تھا، یعنی جب میرے پاس اللہ کی طرف سے ایک کھلی ہوئی روشنی موجود ہے جس سے میں غلط اور صحیح کی پرکھ کر سکتا ہوں تو پھر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کئے کسی روش کہن پر چلے جانا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

یہ واضح دلیل اور کھلی ہوئی روشنی، حضرت شعیبؑ کی تعلیم تھی جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوئی تھی۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ میں تمہاری تخویف و ترہیب سے ڈر جاؤں۔ لیکن ڈرے وہ جو تمہارا محتاج ہو جسے اللہ پر ایمان ہو وہ انسانوں کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے۔ تم میرے رازق نہیں ہو مجھے رزق اس مبدا رفیض سے ملتا ہے جو خَیْرُ الرّٰزِقِیْن ہے، جس کا عطا کردہ رزق، درحقیقت رزقِ حسنہ (بہترین روزی) ہے۔ تم غیر اللہ کو رازق سمجھتے ہو اور ان کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو۔ اس لئے تمہاری حالت یہ ہے کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے تمہیں دس مرتبہ مقامِ انسانیت سے گرنا پڑتا ہے۔ لیکن میرا خدا وہ ہے کہ رزق بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ دنیا جہان کی سرفرازیاں بھی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

آں خدا نانے دہد جانے دہد
ایں خدا جانے بُرد نانے دہد

پھر فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ میں بھی تمہاری روش اختیار کر لوں، لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ جس بات کو میں علیٰ وجہ البصیرت صحیح سمجھتا ہوں اور اس پر چلنے کے لئے تمہیں دعوت دیتا ہوں، تو کیا میں خود اس کے خلاف چلنے لگ جاؤں؟ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں، وہی کچھ خود بھی کرتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میری صلوٰۃ یہ کیوں حکم دیتی ہے کہ میں

تمہارے "دنیاوی معاملات" میں بھی دخل انداز ہوں اور تم سے تمہارے آباء و اجداد کی روش کہن چھڑا کر ایک اور راہ پر لے چلوں، سو یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی استطاعت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور اصلاح کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ لیکن جو کچھ چاہتا ہوں اس کی توفیق کا اللہ سے طلبگار ہوں۔ اسی کے قوانین کی محکمیت پر میرا بھروسہ ہے اور ہر مشکل مقام پر اسی کی قوت و تائید کی طرف رجعت۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کرو کہ چونکہ تم نے پہلے ہی سے دل میں فیصلہ کر لیا ہے کہ میری مخالفت ضرور کرنی ہے اس لئے میں جو کچھ کہوں اس کا اُلٹ کرتے جاؤ۔ یہ روش سراپا حماقت ہے اور اس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی۔

وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝ (۱۱/۸۹)

اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قومِ نوح کو یا قومِ ہود کو یا قومِ صالح کو پیش آچکا ہے۔ اور قومِ لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں۔

محض ضد! غور کیجئے! کیا دنیا میں حق و صداقت کی مخالفت عام طور پر اسی نہج سے نہیں ہوتی کہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ اس کی مخالفت کرنی ہے اور پھر اس کے بعد کبھی سوچا ہی نہیں جاتا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر غور تو کر لیا جائے؟ یہی وہ راہ ہے جو سیدھی تباہی اور بربادی کے جہنم تک لے جاتی ہے۔ اس روش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ (۱۱/۹۰)

اور دیکھو، اللہ سے اپنی حفاظت چاہو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا بڑا ہی محبت والا ہے۔

قوم کے پاس ان محکم دلائل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن کیا انہوں نے لاجواب ہو کر اعترافِ حقیقت کر لیا؟ توبہ! توبہ! نخوت و تکبر کے شیاطین بھلا کب اس کی اجازت دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ

وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝ (۱۱/۹۱)۔

لوگوں نے کہا: "اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو۔ اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں"۔

اس جواب پر صحیح تبصرہ خود حضرت شعیبؑ کے ارشاد میں موجود ہے جو اس سے اگلی آیت میں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (۱۱/۹۲)۔

شعیب نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لئے کچھ نہ ہوا کہ اسے یونہی ساتھ رکھ لیا کہ جب کوئی اور تدبیر کارگر نہ ہو تو اسے آخری حربے کے طور پر استعمال کر لیا جائے۔ (اچھا) جو کچھ تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں"۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں انسان، دوسرے انسانوں کا پاسِ خاطر تو کرتا ہے لیکن خدا کا خیال کبھی نہیں کرتا! آپ نے کیسی حقیقت کشا اور دلآویز بات کہی ہے کہ کم بختو! تمہارے

انسانوں کا پاسِ خاطر لیکن!

نزدیک میری برادری کی قوت تو ایسی ہے جس کا تم پاس کرو لیکن اللہ تعالےٰ تمہارے نزدیک (معاذ اللہ) کچھ شے ہی نہیں کہ اسکا بھی کچھ خیال رکھا جائے!

غور کیجئے! کیا دنیا میں تمام بڑی بڑی خرابیوں کی علت یہی نہیں کہ لوگ انسانوں کا پاسِ خاطر تو کرتے ہیں لیکن اللہ کو پسِ پشت ڈالے رکھتے ہیں۔ اگر اللہ کا دھیان پیشِ نظر رہے تو خلش و اضطراب اور فتنہ و فساد کی یہ جہنم سکون و طمانیت کی جنت بن جائے۔

مندرجہ صدر آیت (۱۱/۹۲) میں ظِهْرِيًّا کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب وہ سفر میں جاتے تو جتنے اونٹوں کی فی الواقع ضرورت ہوتی ان سے ایک آدھ زاید ساتھ لے لیتے کہ اگر راستے میں معتدہ اونٹوں میں سے کسی کو کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا حادثہ پیش آ گیا تو یہ فالتو اونٹ (EXTRA) کام آ جائے گا۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ تم خدا کا نام ضرور لیتے ہو اور اس کے ماننے کے مدعی بھی ہو۔ لیکن عملی زندگی میں تم نے اس کی حیثیت ایک ظِهْرِي جیسی رکھ چھوڑی ہے کہ جب کوئی اور تدبیر کارگر نہ ہو تو اسے بطور آخری حربہ استعمال کر لیا جائے۔

یہ ہے تمہارا خدا کو ماننا!
غور کیجئے! کیا آج ہماری بھی یہی حالت نہیں؟
جب حضرت شعیبؑ نے دیکھا کہ قوم اپنی ضد پر بُری طرح سے جمی ہوئی ہے تو فرمایا کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ تم اگر تباہ ہونے پر تُلے بیٹھے ہو تو تمہیں اللہ کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے؟

وَ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ وَ مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ ○ (۱۱/۹۳)

"اور اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہوں۔ بہت جلد معلوم کر لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے؟ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔"

یعنی وہی انتجاجی طریق استدلال (PRAGMATIC TEST) کہ میرے پروگرام کو تکمیل تک پہنچ لینے دو، اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔

✡

سورۂ شعراء میں ہے کہ قوم نے کہا کہ تمہاری ان باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) تمہارا دماغ ٹھیک نہیں رہا۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ○ (۲۶/۱۸۵)

شعیب کی قوم نے کہا: "اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جو یوں بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو)۔

بشر اور رسول؟

اس لئے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ تم پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ لیکن تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم پر وحی کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جو ہم اس سے پیشتر اُمم سابقہ کے احوال و کوائف میں سنتے چلے آئے ہیں۔

وَ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ ○ (۲۶/۱۸۶)

اور تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو (پھر تم رسول کہاں سے بن بیٹھے)، بلاشبہ

ہم تمہیں جھوٹے لوگوں میں سے (ایک جھوٹا آدمی) خیال کرتے ہیں.
اگر تم واقعی سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو.

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۷)

اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو نا! (دیکھیں تمہارا خدا کس طرح یہ کچھ کر دیتا ہے!).

اس کے جواب میں آپ نے فقط اتنا فرمایا کہ

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶/۱۸۸)

شعیب نے (جواب میں) کہا (گھبراؤ نہیں) میرا خدا اچھی طرح جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو (اس کا قانونِ مکافات غافل نہیں ہے. تمہارے اعمال کی سزا مل کر رہے گی).

وہ تمہارے اعمال سے واقف ہے اور اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت بھی اُس کو معلوم ہے. اس لئے میں تم پر عذاب کیا لاؤں گا؟ عذاب لائیں گے تو وہ تمہارے اعمال!

ظہورِ نتائج کا وقت

قوم مدین اپنی بدعنوانیوں اور سرکشیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی. حتیٰ کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہو گیا اور ظہورِ عذاب شروع ہو گیا. تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ مدیانیوں کا فتنہ و فساد حد سے بڑھ چکا ہے اس لئے اب ان سے انتقام لو.

پھر خداوند نے موسےٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مدیانیوں کو تنگ کرو اور انہیں مارو. (گنتی ۱۶-۱۷/۲۵)

پھر خداوند نے موسےٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہلِ مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اُس کے اپنے لوگوں سے مل جائے گا. (گنتی ۲/۳۱)

چنانچہ ایک قیامت خیز جنگ ہوئی جس میں مدیانی بُری طرح سے تباہ ہوئے. قرآنِ کریم میں جنگ کا ذکر نہیں بلکہ اس کے بعد کا ذکر ہے جو زلزلہ اور آتش فشانی کی صورت میں اُن پر مسلّط ہوا اور جس سے ان کی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد اُنہیں مزید مہلت دی گئی کہ وہ اپنی حالت میں اصلاح کر لیں لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی سرکشیوں اور بدعنوانیوں سے باز نہ آئے تو پھر ان کی بربادی کا وقت

آپہنچا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۚ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۷/۹۲ — ۹۱)

پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے مُنہ پڑے تھے!

جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا' (ان کا کیا حال ہوا؟) گویا ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے!

جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا' وہی برباد ہونے والے تھے!

یہی الفاظ سورۂ عنکبوت میں ہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ (۲۹/۳۷)

تو (دیکھو) شعیب کو (اس کی قوم کے) لوگوں نے جھٹلایا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے مُنہ پڑے تھے!

حضرت شعیبؑ اس سے پہلے ہی ان سے الگ ہو چکے تھے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝ (۷/۹۳)

بہرحال شعیب ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ اُس نے کہا" بھائیو! میں نے پروردگار کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے تھے اور تمہاری بہتری چاہی تھی' (مگر جب تم نے جان بوجھ کر ہلاکت کی راہ پسند کی) تو میں نہ ماننے والوں (کی تباہی) پر اب کیسے افسوس کروں۔

آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔ ان میں بظاہر قوم کے عبرت انگیز انجام سے بے تعلقی پائی جاتی ہے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس بے تعلقی میں یاس و تأسف اور ہمدردی و شفقت کے کس قدر نازک اور شدید جذبات مضمر ہیں! مصلحین کو بھی کیسا دردمند دل عطا ہوتا ہے (نیز دیکھئے ۹۴ — ۱۱/۹۵ ؛ ۲۶/۱۸۹)۔

یہ ہے سرگذشتِ قوم مدین۔ اصحاب الایکہ کا ضمنی ذکر قرآنِ کریم کے دو اور مقامات میں بھی آیا ہے۔

وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ لْــَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ۝ (۳۸/۱۳؛ ۵/۱۴)
اور ثمود اور قومِ لوط اور گھنے جنگلوں والے (اہلِ مدین) سب کے سب تباہ کر دیئے گئے۔ یہ سب بڑی بڑی جماعتیں تھیں۔ (مگر جب عذاب آیا تو ان کی جمعیت کچھ بھی کام نہ آئی)۔

خلاصۂ مبحث

حضرت ابراہیمؑ کا ایک بیٹا مدین، حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کی نسل، قومِ مدین کہلائی۔ اس قوم کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ یہ قوم، قوت اور دولت کے نشہ میں بدمست، کمزور و ناتواں انسانوں کی بیحد حق تلفی کرتی تھی۔ ان کا معاشی نظام بیحد ناہموار اور سلب ونہب پر مبنی (سرمایہ دارانہ) تھا۔ حضرت شعیبؑ نے انہیں اس ظلم و فساد سے روکا تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح باہمی مصالحت (COMPROMISE) کی صورت نکل آئے جس کی رُو سے حضرت شعیبؑ "خدا کی عبادت" اپنے طور پر کرتے رہیں اور اس قوم کے "دنیادی" معاملات میں دخل نہ دیں۔ لیکن انہوں نے دین کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔ دین میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شعیبؑ نے اپنے مشن کو جاری رکھا اور قوم نے جی بھر کے مخالفت کی۔ بالآخر قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ان کی تباہی کوہِ آتش فشاں کی شعلہ باریوں کی صورت میں اُن پر مسلط ہو گئی اور اس قوم کے فقط افسانے باقی رہ گئے۔

ان کے بعد انبیاء کرامؑ کا تذکرۂ جلیلہ (۱) برقِ طور اور (۲) شعلۂ مستور میں ملے گا اور پھر حضور خاتم النبیینؐ کے تذکارِ جمیلہ "معراجِ انسانیت" میں۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ!

پرویز